مطالعاتی رہنما

ایم فل پاکستانی زبانیں و ادب

پشتو، ہندکو، توروالی، گاوری

کورس کوڈ 2723 یونٹ 1 تا 9

شعبہ پاکستانی زبانیں
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

پشتو، ہندکو، توروالی، گاوری: زبان و ادب

ایم فل: پاکستانی زبانیں و ادب

کورس کوڈ 2723　　　　یونٹ 1 تا 9

شعبہ پاکستانی زبانیں

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس ٹیم

چیئرمین:	ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
ادارۂ تحریر:	ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
	پروفیسر خاطر غزنوی
	ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان
	انعام اللہ خان
	ڈاکٹر جان بارٹ
نظرِ ثانی:	ڈاکٹر خالد خان خٹک
	ڈاکٹر پرویز مہجور خویشکی
	ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک
	ڈاکٹر انعام الحق جاوید
	محمد پرویش شاہین
فاصلاتی تشکیل:	ڈاکٹر انعام الحق جاوید
	ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
تدوین:	شعبۂ پاکستانی زبانیں
پروگرام رابطہ کار:	ڈاکٹر عبداللہ جان عابد
کورس رابطہ کار:	ڈاکٹر عبداللہ جان عابد

فہرست

صفحہ نمبر

پیش لفظ

زبانیں آپس میں ربط وتعلق کا ذریعہ ہوتی ہیں اورانہی کے ذریعے ایک دوسرے کے مافی الضمیر اوراحساسات وجذبات کو سمجھا جاسکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں ان کی اہمیت مسلّم رہی ہے۔وطن عزیز پاکستان میں بھی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں جو کہ ظاہری طور پر مختلف ہونے کے باوجود اپنے اندراشتراک کے کئی پہلو رکھتی ہیں۔اس گہرے تعلق و اشتراک کی بنیادی وجہ پاکستانی ادب کے سماجی،روحانی اور جغرافیائی پس منظر کا ایک ہونا ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق دنیا میں اس وقت زندہ زبانوں کی تعداد 6809 ہے جبکہ 7.1 فی صد زبانیں خطرات سے بھی دوچار ہیں مگر یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پاکستان میں بولی جانے والی زبانیں ترقی کی منازل طے کررہی ہیں اوران زبانوں اوران کے ادب کوفروغ حاصل ہورہا ہے۔ہماری یہ زبانیں اتنی اہم ہیں کہ اس وقت دنیا کی کئی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی کام سرانجام دیا جارہا ہے اوران کی قدامت اور تاریخ وادب پر مقالات تحریر کیے جا رہے ہیں۔وطن عزیز میں بھی مختلف یونیورسٹیوں میں پنجابی،سندھی،پشتو،بلوچی،براہوئی اور سرائیکی میں ایم اے،ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح تک تعلیم دی جارہی ہے اوران پر تحقیقی کام ہورہا ہے تاہم اب تک کسی یونیورسٹی میں زبان وادب کی سطح پر کوئی ایسی ڈگری نہیں تھی جو پاکستان کی تمام زبانوں اوران کے ادب پر محیط ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سے زیادہ زبانوں اوران کے ادب کے متعلق معلومات رکھنے والے ماہرین یا اسکالروں کی کمی پوری کرسکتی ہو جس کی ضرورت اندرون ملک بھی ہے اور بیرون ملک بھی۔

مجھے اس بات کا قوی یقین ہے کہ ''ایم فل پاکستانی زبانیں وادب'' کا یہ پروگرام یونیورسٹی کے دیگر ایم فل پروگراموں میں ایک خوش آیند اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی اورلسانی ہم آہنگی کے فروغ میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا اوراس پروگرام کے طلبہ پاکستانی زبانوں اوران کی منفرد ومشترک ادبی روایات سے متعارف ہوکر قومی مفاہمت کے فروغ میں اہم کردارادا کریں گے نیز یہ کورس ان کی تعلیمی استعداداوردائرہ ءِ کار میں اضافے کا سبب بھی ہوگا۔

وائس چانسلر

ایم فل پاکستانی زبانیں وادب

ایک تعارف

وطن عزیز پاکستان ایک کثیر لسانی خطہ ہے جہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں سے ہر زبان کی اپنی ایک الگ اور منفرد شناخت کے ساتھ ساتھ اپنی ایک تاریخ اور ادبی حیثیت ہے تاہم یہ زبانیں اپنے اندر کئی مشترک عناصر بھی رکھتی ہیں جو لسانی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے امین ہیں اور جنہیں اجاگر کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اس پروگرام کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ یوں تو اس وقت ملک کے چاروں صوبوں میں پنجابی، پشتو، بلوچی، سرائیکی، براہوئی اور سندھی کو انفرادی طور پر مختلف تعلیمی سطحوں پر پڑھایا جا رہا ہے، مگر ان تمام زبانوں اور ان کے ادب کو کسی ایک اعلیٰ سطحی کورس کے ذریعے اجتماعی صورت میں پڑھانے کی ابتداء علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے کی جا رہی ہے۔ یقیناً یہ اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام ہے، جو طالب علم کو اردو، بلوچی، براہوئی، پشتو، سندھی، سرائیکی، پنجابی، کشمیری، پہاڑی، ہندکو، گوجری، بلتی، شنا، کھوار، توروالی، گاوری، بروشسکی، وخی اور ان زبانوں کے مختلف لہجوں کی ساخت، آغاز و ارتقاء، لسانی گروہ، جغرافیے، ادبی سرمایے کے مشترک عناصر اور مشترک ادبی رجحانات واقدار سے شناسائی پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوگا۔

اس پروگرام کے چیدہ چیدہ مقاصد یہ ہیں۔

1۔ قومی یکجہتی اور ملی ہم آہنگی کے فروغ کے لئے طلبہ وطالبات کو پاکستانی زبانوں کے مشترک نقوش، بین اللسانی روابط اور مشترک ادبی رجحانات سے روشناس کرانا۔

2۔ پاکستانی زبانوں کی منفرد لسانی شناخت اور انفرادی رجحانات سے روشناس کرانا۔

3۔ طلبہ کی تعلیمی استعداد اور دائرہ ءکار میں اضافہ کرنا۔

4۔ طلبہ وطالبات میں تمام پاکستانی زبانوں کے بارے میں مثبت سوچ پیدا کرنا۔

5۔ طلبہ وطالبات کو پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب کے بارے میں مطالعاتی اور تحقیقی بنیاد فراہم کرنا۔

6۔ جو طلبہ وطالبات اپنے حالات کی بنا پر یونیورسٹیوں میں باقاعدہ طالب علم بن کر اپنی مادری زبان (جس میں انہوں نے ایم اے کیا ہو) میں ایم فل نہیں کر سکتے، لیکن ایم فل کرنے کے آرزومند ہیں۔ انہیں فاصلاتی نظام کے تحت ''ایم فل پاکستانی زبانیں وادب (اپنی مادری زبان کی تخصیص کے ساتھ)'' کرنے کی سہولت مہیا کرنا۔

یونیورسٹی قواعد کے مطابق ایم فل کا ہر پروگرام آٹھ مکمل کریڈٹ کورسوں پر مشتمل ہوتا ہے، جن میں سے چار مکمل

کورس کا تعارف

ایم فل ''پاکستانی زبانیں وادب'' کا تیسرا کورس ''پشتو، ہندکو، توروالی، گاوری زبان وادب'' پیش خدمت ہے۔ زیرنظر کورس 9 یونٹوں پر مشتمل ہے، جس میں ان زبانوں اوران کے ادب کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کورس کے یونٹ متعلقہ زبانوں کے ماہر اسکالروں اور اساتذہ کے تحریر کردہ ہیں ۔ یونٹ نمبر 1 پشتو زبان کے آغاز وارتقاء، وجہ تسمیہ، لسانی جغرافیہ، لسانی گروہ، لہجوں، رسم الخط، حروف تہجی اور اردو کے ساتھ لسانی روابط پر مبنی ہے، جب کہ دوسرے اور تیسرے یونٹوں میں بالترتیب اس زبان کی قدیم نظم اور قدیم نثر پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس میں کلاسیکل دور کے حوالے سے چند اہم قلمکاروں کے سوانحی خاکوں کے علاوہ ان کی تخلیقات کے نمونے بھی مع اردو ترجمہ دیئے گئے ہیں تا کہ آپ ان تراجم کے ذریعے قدیم نظم ونثر کے نمونوں کا مطالعہ کر کے ان کے موضوعات اوران کی خصوصیات جان سکیں۔ یونٹ نمبر 4 جدید شاعری کے مطالعہ کے لئے مختص کیا گیا ہے، جس میں پشتو شاعری میں فکری اور فنی اعتبار سے جدید ادبی رجحانات کے علاوہ چند اہم جدید شعراء کے فن کا مطالعہ شامل ہے۔ یونٹ نمبر 5 کا تعلق پشتو کی جدید نثر سے ہے، جس میں پشتو ناول، افسانہ، ڈرامہ، سفرنامہ، رپورتاژ، انشائیہ اور تحقیق وتنقید کا مطالعہ شامل ہے۔ اس یونٹ میں طلبہ ان اصناف کے تاریخی ارتقاء، پشتو ادب میں ان کی اہمیت اور چند دیگر مباحث کا مطالعہ بھی کریں گے۔ یونٹ نمبر 6 اور 7 بالترتیب ہندکو زبان وادب سے متعلق ہیں، جن میں اس زبان کے آغاز وارتقاء اوراس کے ادب سے متعلق مختلف اصناف زیر بحث لائی گئی ہیں۔ بقیہ دو یونٹ توروالی اور گاوری زبان وادب کے لئے وقف ہیں۔ یادر ہے کہ ان زبانوں کے بنیادی قواعد بھی اس کورس کا حصہ ہیں تا کہ طلبہ ان کی روشنی میں ان زبانوں کی گرامر کی مبادیات سے آگاہ ہوسکیں۔

یہ مطالعاتی رہنما محض آپ کی رہنمائی کے لئے ہے۔ آپ اپنے علم میں مزید وسعت پیدا کرنے کے لئے مجوزہ کتب سے ضرور استفادہ کیجئے بلکہ اس کے بغیر آپ کا مطالعہ ادھورا ہے۔

کورس کے مقاصد

اس کورس کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

1. پشتو، ہندکو، توروالی اور گاوری زبانوں کی ابتدا کے سلسلے میں مختلف نظریات بیان کرسکیں۔

2 ان زبانوں کے لہجوں، لسانی جغرافیہ، حروف تہجی اور بنیادی قواعد پر روشنی ڈال سکیں۔
3 ان زبانوں کے قدیم وجدید ادب کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔
4 ان زبانوں اور اردو کے تعلق پر روشنی ڈال سکیں اور ان کی لسانی قربت کے ذریعے قومی وحدت کے امور پر غور کر سکیں۔
5 ان زبانوں کے ادب کی چیدہ چیدہ خصوصیات اور رجحانات کے بارے میں اپنی معلومات سپرد قلم کر سکیں۔

امتحانی مشقیں اور آخری امتحان

اس کورس کے دوران میں آپ دو امتحانی مشقیں حل کر کے اپنے ٹیوٹر (اتالیق) کو مقررہ تاریخ تک بھیجیں گے۔ ٹیوٹر ان پر نمبر لگا کر مفصل ہدایات کے ساتھ ہر مشق آپ کو واپس کر دیں گے۔ کورس کے خاتمے پر امتحان لیا جائے گا۔ اس کا پروگرام اور رولنمبر مناسب وقت پر آپ کو بھیج دیئے جائیں گے۔ اس کورس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے امتحانی مشقوں اور آخری امتحان کو برابر کی اہمیت حاصل ہے اور دونوں میں الگ الگ پاس ہونا لازمی ہے۔

امید ہے کہ آپ اوپن یونیورسٹی کے اس فاصلاتی نظام اور اس کی فراہم کردہ سہولتوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔

آخر میں یونٹ نگاروں اور نظر ثانی کنندگان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے تعاون سے اس کورس کی بروقت اشاعت ممکن ہوسکی۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
کورس رابطہ کار

یونٹ نمبر 1

پشتو زبان کا آغاز وارتقاء

تحریر : عبداللہ جان عابد
نظر ثانی : ڈاکٹر خالد خان خٹک

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات

مطالعاتی رہنما کے اس یونٹ کا تعلق پشتو زبان کے آغاز وارتقاء سے ہے۔ پشتو ایک قدیم آریائی زبان ہے، جو قدیم سنسکرت اور اوستا کی بہن ہے۔ اس یونٹ میں پشتو کی وجہ تسمیہ، لسانی گروہ، لہجوں، حروف تہجی، رسم الخط، بنیادی قواعد اور اردو کے ساتھ لسانی روابط کے بارے میں ضروری معلومات اور مواد پیش کیا گیا ہے۔ یونٹ کے آخر میں ابتدائی بول چال کے چند فقرے اور گنتی بھی دی گئی ہے۔ پاکستانی زبانوں کے ادب کا طالب علم ہونے کے ناتے آپ اس یونٹ کے تفصیلی مطالعے کے لئے درج شدہ کتب کی مدد سے اس کا بھرپور مطالعہ کیجئے۔

مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- پشتو زبان کی وجہ تسمیہ اور لسانی گروہ کے بارے میں جان سکیں اور اس کی وضاحت کر سکیں۔

2- پشتو کے ساتھ سنسکرت اور اوستا کے تعلق سے آگاہ ہو سکیں۔

3- پشتو کے مختلف لہجوں، حروف تہجی اور رسم الخط کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔

4۔ پشتو کے چند بنیادی قواعد اور پشتو اور اردو کے لسانی روابط جان سکیں اور ان دونوں زبانوں کے مشترک الفاظ کی فہرست بنا سکیں۔

5۔ روزمرہ استعمال کے چند ابتدائی پشتو جملے بول سکیں۔

1-پشتوزبان کا آغاز وارتقاء

1.1- وجہ تسمیہ

ویدمیں جس ''پکھت'' اوراوستامیں جس ''بخت'' قوم کاذکرآیاہے اورمشہوریونانی مؤرخ ہیروڈوٹس (Herodotus) نے520ق م میں جس ''پکھت'' قوم کاذکرکیاہے(جواس وقت دریائے سندھ(Indus) کے کناروں تک آبادتھی)اسی سے اس قوم کی زبان کانام ''پکھتو'' اور''بختو'' (پشتو،پختو) پڑا۔

1.2- پشتو کی قدامت

جب ہم پشتو کی اس قدرقدامت کاذکرکرتے ہیں،تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دعوے کاتحریری ثبوت کیاہے۔بدقسمتی سے فقط اتنامعلوم ہوسکاہے کہ پشتو پہلے میخی رسم الخط میں، پھرخروشتی میں،اس کے بعد یونانی، برہمی، دیوناگری اوراوستاوغیرہ میں لکھی جاتی تھی۔آخرکارعربی رسم الخط نے سب کوختم کیا۔اس وقت پشتوعربی رسم الخط کی پیروی میں خط نسخ میں لکھی جاتی ہے۔

سرحداورافغانستان کے بعض علاقوں میں ایسے کتبے ملے ہیں،جن پرایک ایسی قدیم زبان کے جملے لکھے ہوئے ہیں، جس کوپشتو کی ماں کہاجاسکتاہے۔علاوہ ازیں پشتوایرانی بادشاہ دارایوش کبیرکے سنگی کتبوں میں، جوکہ 516 قبل مسیح میں کندہ کئے گئے تھےاورجن کارسم الخط میخی تھا، یوں ملتی ہے کہ وہاں تین جملے (مصرعے) ایسے پائے گئے ہیں، جوکہ پشتو کے ساتھ قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔ان تینوں جملوں (مصرعوں) میں جوالفاظ (ارےکہ، دروجہ نہ اورزورہ کہ رہ) آئے ہیں، وہ اب بھی معمولی سے تغیرکے ساتھ پشتو میں مروج ہیں۔اس سے معلوم ہوتاہے کہ دارایوش کے زمانے میں جس قسم کی پشتو بولی جاتی تھی، وہ بہت حدتک آج کل کی پشتو سے مشابہ تھی۔جملوں کاتلفظ ملاحظہ کیجئے:

	(1)	Nê	a	ri	Ka	â	hum
(انگریزی تلفظ)	(2)	Nê	drau	ja	na	â	hum
	(3)	Nê	Zura	ka	ra	â	hum

تعلق رکھتی ہیں، جس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ انہی میں سے برصغیراورایران وافغانستان میں بولی جانے والی اکثر زبانیں ہند آریائی گروہ سے متعلق ہیں، جو آگے جاکر ہندی اور ایرانی شاخوں میں بٹ جاتی ہیں۔اسی طرح جہاں ایک طرف اردواور سندھی ہندی شاخ سے وابستہ ہیں، تو دوسری طرف پشتو اور بلوچی دونوں ایرانی شاخ سے پیوست ہیں۔ اس طرح جدید فارسی، پشتو، بلوچی اور کردی زبانوں میں گہرا خاندانی تعلق پایا جاتا ہے۔شروع میں بعض مورخین کا یہ خیال تھا کہ پشتون بنی اسرائیل سے تعلق رکھتے ہیں اوران کی زبان پشتو بھی سامی نسل سے تعلق رکھتی ہے، لیکن جدید تحقیق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ پشتو ایک آریائی زبان ہے۔اس زبان کو سامی خاندان سے وابستہ قرار دینے والوں میں سے ایک مشہور مورخ نعمت اللہ ہروی ہے، جس نے اپنی فارسی تاریخ ''مخزن افغانی'' میں یہ نظریہ پیش کیا کہ پشتون بنی اسرائیل کی نسل سے ہیں اوران کی زبان پشتو سامی نسل سے ہے۔

انگریز جب برصغیر آئے تو دوسری زبانوں کی طرح انہوں نے پشتو میں بھی دلچسپی لی اوراس پر تحقیقی کام کیا، جن میں ڈاکٹر بیلیو، ڈاکٹر ٹرمپ اور ابراہام گریئرسن شامل ہیں۔ان ماہرینِ لسانیات نے پشتو کو آریائی خاندان سے وابستہ قرار دیا اور کہا کہ پشتو قدیم ایرانی زبان ''اوستا'' سے قریبی تعلق رکھتی ہے، البتہ قدیم سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کا اس پر گہرا اثر پڑا ہے۔ بعد میں جرمن ماہر لسانیات ولیم گائیگر، فرانسیسی محقق ڈارمسٹیٹر اور نارویژی ماہر مورگنسٹیئرن نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کردیا کہ پشتو ایک آریائی زبان ہے اوراس کا تعلق ایرانی شاخ سے ہے۔اب دنیا بھر کے ماہرین لسانیات اسی نظریے سے اتفاق کرتے ہیں۔اس سلسلے میں چند معروف مستشرقین کی آراء ملاحظہ ہو:

گریئرسن (G. A. Grierson) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"It has now long been admitted that the language (Pashto) belongs to the Aryan stock" (1)

ڈاکٹر ٹرمپ (Dr. Trumpp) پشتو گرامر (1873ء) میں لکھتے ہیں:

پشتو زبان انڈو آرین (Indo-Aryan) زبانوں کے خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے (ح۔2)

فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر ولیم ہنری کا خیال ہے کہ پشتو ایک طرف سنسکرت اور دوسری طرف اوستا سے قریب ہے اور اس کے ثبوت میں وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اوستا، سنسکرت اور پشتو تینوں آریائی زبان کی تقسیم سے قبل ایک تھیں۔ڈاکٹر ہنری والٹر نے پشتو زبان کو سنسکرت کی بہن قرار دیا ہے۔

پروفیسر کلاپروتھ (Kloproth) پشتو زبان پر تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ پشتو زبان کو اگر چہ بعض ماہرین نے سامی (Semitic) زبانوں میں شمار کیا ہے، مگر میرے نزدیک یہ زبان مکمل طور پر Indo-Germonic زبانوں میں سے ہے، کیونکہ الفاظ، لغات اور قواعد و گرامر کے لحاظ سے یہ سامی زبانوں سے بالکل تعلق نہیں رکھتی۔

الفنسٹن (Elphinstone) کہتے ہیں کہ میں نے 218 الفاظ کی چھان بین اور تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ پشتو زبان کا ایک لفظ بھی سامی زبانوں سے تعلق نہیں رکھتا، البتہ 5 فیصد الفاظ کردی زبان سے متعلق ہیں اور کردی زبان ایک انڈو آرین زبان ہے۔

اسی دور کے ایک اور مصنف پروفیسر ڈاکٹر برنارڈ ڈورن (Bernhard Dorn)' (جن کی کتاب "A Chrestomathy of the Afghan Language" '1847ء میں پیٹرز برگ سے شائع ہوئی تھی) کی رائے بھی کم و بیش یہی ہے کہ پشتو زبان تراکیب اور قواعد کے اعتبار سے سامی زبانوں سے کسی قسم کی مناسبت نہیں رکھتی بلکہ صوتی اور میکانکی طور پر آریائی شاخ کی ایک زبان ہے۔ (ح-3)

ان ماہرین لسانیات نے اپنی ان آراء اور نظریات کے ثبوت میں اپنی تصانیف میں پشتو، سنسکرت اور اوستا کے بعض ہم صوت اور ہم شکل الفاظ کی فہرستیں بھی دی ہیں، جن میں سے چند الفاظ اور ان کے اردو معنی ملاحظہ ہوں:

پشتو	سنسکرت	اوستا	اردو معنی
شپہ	شپ	شپ	رات
لیور	دیور	ایور	دیور
ماشام	شام	شام	شام
اوبہ	آپہ	آب	پانی
دوه	دوا	دوه	دو
پینزه	پانژچہ	پنچہ	پانچ

پشتو کے لسانی گروہ کے حوالے سے مستشرقین کے علاوہ دیگر مورخین اور محققین کی آراء اور نظریات بھی جاننا ضروری ہیں۔ پشتون مورخ سید بہادر شاہ ظفر (تمغہ امتیاز) اپنی تصنیف ''پشتون اپنی نسل کے آئینے میں'' میں اپنی رائے یوں بیان کرتے ہیں:

".....اس لحاظ سے پشتو بھی ایک مستقل زبان ہے اور ہندی یوروپی آریائی زبانوں کے بڑے خاندان میں ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ باالفاظ دیگر اس کا سرچشمہ بھی وہی اولین آریائی زبان ہے، جو آریہ لوگ اپنے اولین مسکن میں بولتے تھے" (ح۔4)

اس اولین زبان کو فرانسیسی دانشور موسیو لیبان نے " آریک " کا نام دیا ہے۔

معروف محقق سید عظیم شاہ خیال بخاری کا کہنا ہے:

"اس قوم کی اصل کچھ ہی سہی۔ اس وقت یہ ہمارا موضوع بحث نہیں۔ جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک آریائی زبان ہے۔" (ح-5)

معروف دانشور اجمل خٹک "اٹک کے اس پار" میں یوں رقمطراز ہیں:

"میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پٹھان اس آریائی قوم کی ایک شاخ ہے جو تین ہزار قبل مسیح میں بلخ، بخدا اور دریائے آمو کے گردو پیش آباد تھے اور پشتو ان ہی لوگوں کی زبان ہے"۔ (ح-6)

پشتو زبان وادب کی تاریخ کے مصنف محمد مدنی عباسی لکھتے ہیں :

"پشتو زبان (Indo-European) زبانوں میں سے ہے۔ ان زبانوں کا مشہور نام آریائی بھی ہے۔ مستشرقین کا خیال ہے کہ آریا قوم وسط ایشیا سے نقل مکانی کر کے جنوب مغرب کی طرف بلخ میں بس گئی۔ وہاں سے کچھ قبائل ایران کی طرف نکل گئے اور وہاں کی مقامی زبان کے اختلاط سے اوستا بنائی اور جو کوہ سلیمان پار کر کے ہندوستان کی طرف چلے گئے۔ انہوں نے پراکرت کو ملا کر سنسکرت کی تشکیل کی اور جو قبیلے بلخ ہی میں رہ پڑے، وہ پشتو ہی بولتے رہے"۔ (ح-7)

مذکورہ ماہرینِ لسانیات اور محققین کے علاوہ پروفیسر عبدالحئ حبیبی اور صدیق اللہ خان ریشتین بھی پشتو زبان کو آریائی زبانوں کے خاندان سے سمجھتے ہیں۔

درج بالا آراء اور نظریات کی روشنی میں بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پشتو ایک قدیم آریائی زبان ہے، اوستا اور

سنسکرت کی بہن تصور کی جاتی ہے اور اس اولین زبان کی بیٹی ہے، جسے مشہور فرانسیسی دانشور موسیو لیبان نے ''آریک'' کا نام دیا ہے۔ افغان محقق علامہ عبدالحیٔ حبیبی موسیو لیبان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ زبان یعنی آریک 300 ق م تک بولی جاتی تھی، لیکن خود ان کی رائے ہے کہ اصل آریائی زبان (آریک) کا تخمینہ 500 ق م سے 5000 ق م تک ہے۔

جدید علمی اور لسانی تحقیقات کی رو سے باختری (بلخ) آریاؤں کے وہ قبائل جو ہندوستان کی طرف گئے، ان کی زبان کا نام سنسکرت پڑ گیا' وہ قبائل جو فارس کی طرف نکل گئے، ان کی زبان کا نام اوستا پڑ گیا اور وہ قبائل (پکھت / بجنت) جو باختر (بلخ) میں رہ گئے، ان کی زبان کا نام پشتو پڑ گیا۔

سنسکرت اور اوستا کے کئی الفاظ پشتو کے کلاسیکی ادب میں موجود ہیں' جن سے آریائی زبانوں اور پشتو زبان کے باہمی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:

سنسکرت کے الفاظ	سنسکرت میں ان کے معنی	پشتو زبان میں ان کی شکل	پشتو میں ان کے معنی
اریاورتہ / ورشہ	زمین' وطن' چراگاہیں	ورشو	چراگاہیں
سیند	دریا	سیند	دریا
سوما / ہوما	ایک پودے کا نام	اومہ۔ اومان	ایک پودے کا نام
گرامہ	گاؤں	گرام	گاؤں

اوستا کے الفاظ	اوستا میں ان کے معنی	پشتو میں ان کی شکل	پشتو میں ان کے معنی
زراتشترا	یہ لفظ دو حصوں پر مشتمل ہے۔		
(Zara-	زرا: دل	زڑہ	دل
Tashtara)	تشترا: مالک	تختن	مالک
		[صاحب دل]	[صاحب دل]
اھورامزدا	اس لفظ کے بھی دو حصے ہیں		
Ahura	اھورا: روشنی، سورج، آگ	اُور	آگ
Mazda	مزدا: احترام، نماز، نوازنا	نموئز	نماز
		[آگ کے پجاری]	[آگ کی عبادت]

2- لہجے

ویسے تو پشتو زبان کے کئی لہجے ہیں، لیکن قندھاری اور یوسف زئی دو بڑے لہجے ایسے ہیں، جو ان تمام لہجوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔

2.1۔قندھاری لہجہ

یہ لہجہ صوبہ سرحد کے جنوبی علاقوں اور بلوچستان کے پشتون علاقوں میں رائج ہے۔اس کے علاوہ یہ جنوبی افغانستان میں بولی جانے والی زبان کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔اس لہجے کو بعض اوقات ''خٹک لہجہ'' ، ''جنوبی لہجہ'' اور ''نرم لہجہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

2.2۔ یوسفزئی لہجہ

یہ دوسرا بڑا لہجہ ہے، جسے متقدمین ''یوسفزئی لہجہ'' اور متاخرین ''پشاوری لہجہ'' کہتے ہیں۔کچھ ماہرین لسانیات اسے ''سخت لہجہ'' اور ''شمالی لہجہ'' بھی کہتے ہیں۔یہ صوبہ سرحد کے شمالی علاقوں کے علاوہ افغانستان کے بعض علاقوں میں بولا جاتا ہے۔

2.3۔ لہجوں کا فرق

ماہرین نے پشتو زبان کے ان دو بڑے لہجوں (قندھاری لہجہ اور یوسفزئی لہجہ) کی یہ تقسیم دراصل بعض آوازوں کی مخصوص ادائیگی کے فرق کے پیش نظر کی ہے، جن میں ژ اور گ، ش اور خ، چ اور س اور پھر ج اور ز کی آوازیں شامل ہیں۔اس کی سادہ ترین مثال خود لفظ ''پشتو'' ہے، جسے قندھاری خٹک گروپ ''ش'' کے ساتھ پشتو ادا کرتا ہے، جب کہ اسی لفظ کو یوسف زئی گروپ والے ''خ'' کے ساتھ پختو ادا کرتے ہیں۔یہی حال داڑھی کے لیے رائج لفظ ''ږیره'' کا ہے، جسے قندھاری خٹک گروپ والے ''ژیره'' کہیں گے، جب کہ یوسف زئی لہجے والے اسے ''گیره'' ادا کریں گے۔اس بڑے اختلاف کو ظاہر کرنے کے لیے ان آوازوں کے لیے چار ایسے مخصوص حروف وضع کیے گئے ہیں، جو بہ یک وقت ان تمام آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں:

ږ : $\frac{\text{قندھاری خٹک گروپ کے لیے ژ}}{\text{یوسف زئی گروپ کے لیے گ}}$

ښ : $\frac{\text{قندھاری خٹک گروپ کے لیے ش}}{\text{یوسف زئی گروپ کے لیے خ}}$

څ : $\frac{\text{قندھاری خٹک گروپ کے لیے چ}}{\text{یوسف زئی گروپ کے لیے س}}$

ځ : $\frac{\text{قندھاری خٹک گروپ کے لیے ج}}{\text{یوسف زئی گروپ کے لیے ز}}$

وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہو:

قندھاری لہجہ	یوسف زئی لہجہ	اردو
ژیرہ	ږیرہ (گیرہ)	داڑھی
ژلئی	ږلئی (گلئی)	اولے
غوژ	غوږ (غوگ)	کان
کوژ	کوږ (کوگ)	ٹیڑھا
پشتون	پښتون (پختون)	پشتون
اُوش	اُوښ (اُوخ)	اونٹ
پشہ	پښہ (پخہ)	پاؤں
پیشور	پېښور (پیخور)	پشاور
چادر	څادر (سادر)	چادر
چوکیدار	څوکیدار (سوکیدار)	چوکیدار
جنگل	ځنگل (زنگل)	جنگل
جان	ځان (زان)	جان

لہجوں کی یہ تقسیم ایک خط کے ذریعے کی جاسکتی ہے، جو مغرب سے مشرق کی طرف سرحد، بلوچستان اور

افغانستان سے ہوکر گزرتا ہے۔اس جغرافیائی تقسیم کے مطابق قندہاری خٹک گروپ لہجے والے قبائل جنوب کی طرف رہ جاتے ہیں اوراس لیے اس کوجنوبی لہجہ بھی کہتے ہیں ۔ان علاقوں میں قندہار،غزنی، کوئٹہ، ژوب، وزیرستان، بنوں، لکی مروت، کرک اور کوہاٹ کے بعض علاقے شامل ہیں، جن میں غلزیٔ، کاکڑ، وزیر، محسود، مروت، بنوچی اور خٹک قبائل قابلِ ذکر ہیں اور یہ سب قندہاری خٹک گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔

دوسری طرف اس خط کے شمال میں کابل، لوگر، لغمان، ننگرہار، خیبر، کُرم، اورکزیٔ، ہنگو، کوہاٹ، وادیٔ پشاور، مردان، صوابی، دیر، سوات بونیر اور علاقہ مہمند وباجوڑ شامل ہیں۔ان علاقوں میں خلیل، مہمند، داوٗدزیٔ، آفریدی، بنگش، اورکزیٔ اور یوسف زیٔ قبائل آباد ہیں۔یادرہے کہ تحریر کے لئے پوری پشتو زبان کے لئے ایک مشترک رسم الخط اختیار کیا جاتا ہے۔یعنی ادبی لحاظ سے یوسفزیٔ لہجہ بولنے والوں کی زبان رائج ہے، جسے سب تسلیم کر چکے ہیں۔

3- رسم الخط اور حروف تہجی

پشتو رسم الخط کی ابتداء کامسئلہ کافی الجھا ہوا ہے، تاہم 516 ق م میں ایرانی بادشاہ دارایوش کبیر کے سنگی کتبوں پر کندہ کئے گئے، جو تین فقرے دریافت ہوئے ہیں، وہ میخی رسم الخط میں ہیں اور پشتو سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔اس کے بارے میں لسانیات اور حروف واصوات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ پشتو اپنے آغاز میں میخی رسم الخط پھر خروشتی اور اس کے بعد یونانی، براہمی، دیوناگری اور اوستائی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، لیکن یہ سب باتیں روایات اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ظہور اسلام کے بعد عربی رسم الخط نے ان سب کو ختم کر دیا۔ بہادر شاہ ظفر کاکاخیل ''ظفر اللغات'' (پشتو لغت) کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''پشتو کے رسم الخط یعنی خط نسخ نے سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں رواج پایا۔سلطان کے وزیر احمد بن حسن میمندی کی ہدایت پر قاضی سیف اللہ نے عربی رسم الخط کی طرز پر پشتو زبان کے لئے یہی رسم الخط اختیار کیا، جو معمولی کمی وبیشی کے ساتھ جاری رہا۔''

دسویں صدی ہجری میں بایزید انصاری نے اپنی کتاب ''خیر البیان'' میں پشتو کے حروف تہجی کو باقاعدہ طور پر مرتب کیا۔اس کے بعد اخون درویزہ (940ھ-1048ھ) نے ان حروف تہجی کی علامات میں کچھ ترامیم کیں۔اخون درویزہ کے بعد خوشحال خان خٹک (1022ھ- 1100ھ) نے بھی ان کی علامتوں میں کچھ مزید ترمیمات کیں، لیکن فی الحقیقت

اخون درویزہ کے ترمیم شدہ حروف تہجی کی علامات ہی زمانہ جدید تک رائج رہیں۔ 1990ء میں پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کی کوششوں سے ایک متفقہ رسم الخط وضع کیا گیا۔اب پشتو زبان کے حروف تہجی کی تعداد 44 بنتی ہے، جن کی ترتیب یہ ہے:

ا ب پ ت ټ(ٹ) ث ج ځ(زیم) چ څ(سے) ح خ د ډ(ڈ) ذ ر ړ(ڑ) ز ژ ږ (گے) س ش ښ (خین) ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ګ (گ) ل م ن ڼ (نونړ) و ه ي ې ی ئ ے

ان 44 حروف تہجی میں 28 عربی کے، چار (پ، چ، ژ اور گ) فارسی کے اور تین (ٹ، ڈ اور ڑ) ہندی کے شامل ہیں۔اس کے علاوہ ان میں پشتو کی اپنی مخصوص آوازیں ځ، څ، ږ، ښ، ڼ اور ی کی مخصوص شکلیں شامل ہیں۔

پشتو زبان کے بعض حروف لکھنے میں فارسی، عربی اور اردو حروف سے کچھ مختلف ہیں۔ اردو فارسی میں چند حروف ایسے ہیں، جن کے اوپر چھوٹا "ط" ہوتا ہے۔ مثلاً ٹ، ڑ اور ڈ۔ یہی الفاظ جب پشتو میں لکھے جاتے ہیں تو ان کے اوپر سے "ط" ہٹا کر نیچے چھوٹا سا گول دائرہ جوڑ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح حرف "گ" بھی پشتو میں تھوڑا سا مختلف لکھا جاتا ہے یعنی اوپر والی کش کی بجائے نیچے ایک گول دائرہ لگا دیا جاتا ہے۔ یعنی "ګ"

3.1۔ پشتو کے مخصوص حروف، ان کی آوازیں اور "ی" کی مختلف شکلیں

۱:- ځ - (زیم) ۲:- څ- (سے) ۳:- ږ - (گے)

۴:- ښ-(خین) ۵:- ڼ- (نُونړ)

پشتو کے اپنے اور دیگر زبانوں سے لئے گئے بعض الفاظ ایسے ہیں کہ کچھ قبائل ان کا تلفظ ایک طرح سے اور کچھ دوسری طرح سے کرتے ہیں۔ پشتو کے یہ مخصوص حروف درج ذیل مختلف آوازوں کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس زبان میں دو طرح سے مستعمل ہیں۔ ("لہجوں کا فرق" کے زیرعنوان پشتو کی چار مخصوص آوازوں (ځ، څ، ږ اور ښ) کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس لئے یہاں باقی آوازوں کی نسبت ان کا اجمالاً تذکرہ کیا جاتا ہے)

ځ (زیم) :ان الفاظ میں استعمال ہوتا ہے، جن کا تلفظ بعض قبائل ج سے اور بعض ز سے کرتے ہیں۔ مثلاً جواب اور ځواب (زواب) وغیرہ۔

څ (سے):ان الفاظ میں استعمال ہوتا ہے، جن کی ادائیگی بعض قبائل چ اور بعض س سے کرتے ہیں۔ مثلاً چادر اور

ښادر (سادر) وغیرہ۔

ږ (گے): اس کا استعمال جن الفاظ میں ہوتا ہے، انہیں بعض قبائل گ اور بعض ژ سے ادا کرتے ہیں۔ مثلاً توږل (توگل) اور توژل وغیرہ۔

ښ (خین): ان الفاظ میں استعمال ہوتا ہے، جن کا تلفظ بعض قبائل ش اور بعض خ سے کرتے ہیں۔ مثلاً پښه اور پښه (پخه) وغیرہ۔

ڼ (نوڼړ): ایک مرکب آواز ہے، جو پشتو کے علاوہ دوسری پاکستانی زبانوں سندھی اور پنجابی کے علاوہ ہندی کے حروف تہجی میں بھی موجود ہے۔ یہ حرف پشتو حروف تہجی میں ''ن'' کے بعد لکھا جاتا ہے اور اسے اردو نون غُنہ (ں) کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اس کا استعمال ان لفظوں میں ہوتا ہے، جن کا اصل فارسی، اردو میں ''ن'' ہو مثلاً چھان سے چھاڼ اور چنا سے چنه وغیرہ۔ پشتون بعض الفاظ کا تلفظ اس طرح کرتے ہیں گویا ان میں حرف ''ن'' (نون) چھپا ہوا ہے اور اس کی آواز ناک سے اس طرح نکالی جاتی ہے کہ حرف ''ړ'' کی آواز بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے یعنی اس مخصوص حرف ''ڼ'' (نوڼړ) کی آواز گویا ''ن'' اور ''ړ'' کی آوازوں کا امتزاج ہوتی ہے۔

پشتو نئی املا کے مطابق ''ی'' کی مختلف شکلیں ہیں۔ انہیں بروئے کار لانے سے مختلف الفاظ کے تلفظ اور گرامر کے لحاظ سے ان کی شناخت میں آسانی پیدا ہوگئی ہے۔

1۔ ي (یائے معروف) 2۔ ې (یائے مخصوص) 3۔ ی (یائے تانیث) 4۔ ئ (یائے فعلی) 5۔ ے (یائے مجہول)

1۔ ي: یائے معروف (ي) اکثر واحد مذکر اسم کے جمع کی صورت میں کلمے کے آخر میں آتی ہے۔ واحد مذکر کی یائے مجہول (ے) جمع کی صورت میں یائے معروف (ي) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یعنی یائے معروف (ي) کلموں کے آخر میں جمع مذکر کی علامت ہے۔ مثلاً سړے سے سړي اور زمرے سے زمري وغیرہ۔

2۔ ې: یائے مخصوص (ې) کی شکل کلمے کے درمیان (ې) اس طرح ہوگی اور کلمے کے آخر میں یوں 'ې' ہوگی۔ اس کے لئے قاعدہ یہ ہے کہ وہ واحد مونث اسم جس کے آخر میں ''ه'' آتی ہو۔ جمع بناتے وقت ''ه'' ہٹا کر 'ې' (یائے مخصوص) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یعنی کلمے کے آخر میں یائے مخصوص (ې) جمع تانیث کی علامت ہے۔ مثلاً سړه سے سړې اور ښځه سے ښځې وغیرہ۔

3۔ ی: یائے تانیث (ی) پشتو میں ہر وہ اسم (واحد، جمع) جو مونث ہو اور جس کے آخر میں ی کے اوپر ہمزہ آتا ہو، وہ یائے تانیث (ی) سے لکھا جاتا ہے۔ مثلاً کرسی، جینئ، خادی اور تربورولی وغیرہ۔

4۔ ئ: یائے فعلی (ئ) پشتو کلموں میں فعل کی علامت سمجھی جاتی ہے اور فعل کے آخر میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً وخورئ، ساتئ اور رازئ وغیرہ۔

5۔ ے: یائے مجہول (ے) کا استعمال کلمہ، اسم اور فعل کے آخر میں ہوتا ہے اور یہ کلموں میں تذکیر کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً سڑے (آدمی)، زمرے (شیر) اور لیکلے (لکھا ہوا) وغیرہ۔

4۔ پشتو اور اردو کے لسانی روابط

دیگر پاکستانی زبانوں کی طرح پشتو کے بھی اردو سے گہرے روابط ہیں، جو کئی سطحوں پر نمایاں ہیں۔ اگر صرف ذخیرہ الفاظ کے حوالے سے ہی دیکھا جائے تو ان دونوں زبانوں میں عربی اور فارسی کے بہت زیادہ مشترک الفاظ نظر آئیں گے، جس کی وجہ یہ ہے کہ عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور فارسی اس علاقے میں دفتری زبان کے طور پر مستعمل رہی ہے، چنانچہ عربی اور فارسی کا اثر نہ صرف اردو پر پڑا بلکہ پشتو بھی اس سے مبرا نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کے ذخیرہ الفاظ کی ایک معقول تعداد یا تو مشترک ہے یا ان میں قریبی اشتراک پایا جاتا ہے۔ پروفیسر پریشان خٹک نے اپنی کتاب ''اردو اور پشتو کے مشترک الفاظ'' میں 5022 (پانچ ہزار بائیس) الفاظ دیئے ہیں جو پشتو اور اردو میں مشترک ہیں یا قریبی اشتراک رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب ''بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کا تقابلی مطالعہ'' میں ''ہشت لسانی گلدستہ'' کے نام سے روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے 1612 اردو الفاظ، اسماء اور افعال کا ایک لسانی سروے پیش کیا ہے، جس کے مطابق ان الفاظ میں اردو اور پشتو کے مشترک یا قریبی الفاظ کی تعداد 863 ہے اور اس حساب سے اردو اور پشتو کے مشترک الفاظ کا تناسب 53.5 فی صد بنتا ہے۔

پشتو اور اردو کے صوتی نظام میں بھی کوئی زیادہ بُعد موجود نہیں۔ ذیل میں دیئے گئے الفاظ کی طرح بے شمار الفاظ ان زبانوں میں معمولی تغیر کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ مثلاً

اردو	پشتو
جنگل	ځنګل (زنگل)

زنجیر	زنځیر (زنزیر)
خارش	خاربښ (خارخ)
شاخ	ښاخ (خاخ)
ویران	وران
چھاج	چڅ

پشتو اور اردو کے روابط کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ان دونوں زبانوں کی قربت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''پشتو اور اردو میں نہ صرف ذخیرہ الفاظ اور تہذیبی اثرات کا بیشتر سرمایہ مشترک ہے بلکہ فارسی اثرات نے فکر واظہار کی سطح پر دونوں زبانوں کو ایک دوسرے سے اور قریب کر دیا ہے۔ اردو اور پشتو کے لسانی، تہذیبی اور تاریخی تعلق کا مطالعہ کسی محمود شیرانی کا منتظر ہے۔ پٹھانوں نے اردو زبان کی جو خدمات ''ہندوستانی پٹھان'' بن کر انجام دی ہے۔ ان سے تاریخ ادب کا مطالعہ کرنے والا بے خبر نہیں ہے۔ اردو کے پٹھان شعراء ادباء اور مصنفین کی ایک طویل فہرست ہے جو صدیوں کی تاریخ میں بکھری پڑی ہے۔''

اسی طرح ان زبانوں میں بعض مرکب الفاظ مشترک مستعمل ہیں۔ مثلاً خیر خبر، سراسر، بلا ناغہ، دوادارو اور گڑ بڑ وغیرہ ۔ علاوہ ازیں یہ زبانیں مشترک محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال کی امین بھی ہیں۔ اردو اور پشتو کے اشتراک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پشتو زبان کا انگریز اسکالر میجر راورٹی اپنی کتاب ''پشتو انگریزی لغت'' کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

''پشتو زبان میں بہت سے لفظ ایسے ملتے ہیں، جو اردو میں بھی نظر آتے ہیں، مگر ان سب کا واضح طور پر سنسکرت میں سراغ نہیں ملتا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک کسی اور زبان میں ان کی نشاندہی نہیں ہوتی میں انہیں خالص پشتو اصطلاحیں سمجھنے کی طرف مائل ہوں، جو بالکل اسی طرح ریختہ میں شامل ہو کر گھل مل گئیں جیسے سنسکرت، عربی اور فارسی بلکہ پرتگالی اور ملیالم کے لفظ''

اردو اور پشتو کے اس باہمی تعلق کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس طرح اردو کے بیشتر حروف تہجی عربی، فارسی سے لئے گئے ہیں۔ اسی طرح پشتو کے حروف تہجی میں عربی کے تقریباً تمام حروف شامل ہیں، جب کہ چار حروف تہجی فارسی سے بھی لئے گئے ہیں۔ اردو کی طرح پشتو بھی دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ اس کا رسم الخط نسخ ہے، جو کہ عربی و فارسی میں مستعمل ہے اور اردو کے نستعلیق رسم الخط سے قریبی مشابہت رکھتا ہے اور اردو خواں طبقے کے لئے اجنبی نہیں ہے۔

پشتو اور اردو کی قربت کا اندازہ آپ اس بات سے بھی لگا سکتے ہیں کہ کسی دور دراز کے پشتون علاقے میں بھی آپ کسی پشتون سے اردو میں بات کریں تو آپ کا مافی الضمیر وہ فوراً سمجھ جائے گا۔ پشتونوں کا مذہب کے ساتھ تعلق نہایت گہرا ہے چنانچہ وہ چیز ان کو پسند آتی ہے، جس میں مذہب کی چھاپ نظر آئے، چوں کہ اردو زبان میں بھی ایسے مذہبی لٹریچر کی بہتات ہے۔ اس لئے پشتو بولنے والوں کے لئے عربی کے بعد اردو زبان نہایت ہی عزیز اور محترم ہے اور اسی کے ذریعے وہ مذہبی مسائل اور تاریخ اسلام سے با آسانی واقفیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ اردو زبان کو یہ فوقیت حاصل رہی ہے کہ یہ رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر ہر کسی کی زبان رہی ہے اور ہر کسی نے بلا امتیاز قوم وملت اس کی ترویج و ترقی میں حصہ لیا ہے۔ اسی تسلسل میں پشتو اور اردو کا تعلق بالواسطہ و براہ راست ہر دو انداز میں ہمیشہ سے قائم رہا۔ یہاں تک کہ اردو نثر کا ایک قدیم نمونہ پشتو نثر کی اولین کتاب ''خیر البیان'' میں بھی ملتا ہے، جسے بایزید انصاری المعروف بہ پیر روشن نے دسویں صدی ہجری میں تحریر کیا تھا، جو اردو اور پشتو کے قدیم ترین روابط اور تعلق پر روشنی ڈالتی ہے۔ اردو نثر کا نمونہ یہ ہے:

''لکھ کتاب کے آغاز کے بیان جن کے سارے اکھر سہن بسم اللہ، تمام! میں نہ
گنوانو نگا مزدوری انہن کی جے لکھیں پرن بگارن اکہر کہ تمکنی پرن لکھیں اس
کارن جے سہی ہوئے بیان۔۔۔۔۔ قرآن میں ہے (گاعیان)۔''

اردو نثر کے قدیم نمونے کے علاوہ حال ہی (2003ء) میں ان کا ایک اردو شعر بھی دریافت ہوا ہے، جو ان کے مرید علی محمد مخلص کے دیوان (ترتیب و تحقیق از ڈاکٹر پرویز مہجور) میں موجود ہے، جس کی بدولت سرحد میں اردو شاعری کی روایت دسویں صدی ہجری تک جا پہنچی ہے۔ شعر یہ ہے:

سچا بول بایزید کا جو بیناوی کوی
چو مرنی پہر پہلے وی پر نہ مری سوی

پشتو اور اردو کے قواعد اور گرامر میں بھی بعض جگہ اشتراک پایا جاتا ہے مثلاً اردو کے بعض اسماء کے آخر میں ''ہ'' کو

یائے مجہول ''ے'' سے بدل کر جمع بناتے ہیں، جیسے بچہ سے بچے اور بستہ سے بستے وغیرہ۔ پشتو میں بھی املے کا یہی قاعدہ رائج ہے۔ جیسے کوٹہ سے کوٹے اور ریڑہ سے ریڑے وغیرہ۔ علاوہ ازیں ان دونوں زبانوں میں اسم فاعل ایک جیسے لاحقوں سے ملا کر بنایا جاتا ہے۔ مثلاً گر سے زرگر اور جادوگر اور گار سے پرہیزگار اور خدمت گار وغیرہ۔ اسی طرح اردو اور پشتو میں ماضی مطلق کا قاعدہ بھی ملتا جلتا ہے۔ تاہم تذکیروتانیث کے معاملے میں بعض جگہ اردو اور پشتو میں فرق پایا جاتا ہے۔ یعنی کچھ الفاظ جو پشتو میں مذکر ہیں۔ اردو میں مؤنث بولے جاتے ہیں مثلاً پنسل یا کتاب وغیرہ پشتو میں مذکر ہیں اور اردو میں مونث۔ اسی طرح پشتو بولنے والوں کی اکثریت سنسکرت کی دوچشمی ''ھ'' آسانی سے ادا نہیں کرسکتی۔ جب ایک پشتون کہے کہ ''پٹھان کھانا کھارہا ہے'' تو سننے والوں کو یہ فقرہ یوں سنائی دے گا ''پٹان کانا کارہا ہے''

پشتو اور اردو کے تعلق اور قربت کے ایک اور پہلو کو بیان کرتے ہوئے ادبیات سرحد (جلد سوم ص 51) کے مصنف محترم فارغ بخاری لکھتے ہیں:

> ''چاربیتہ'' (یہ پشتو لوک گیتوں میں لنڈئ کے بعد دوسری مقبول اور ہردلعزیز صنف ہے) کی صنف شاعری سوائے پشتو اور اردو کے کسی اور زبان میں نہیں ہے۔ یہ بھی پشتو ہی کے زیر اثر اردو میں آئی۔''

یہاں اس بات کا اعادہ بھی غیر ضروری نہ ہوگا کہ پشتو کے اکثر قدیم شعراء کے کلام میں نہ صرف اردو کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، بلکہ ایسی تراکیب و اصطلاحات بھی ملتی ہیں، جو اردو شاعری میں مستعمل ہیں اور اردو اور پشتو کے قدیم روابط کی آئینہ دار ہیں۔ مثلاً پشتو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ارزانی خویشکی کے کلام میں قدیم اردو الفاظ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ اسی طرح سترہویں صدی کے شاعر خوشحال خان خٹک کا کلام دیکھئے تو اس میں بھی آپ کو اردو کے کئی الفاظ نظر آئیں گے۔ ان کی ایک پشتو نما اردو غزل کے دو اشعار دیکھئے:

پہ سینہ کے مے اودہ مینہ پھر جاگی
زما ستا محبت گورہ کیسی لاگی
درقیب وینا ئی یادہ شوہ کہ سہ شوہ
سپینہ خولہ ئی پہ خندا راوڑہ پھر بھاگی

اسی طرح پشتو کے ایک اور کلاسیکل شاعر دولت لوانی کے دیوان میں ایک ذولسانی غزل موجود ہے، جس سے

اس دور میں ان کی اردو شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ایک شعر مع اردو ترجمہ دیکھئے:

ھغہ کس جاہل ابتر ہے

جو عاشق پہ سیم وزر ہے

ترجمہ: "وہ جاہل وابتر ہے، جو سیم وزر کا عاشق ہے"

یہی نہیں بلکہ قدیم دور کے بعض پشتو شعراء نے تو باقاعدہ اردو شاعری میں طبع آزمائی کی، اس ضمن میں عظیم صوفی شاعر رحمان بابا کے پشتو دیوان میں ایک فارسی نما اردو غزل موجود ہے جو کہ اردو زبان سے رحمان بابا کے تعلق کا بین ثبوت ہے۔اس غزل کے چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

بوصل تو مارا کجا ھات ہے
کہ وصلے تو خیلے بڑی بات ہے
بکوئے تو گفتم کہ مسکن کنم
ولے کے مرا ایں دراجات ہے
خم زلف تو گوشہء ابرواں
دلم را عجائب مقامات ہے

اس کے بعد پشتو اور اردو کی قربت کی ایک اور مضبوط ترین کڑی قاسم علی خان آفریدی ہیں، جنہوں نے پشتو، اردو اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ 1183ھ میں پیدا ہوئے۔ان کے آباواجداد درۂ آدم خیل کے رہنے والے تھے، جو بعد میں فرخ آباد میں جا کر بس گئے۔انھوں نے اپنا پشتو دیوان 1206ء میں مکمل کیا۔اردو اور پشتو دواوین سمیت سات کتابوں کے مصنف تھے۔اردو دیوان میں دوسو کے قریب غزلیں ہیں، جن کے رنگ سخن کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی یوں رقمطراز ہیں:

"میر و مرزا کا دور ہے اور اردو شاعری ایک نئے نقطۂ عروج کو چھو رہی ہے کہ قاسم علی خاں آفریدی فصیح، شیریں اور سادہ زبان میں اپنی غزل کے نغمے چھیڑتا ہے۔اس کی غزل میں استادانہ رنگ بھی ہے اور قادرالکلامی بھی۔ردیف کی معنویت، قافیے کا شعور اور مخصوص لہجہ اس کی شاعری میں ایسا رنگ بھرتا ہے کہ اس کی شاعری ہر پڑھنے والے کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔"

دواشعار ملاحظہ ہو:

وہ آپ دکھانے کو، صورت مجھے آتا ہے
جب اپنی نحوست کے ایام نکلتے ہیں
وحدت کا تماشا ہی کثرت کے مظاہر ہیں
آغاز سے ہر شے کے انجام نکلتے ہیں

پشتو کے ایک اور صاحب دیوان شاعر معز اللہ خان مومند (1085ھ۔1170ھ) نے بھی پشتو کے علاوہ اردو اور فارسی میں شعر کہے ہیں۔ ان کا اردو کلام سات غزلوں اور ایک مخمس پر مشتمل ہے، جس سے پشتو اور اردو کے قریب ترین تعلق پر روشنی پڑتی ہے۔ اردو نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

اگر مرنے کا کس کوں شوق ہے آ کر ملے اس سوں
کہ وہ نازک بدن پھر آج مخمور و شرابی ہے
در و دیوار سوں عاشق مبارک باد سنتا ہے
نشانی قتل کی ساجن تیرا چہرا گلابی ہے

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی بے جا نہ ہوگا کہ پشتو اور اردو دونوں کی قدیم شاعری فارسی شاعری سے متاثر ہے، جب کہ پشتو کا جدید ادب اردو نے متاثر کیا ہے۔ ناول، افسانہ اور ڈرامہ اردو ادب کے زیر اثر پشتو میں آئے ہیں۔ اس کے علاوہ دور جدید میں سرحد اور بلوچستان کے بہت سے پشتون ادیب اور شاعر پشتو کے ساتھ اردو میں بھی ادب تخلیق کر رہے ہیں، جو کہ دونوں زبانوں کی قربت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ حمزہ شنواری پشتو کے عظیم شاعر ہیں۔ ان کے کلام کو قدیم دور کے اختتام اور جدید دور کے آغاز کے درمیان ایک پل کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے پانچویں جماعت میں اپنی شاعری کا آغاز اردو ہی سے کیا۔ شعر ملاحظہ ہو:

قبلہ سب عالم کا کعبہ ہے مگر حمزہ ترا
یار کے محراب دو ابرو کا قبلہ اور ہے

دہلی اور لکھنؤ اردو کے دو بڑے مراکز رہے ہیں۔ ان دونوں کے بیچوں بیچ روہیل کھنڈ کا علاقہ تھا، جو پشتو بولنے والوں اور افغانوں کا گھر کہلاتا تھا۔ روہیل کھنڈ کے نواب محبت خان نے اردو، پشتو اور فارسی میں اپنے کلام کے مکمل دیوان

یادگار چھوڑے ہیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ابتدا ہی سے شہروں اور دیہاتوں میں روانی سے اردو بولی جاتی تھی اور اس اردو میں پشتو کے سینکڑوں الفاظ مستعمل تھے۔ اسی تناظر میں امتیاز علی عرشی اپنی کتاب ''اردو میں پشتو کا حصہ'' میں لکھتے ہیں:

''اس پورے علاقے (روہیل کھنڈ) میں بہت سے غیر مانوس لفظ آپ کے سننے میں آئیں گے۔ یہ سب لفظ پشتو کے ہیں اور معمولی سے لفظی یا معنوی فرق کے ساتھ دن رات بولے جاتے ہیں''

ڈاکٹر جمیل جالبی نے ''تاریخ ادب اردو'' میں جو یہ لکھا ہے کہ: ''پٹھانوں نے اردو زبان کو اور اردو نے پٹھانوں کو اتنا کچھ دیا ہے کہ ایک کی شخصیت دوسرے میں جھلکنے لگتی ہے۔'' تو اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں اردو ابتدائی دور میں ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔ ان علاقوں میں افغان خاصی تعداد میں آباد تھے اور دونوں زبانوں یعنی اردو اور اور پشتو کا لفظی سطح پر آپس میں گہرا لین دین تھا۔

اردو اور پشتو کے لسانی روابط کے بارے میں ایک اور حوالہ بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ اردو زبان میں نرمی، میانہ روی اور رکھ رکھاؤ کا عنصر پایا جاتا ہے، جب کہ پشتو کا یوسفزئی لہجہ بھی ان خصوصیات کا حامل ہے۔ علاوہ ازیں پشتو سے اردو اور اردو سے پشتو میں تراجم نے بھی دونوں زبانوں کو قریب کیا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو اور پشتو کی قربت میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ صوبہ سرحد کے مدرسوں میں بیشتر جگہوں پر بنیادی ذریعہ تعلیم اردو ہے نیز نصاب میں بھی اردو ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل ہے۔ جس کے باعث پشتو بولنے والے بچے بہت چھوٹی عمر میں ہی اردو سے آشنا ہو جاتے ہیں اور اردو سمجھنے اور بولنے لگ جاتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اردو اور پشتو تہذیبی اور تاریخی لحاظ سے گہری مشابہت رکھتی ہیں اور لسانی گروہ کے حوالے سے بھی دونوں آریائی زبانیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اردو ہندوستانی شاخ سے وابستہ ہے، جب کہ پشتو ایرانی شاخ سے۔

5۔ پشتو کے چند بنیادی قواعد

مصدر: مصدر وہ لفظ ہے، جو زمانے اور فاعل کی وضاحت کئے بغیر کسی فعل کے اصل مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ فارسی میں مصدر کے آخر میں ''ن'' آتا ہے۔ یا بعض میں ''ن'' سے پہلے ''ت'' یا ''د'' آتا ہے۔ اردو میں مصدر کی علامت ''نا'' ہے۔ پشتو میں مصدر کی علامت ''ل'' ہے جب کہ بعض لہجوں میں یہ علامت ''ن'' ہے۔

مثال: اُخستل (لینا) اوڑل (لے جانا)

لیکل (لکھنا) لوستل (پڑھنا)

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں۔ یہ ایسے مصدر ہیں، جو ابتدا ہی سے کسی کام کے ظاہر کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو وضعی مصادر کہتے ہیں، مگر دوسری زبانوں کی طرح پشتو میں بھی ایک بڑی تعداد ایسے مصدروں کی ہے جو علامت مصدر کے ساتھ کسی اسم یا صفت کے کلمہ سے ملا کر بنائے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو ترکیبی مصادر کا نام دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر:

تور (کالا) سپین (سفید)

لوئے (بڑا) گرم (گرم)

پشتو میں اس قسم کے الفاظ کے ساتھ ''یدل'' اور ''وَل'' کے مصدری لاحقے لگا کر مصدر بنا لیتے ہیں۔ یعنی اس قسم کے الفاظ سے دو دو قسم کے مصدر بنتے ہیں، ایک ''یدل'' لاحقے والے اور دوسرے ''وَل'' لاحقے والے۔ ان مصدروں میں معنی کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے۔ ''یدل'' والے مصدر صرف فاعل کے ساتھ مل کر پورا مطلب ادا کرتے ہیں۔ اس قسم کے مصدروں کو گرامر میں لازم مصادر کہتے ہیں۔ اس طرح ''وَل'' لاحقے والے مصادر پورا مطلب ادا کرنے کے لئے فاعل کے علاوہ مفعول بھی چاہتے ہیں۔ ان کو گرامر میں متعدی مصدر کہتے ہیں۔

لازم مصادر کی مثالیں: توریدل (کالا ہونا) سپینیدل (سفید ہونا / اجلا ہونا)

لوئیدل (بڑا ہونا) گرمیدل (گرم ہونا)

متعدی مصادر کی مثالیں: توروَل (کالا کرنا) سپینوَل (سفید کرنا / اجلا کرنا)

لوئوَل (بڑا کرنا) گرموَل (گرم کرنا)

اوپر کی مثالوں میں آپ نے ایک بات نوٹ کی ہوگی کہ:

(الف) ''یدل'' والے لازم مصدروں کے اردو ترجمہ میں آخری کلمہ ''ہونا'' ہے

(ب) ''وَل'' والے متعدی مصدروں کے اردو ترجمہ میں آخری کلمہ ''کرنا'' ہے

فعل لازم اور فعل متعدی

فعل لازم وہ ہے، جسے صرف فاعل کی ضرورت ہو:

مثال: پاسیدو (اُٹھا) کے لئے صرف ھغہ (وہ) فاعل کی ضرورت ہے۔ یعنی ھغہ پاسیدو (وہ اُٹھا)

فعل متعدی وہ ہے جسے فاعل کے علاوہ مفعول کی بھی ضرورت ہو:

مثال: وَھِیٔ (مارتا ہے) کے لئے ھَغہ (وہ) فاعل کے علاوہ ماشوم (معصوم) کی بھی ضرورت ہے۔ یعنی ''ھغہ ماشوم وھی'' (وہ بچے کو مارتا ہے)

فعل کی اقسام/زمانے کی اقسام:

فعل یعنی کسی کام کے انجام پانے کے اصل زمانے تین ہی ہیں ماضی، حال اور مستقبل، لیکن ان میں سے ہر ایک زمانے میں انجام پانے والے فعل کو بیان کرنے کے لے صیغے کی صورتیں زمانے کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔

ماضی مطلق: ماضی مطلق وہ ہے، جو صرف گزرے ہوئے زمانے پر دلالت کرے، لیکن اس میں قریب یا دور کے زمانے کا قید نہ ہو۔ مثلاً ھغہ راغلو (وہ آیا)، تہ لاڑے (تم گئے) وغیرہ۔

بنانے کے طریقے:

(1) وضعی مصدروں کے آخر سے ''ل'' ہٹا کر ابتداء میں واو مضموم بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً شلیدل (پھٹنا) سے وشلید (پھٹا) وغیرہ۔

(2) بعض اوقات مصدروں سے ''ل'' ہٹانے کے بعد آخر میں خفی ''ہ'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً لیدل (دیکھنا) سے ولیدۀ (دیکھا) اور خوڑل (کھانا) سے وخوڑہ (کھایا) وغیرہ۔

(3) متعدی صیغوں میں کبھی کبھی اصل کلمے اور واو کے مابین ''یٔ''، ضمیر مفعول بھی حائل ہو جاتی ہے۔ مثلاً اَخستل (لینا) سے وائی خیست (لیا) اور راوستل (لانا) سے رائی وست (لایا) وغیرہ۔

(4) بعض وضعی مصدروں سے ''ل'' کو ہٹانے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ صرف ابتداء میں ''وُ''، مضموم بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً خندل (ہنسنا) سے وخندل (ہنسا)، ژڑل (رونا) سے وژڑل (رویا) وغیرہ۔

(5) غیر وضعی مصادر میں سے علاماتِ مصدر کیدل، یدل لازم کی صورت میں، وُل، کول متعدی کی صورت میں شہ، شو اور کڑ، متعدی کی صورت میں حذف کر کے بالترتیب شہ یا شو اور کڑ لگا دیتے ہیں۔ مثلاً پخیدل (پکنا) سے پوخ شہ (پکا) اور خورول (پھیلانا) سے خور کڑ (پھیلایا) وغیرہ۔ اس کے علاوہ

ماضی مطلق کے بعض صیغے خلاف قیاس بھی ہیں۔مثلاً تلل (جانا) سے لاڑہ (گیا) اورکول (کرنا) سے وکڑ (کیا) وغیرہ۔

ماضی قریب: وہ فعل ہے، جوقریب کے گزرے ہوئے زمانے میں انجام پایا ہو۔مثلاً خوشحال راغلے دے (خوشحال آیا ہے)، سنبل تلې ده (سنبل گئی ہے) وغیرہ۔

بنانے کا طریقہ:

(1) مفعول یا صفت کے صیغوں کے آخر میں مختلف حالات میں کلمات ربط بڑھا دیئے جاتے ہیں۔

(الف) مفعول مونث کی صورت میں ''ده'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔مثلاً هغه راغلې ده (وہ آئی ہے) وغیرہ۔

(ب) مفعول مونث کی صورت میں ''دے'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔مثلاً ''هغه راغلے دے'' (وہ آیا ہے) وغیرہ۔

(ج) مفعول جمع (مذکر یا مونث) کی صورت میں ''دي'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔مثلاً هغوي راغلي دي (وہ آئی ہیں) وغیرہ۔

(2) صیغہ ہائے مجہول کے لئے صفت، مفعول اور کلمات ربط دونوں کے درمیان ''شوے'' واحد کی صورت میں اور ''شوي'' جمع کی صورت میں بڑھا دیتے ہیں۔مثلاً تڑلے شوے دے (باندھا گیا ہے) تړلي شوي دي (باندھے گئے ہیں) وغیرہ۔

ماضی بعید: وہ فعل جس کو عمل میں آئے بہت وقت گزر چکا ہو۔جیسے اردو میں ''میں آیا تھا'' ''اس نے لکھا تھا'' وغیرہ۔پشتو میں اس کے بنانے کے قاعدے تقریباً ماضی قریب ہی کی طرح ہیں۔

بنانے کا طریقہ:

(1) صیغہ صفت یا مفعول کے آخر میں حسب ذیل علامات بڑھائی جاتی ہیں:

واحد غائب (وحاضر) مذکر ـــــ وو (وَیاؤ)

واحد غائب (وحاضر) مونث ـــــ وه (وَ)

جمع غائب (وحاضر) مذکر ـــــ ووَ (وُ)

جمع غائب (وحاضر) مذکر ووَ (وُ)

جمع غائب(وحاضر) مونث وے(وِے)

واحد مخاطب وے(وِے)

جمع مخاطب ویٔ (وَیٔ)

واحد متکلم وُم (وُم یاوَم)

جمع متکلم وُ(وو)

(2) لازم فعلوں کے اسم مفعول کے بعد مذکورہ ضمیری لاحقے لگاتے ہیں۔ جیسے "پاسیدل" (اُٹھنا)، مصدر کا اسم مفعول "پاسیدلے" (اُٹھاہوا) ہے۔ اس کے بعد افعال ناقصہ لگانے سے ماضی بعید بن جاتا ہے۔ جمع کی صورت میں یائے مجہول یائے معروف میں بدل جاتی ہے۔ مثلاً "ھغه پاسیدلے وُ" (وہ اُٹھا تھا) "ھغوي پاسیدلي وُ" (وہ اُٹھے تھے) وغیرہ۔

(3) وہ لازم مصدر جو ماضی مطلق بنانے میں نہیں بدلتے۔ ان کے بعد یائے معروف لگانے کے بعد "وُ" کے کلمے کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔ مثلاً "ھغه خندلي وُ" (وہ ہنسا تھا) اور "ھغه ژړلي وَ (وہ رویا تھا) وغیرہ۔

ماضی استمراری:۔ وہ فعل جس کا انجام پانا گذشتہ زمانے میں ابھی جاری ہو یا بار بار انجام پاچکا ہو یا جس سے گزرے ہوئے زمانے میں کسی کام کی تکرار یا پورانہ ہونا ظاہر ہو۔ بالفاظِ دیگر اس میں کسی فعل کا جاری رہنا پایا جائے۔ مثلاً "مابه خندل" (میں ہنسا کرتا تھا)، "تہ بہ راتلے" (تم آیا کرتے تھے) یا "ھغه راتلو" (وہ آرہا تھا) وغیرہ۔

فعل حال:۔ وہ فعل ہے، جس سے موجودہ زمانے میں کسی کام کا ہونا، کرنا یا سہنا سمجھ میں آئے۔ مثلاً "خاندم" (ہنستا ہوں) "ھغه لیکي" (وہ لکھتا ہے) وغیرہ۔

بنانے کا طریقہ:۔

(1) وضعی مصدروں سے مصدر کا لاحقہ "ل" دور کرکے ان کے آخر میں درج ذیل فعلی ضمیریں لگائی جاتی ہیں۔

واحد غائب (حاضر) ي

جمع غائب (حاضر) ي

واحد مخاطب	ے
جمع مخاطب	ۓ ئ
واحد متکلم	ۓ م
جمع متکلم	ۓ و

(2) جن مصادر کے آخر میں ''یدَل'' ہو۔ کبھی کبھی ان میں سے ''دَل'' حذف کرنے کے بعد حال کا صیغہ رہ جاتا ہے۔ مثلاً ''پاسیدل'' (کھڑا ہونا) سے ''پاسي'' (کھڑا ہوتا ہے) وغیرہ۔

فعل حال جاری:۔ یہ فعل ظاہر کرتا ہے کہ موجودہ زمانے میں کام جاری ہے یعنی فعل زمانہ حال میں جاری ہے۔ مثلاً لگیا دے زی (وہ جارہا ہے) ''لگیا دے خوري (وہ کھارہا ہے) وغیرہ۔

بنانے کا طریقہ:۔

صیغۂ حال پر کلمہ ''لگیا دے'' کا اضافہ کیا جاتا ہے مثلاً (خاندی) ہنستا ہے سے لگیا دے خاندی (وہ ہنس رہا ہے) وغیرہ۔

فعل مستقبل:۔ وہ فعل ہے جو آنے والے زمانے میں انجام پانے والے کام پر دلالت کرتا ہے بہ الفاظ دیگر وہ فعل ہے، جس سے آنے والے زمانہ میں کسی کام کا کرنا، ہونا یا سہنا سمجھ میں آئے۔ مثلاً ''ھغه به ځي'' (وہ جائے گا) ''ته به سملے'' (تو سوئے گا) وغیرہ۔

بنانے کا طریقہ:

(1) صیغۂ حال کے درمیان یا آخر میں لفظ ''به'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ''غواڑي'' (مانگتا ہے) سے ''غواڑي به'' (مانگے گا) وغیرہ۔

(2) حال کے ترکیبی صیغوں میں ''یگی'' علامتِ حال حذف کرکے اس کی جگہ ''به شي'' لگا دیتے ہیں۔ مثلاً ''خوریگي'' (پھیلتا ہے) سے ''خور به شي'' (پھیل جائے گا) وغیرہ۔

(3) بعض صیغوں کے ساتھ ''وبه'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ''گوري'' (دیکھتا ہے) سے ''وبه گوري'' (دیکھ لے گا) وغیرہ۔

(4) جن صیغوں کے شروع میں الف ممدودہ ہو، وہاں ''بہ'' کے علاوہ واؤ مفتوح لگائی جاتی ہے اور الف ممدودہ صرف الف ساکن رہ جاتا ہے۔ مثلاً ''اخلي'' (لیتا ہے) سے ''وابہ خلي'' (لے لے گا) وغیرہ۔

(5) کبھی کبھی ''بہ'' یا ''وَبہ'' کے بعد ''یٔ'' وغیرہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً ''خوري'' (کھاتا ہے) سے ''وبہ یٔ خوري'' (کھاجائے گا) وغیرہ۔

ضمائر:۔ ضمائر وہ حروف یا الفاظ ہیں، جو اسم کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اسم ضمیر، اسم کا قائمقام ہوتا ہے۔ بلحاظِ مرجع ضمیر کی تین اہم قسمیں ہیں۔ متکلم، حاضر اور غائب

(الف) متکلم: خود بات کرنے والا متکلم ہوتا ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ واحد متکلم اور جمع متکلم مثلاً زہ (میں) واحد ہے اور مونگ (ہم) جمع متکلم ہے۔

(ب) حاضر: جس سے یا جس کے سامنے بات کی جائے۔ مثلاً تہ (تو)، دا (یہ)، دوي (یہ سب) اس کی بھی دو قسمیں ہیں واحد حاضر اور جمع حاضر۔

تہ (تو) واحد حاضر ہے۔ تاسو (آپ/تم) جمع حاضر ہے۔

دا (یہ) واحد حاضر ہے۔ دوي (یہ سب) جمع حاضر ہے۔

غائب:۔ جو بوقت کلام موجود نہ ہو مثلاً ''ھغہ'' (وہ) اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ واحد غائب اور جمع غائب یعنی ھغہ (وہ) ھغوي (وہ جمع)۔

حالت کے لحاظ سے اسمِ ضمیر کی قسمیں:۔ حالت کے لحاظ سے اسم ضمیر کی درج ذیل قسمیں ہیں۔

(الف) ضمیر فاعلی (ب) ضمیر مفعولی (ج) ضمیر اضافی

(الف) ضمیر فاعلی: وہ ضمیر ہے جو کسی فعل کا فاعل بن رہی ہو۔ وہ یہ ہیں:

واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
ھغہ (وہ)	ھغوي (انھوں)	تہ (تو)	تاسو (تم/آپ)	زہ (میں)	مونگ (ہم)

(ب) ضمیر مفعولی: وہ ضمیر جو مفعول کی جگہ استعمال ہوتی ہے۔ وہ یہ ہیں:

واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
ھغہ تہ (اسے)	ھغوي تہ (انھیں)	تاتہ (تجھے)	تاسوتہ (تمھیں)	ماتہ (مجھے)	مونگ تہ (ہمیں)

(ج) ضمیر اضافی: وہ ضمیر ہے، جو مضاف الیہ بن کر استعمال ہو۔ وہ یہ ہیں:

واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
دهغه (اس کا)	دهغوي (ان کا)	دَستا (تیرا رتیری)	دستاسو (تمھارا رتمھاری)	زما (میرا رمیری)	زموںګ (ہمارا رہماری)

تذکیر و تانیث:۔ پشتو میں مذکر و مونث کے قاعدے ذرا پیچیدہ سے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں ان کی چند موٹی موٹی علامتوں اور قواعد پر اکتفا کرتے ہیں۔

(الف) پشتو میں علاماتِ تذکیر:

(i) وہ اسماء جن کے آخر میں یائے مجہول (ے) ہو، مگر جمع کا صیغہ نہ ہو۔ مثلاً سڑے (آدمی)، زمرے (شیر) اور سپے (کتا) وغیرہ۔

(ii) وہ اسماء جن کے آخر میں واو معروف ہو۔ مثلاً جادو (جادو)، میلو (ریچھ) اور سانڈو (ہم زلف) وغیرہ۔

(iii) وہ اسماء جن کے آخر میں صحیح آواز (Consonant) ہو، مگر جو رکن یا موقوف ہو، بالعموم مذکر ہوتے ہیں۔ مثلاً غر (پہاڑ)، سادر (چادر) اور دیوال (دیوار) وغیرہ۔

(iv) وہ اسماء جن کے آخر میں واوٗ مجہول ہو، مگر اس سے ماقبل زبر (َ) ہو۔ مثلاً پلَو (آنچل) اور نَو (نمی، رطوبت) وغیرہ۔

(v) وہ اسماء جن کے آخر میں ہائے مختفی ہو۔ مثلاً میڑہ (خاوند) اور واڑۂ (بچے) وغیرہ۔

(ب) پشتو میں علامات تانیث:۔

(i) جن الفاظ کے آخر میں یائے تانیث (ۍ) ہو۔ مؤنث ہوتے ہیں۔ مثلاً جینۍ (لڑکی)، سپوگمۍ (چاند) اور شپیلۍ (بانسری) وغیرہ۔

(ii) جن اسماء کے آخر میں صحیح آواز ہو اور جس پر (َ) کی حرکت ہو۔ ایسے الفاظ کے آخر میں زبر کے اظہار کے لئے ''ہ'' لکھتے ہیں۔ مثلاً وینہ (خون) اور خټہ (کیچڑ) وغیرہ۔

(iii) وہ اسماء جن کے آخر میں واو مجہول ہو، مگر اس سے ماقبل آواز زیر زبر کی حرکت نہ ہو۔ مثلاً زانګو (جھولا)، بیزو (بندر) اور پیشو (بلی) وغیرہ۔

(iv) بے جان اشیاء کے نام جن کے آخر میں ''ا'' ہو عموماً مونث ہوتے ہیں مثلاً جڑا (رونا)، خندا (ہسنا) اور قلا (قلعہ) وغیرہ۔ اس قاعدہ میں عربی الفاظ جیسے فنا، بقا، سزا اور قضا بھی آجاتے ہیں۔

واحد جمع بنانے کا طریقہ:۔ ذیل میں پشتو میں اسمائے مذکر اور مؤنث کی جمع بنانے کے قواعد الگ الگ درج کئے جاتے ہیں۔

(الف) اسمائے مذکر کی جمع بنانے کے طریقے:

(i) جس اسم مفرد مذکر کے آخر میں یائے مجہول (ے) ہو۔ اس کی جمع بناتے ہوئے یائے مجہول (ے) کو ہٹا کر یائے معروف (ي) لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً سڑے (آدمی) سے سڑي (بہت سے مرد)، اور مڑے (مردہ) سے مڑي (مردے) وغیرہ۔

(ii) جس اسم مفرد مذکر کے آخر میں یائے معروف (ي) ہو۔ اس کی جمع بنانے کے لئے اس کے آخر میں ''ان'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً مالي (مالی) سے مالیان (بہت سے مالی) چپڑاسي (چپڑاسی) سے چپڑاسیان (بہت سے چپڑاسی) اور دوبي (دھوبی) سے دوبیان (بہت سے دھوبی) وغیرہ۔

(iii) جس اسم مفرد مذکر کے آخر میں ''الف'' واو معروف یا ہائے مختفی ہو۔ اس کی جمع بنانے کے لئے اس کے آخر میں ''گان'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً بوڈا (بوڑھا) سے بوڈاگان (بوڑھے)، آلو (آلو) سے آلوگان (بہت سے آلو) اور شہزادہ (شہزادہ) سے شہزادگان (شہزادے) وغیرہ۔

(iv) جس اسم مفرد مذکر کے آخر میں ہائے مختفی ''ہ'' ہو تو بخلاف مندرجہ بالا قاعدہ جمع بناتے وقت ''ہ'' ہٹا کر ''انہ'' کا اضافہ کیا جاتا ہے بشرطیکہ ماقبل حرف پر حرکت ہو۔ مثلاً میلمہ (مہمان) سے میلمانہ (بہت سے مہمان)، گڈبہ (چرواہا) سے گڈبانہ (چرواہے) اور کوربہ (میزبان) سے کوربانہ (بہت سے میزبان) وغیرہ۔

(v) بعض غیر ذی روح مذکر اسم کے آخر میں ''ونہ'' لگا کر جمع بناتے ہیں۔ مثلاً قلم (قلم) سے قلمونہ (اقلام)، میز (میز) سے میزونہ (میزیں) اور دوکان (دکان) سے دوکانونہ (دکانیں) وغیرہ۔

(vi) بعض ذی روح اسمائے مفرد مذکر کی جمع بھی ''ونہ'' لگا کر بناتے ہیں۔ مثلاً زڑہ (دل) سے زڑونہ (دل کی جمع)، لاس (ہاتھ) سے لاسونہ (بہت سے ہاتھ) اور نیکہ (نانا/دادا) سے نیکونہ (نانے/دادے) وغیرہ۔

(ب) اسمائے مونث کی جمع بنانے کے طریقے:۔

(i) وہ غیر ذی روح اسماء جن کے آخر میں یائے معروف (ي) ہو، جمع کی صورت میں یائے معروف کو ہٹا کر یائے تانیث لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً نیکي (نیکی) سے نیکۍ (نیکیاں) دشمني (دشمنی) سے دشمنۍ (عدواتیں) اور دوستي (دوستی) سے دوستۍ (دوستیاں) وغیرہ۔

(ii) جس ذی روح اسم مونث مفرد کے آخر میں یائے معروف (ي) ہو تو جمع بناتے وقت اس کے آخر میں ''گاڼي'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً مامي (ممانی) سے مامي گاڼي (ممانیاں)، بابي (بھابی) سے بابي گاڼي (بھابیاں) اور چاچي (چچی) سے چاچي گاڼي (چچیاں) وغیرہ۔

(iii) جس اسم مفرد کے آخر میں الف یا واو مجہول ہو، جمع بناتے وقت ''گاڼي'' بڑھا دیتے ہیں۔ مثلاً نیا (نانی / دادی) سے نیا گاڼي اور پیشو (بلی) سے پیشوگاڼي (بلیاں) وغیرہ۔

(iv) جن اسمائے مؤنث کے آخر میں ہائے مختفی ''ہ'' ہو۔ جمع بناتے وقت ''ہ'' ہٹا کر یائے مخصوص (ې) کا اضافہ کیا جاتا ہے مثلاً اسپہ (گھوڑی) اسپې (گھوڑیاں) وغیرہ۔

حرف اضافت :۔ وہ حرف ہے، جو دو اسموں کا آپس میں تعلق پیدا کرے۔ اردو میں حروف اضافت کا، کی اور کے ہیں۔ پشتو میں ''دَ'' واحد کلمہ اضافت ہے، جو ان تینوں کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ اردو کی طرح پشتو میں یہ بھی بالعموم دو معنوں میں آتا ہے۔ یعنی: (i) ملکیت کے اظہار کے لئے جیسے دَ شاہد (شاہد کا)۔ اس مثال سے آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ اردو میں تو اضافت کا کلمہ اپنے مضاف الیہ سے بعد میں آتا ہے، مگر پشتو میں اس کے برعکس مضاف الیہ سے پہلے آتا ہے اور کسی حالت میں بھی اردو کی طرح اپنی جگہ نہیں بدلتا۔ وضاحت کے لئے ذیل کی مثال غور سے پڑھیں۔

دَ شاہد کتاب	شاہد کی کتاب
دا دَ شاہد کتاب دے	یہ شاہد کی کتاب ہے
دا دے دَ شاہد کتاب	یہ ہے شاہد کی کتاب

جملہ کو بار بار تبدیل کرنے کے باوجود یہ کلمہ اپنے مضاف الیہ سے چمٹا ہوا ہے اور ہر جگہ ''دَ شاہد'' ہی ہے، بالکل یہی حالت اردو میں بھی ہے ''شاہد کی'' کے الفاظ ہر جملے میں اکٹھے آئے ہیں۔ یاد رہے کہ ''دَ'' کا کلمہ واحد اور جمع، مونث اور مذکر سب کے لئے آتا ہے جیسے:

دَ شاہد قلم	شاہد کا قلم
دَ شاہد پیشو	شاہد کی بلی
دَ شاہد قلمونہ	شاہد کے قلم
دَ شاہد پیشوګانې	شاہد کی بلیاں

(ii) ایک چیز کی دوسری چیز سے نسبت ظاہر کرنے کے لئے جیسے:

دَ پاکستان	پاکستان کا
دَ غر	پہاڑ کا
دَ ونې	درخت کا

حروف عطف: ۔ وہ حروف ہیں، جو دو کلموں یا جملوں کو ملاتے ہیں، جن دو کلمات کے درمیان یہ حروف آتے ہیں۔ ان میں سے پہلے کو معطوف علیہ اور دوسرے کو معطوف کہتے ہیں۔ ذیل میں پشتو کے عطفی الفاظ مع اردو ترجمہ دیئے گئے ہیں:

پشتو	اردو
او	اور
هُم	بھی
بیا	پھر
چې	کہ

کثیر الاستعمال مصادر

مصدر	معنی
راوړل	لانا
اوړل	لے جانا
خوړل	کھانا
ورکول	دینا
وئیل	کہنا

مصدر	معنی
وهل	مارنا
راتلل	آنا
تلل	جانا
پاسیدل	کھڑاہونا
اوده کیدل	سونا
نیؤل	پکڑنا
پوښتل	پوچھنا
یریدل	ڈرنا
کیدل	ہونا
پریوتل	گرنا
ساتل	رکھنا
شلول	پھاڑنا
کتل	دیکھنا
ژړل	رونا
گنڈل	سینا
رسیدل	پہنچنا
تلل	چلنا
پیژندل	جاننا
اچول	ڈالنا
لوستل	پڑھنا
داخلیدل	داخل ہونا

مصدر	معنی
شلیدل	پھٹنا
پخول	پکانا
چورلیدل	گھومنا
محسوسول	محسوس کرنا
تلل	تولنا
لټول	تلاش کرنا
ژخوندوهل۔ کرپول	چبانا
جوړول	بنانا
جنګیدل	لڑنا
مړکیدل	مرنا
ډنګل	کود جانا
اوچتول	اُٹھانا
ژقول	ہلانا
سوزول	جلنا
جاروهل	جھاڑو دینا
دهوکه ورکول	دھوکہ دینا
کرل	بولنا
وریدل	برسنا
اچول	ڈالنا
غوښتل	مانگنا
تیریدل	گزرنا

مصدر	معنی
خرسول	فروخت کرنا
قتلول	قتل کرنا
منل	ماننا

نوٹ: پشتو قواعد کے ضمن میں درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے:

1۔ پشتو قواعد از تقویم الحق کا کاخیل
2۔ دپشتو صرف ونحو اور اتالیق پشتو از خیال بخاری
3۔ پشتو اردو بول چال از افضل رضا وصابری

6۔ ابتدائی بول چال کے چند فقرے

☆ آپ کا کیا نام ہے؟	ستاسو سہ نوم دے؟
میرا نام اسحٰق شاہد ہے۔	زما نوم اسحٰق شاہد دے۔
☆ آپ کیا کرتے ہیں؟	تاسو سۂ کار کوئ ؟
میں پڑھتا ہوں۔	زہ لولم۔
☆ آپ کیسے ہیں؟	تاسو سنگہ یئ؟
میں اللہ کے فضل وکرم سے ٹھیک ہوں۔	زہ د اللہ پہ فضل سرہ روغ جوڑ یم۔
☆ اور سنائیں! آپ کا کیا حال ہے؟	نور وایہ ء! ستاسو سہ ء حال دے؟
میں بالکل خیریت سے ہوں۔	زہ بالکل خیریت سرہ یم۔
☆ آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟	ستاسو پلار سۂ کار کوی؟
وہ ملازمت کرتے ہیں۔	ھغوی نوکری کوی۔
☆ آپ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟	ستاسو کور دلتہ نہ سومرہ لرے دے؟
زیادہ دور نہیں ہے، یہ سڑک سیدھی میرے گھر کی طرف جاتی ہے۔	زیات لرے نہ دے، دا سڑک نیغ زما کور اڑخ تہ زی۔
☆ میری طبیعت ٹھیک نہیں، کیا آپ مجھے کسی	زما طبیعت ٹھیک نہ دے، آیا تاسو ما تہ

اردو	پشتو
ڈاکٹر کا پتہ بتا سکتے ہیں؟	دچا ڈاکٹر پتہ خود لے شئ ؟
آپ سرکاری ہسپتال جائیں، وہ سامنے نظر آرہا ہے۔	تا سو سرکاری ہسپتال تہ لاڑشی ،ھغہ مخامخ پہ نظر رازی۔
☆ گرمی بہت زیادہ ہے، پیدل جانا ممکن نہیں۔ آیئے! میں آپ کو اپنی گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔	گرمی ڈیرہ زیاتہ دہ۔ پیادہ تلل ممکن نہ دی۔ رازئ! زہ تاسو خپل گاڈی کے رسوم۔
☆ بہت شکریہ! اچھا پھر ملیں گے۔	ڈیرہ مننہ! خہ بیا بہ میلاویگو۔
آپ کا بھی شکریہ۔ خدا حافظ۔	ستاسو ھم ڈیرہ مننہ! دخدائے پہ امان۔

گنتی

اردو	پشتو	اردو	پشتو
ایک	یو	دو	دوہ
تین	درے	چار	سلور
پانچ	پینزہ	چھ	شپگ
سات	اووہ	آٹھ	اتہ
نو	نہہ	دس	لس
گیارہ	یولس	بارہ	دولس
تیرہ	دیارلس	چودہ	سوارلس
پندرہ	پنزہ لس	سولہ	شپاڑس
سترہ	اووہ لس	اٹھارہ	اتہ لس
انیس	نولس	بیس	شل
تیس	دیرش	چالیس	سلویخت
پچاس	پنزوس	ساٹھ	شپیتہء

ستر	اویا	اتی	اتیا
نوے	سلورنیمے شلے	سو	سل
ہزار	زر		

7۔ خودآزمائی

1۔ پشتوزبان کی قدامت پرتفصیل سے روشنی ڈالیئے۔

2۔ پشتوایک آریائی زبان ہے" مدلل بیان کیجئے۔

3۔ پشتو کے مختلف لہجوں اور مخصوص آوازوں کی وضاحت کیجئے۔

4۔ پشتو رسم الخط کی تاریخ اور پس منظر کو اپنے لفظوں میں بیان کیجئے۔

5۔ پشتو حروف تہجی میں "ی" کی پانچ مختلف شکلیں موجود ہیں۔ان کا استعمال کن مواقع پر کیا جاتا ہے؟

6۔ "پشتو اور اردو کے لسانی روابط" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون تحریر کیجئے۔

7۔ پشتو میں مصدر کی کیا خاص علامت ہے۔مثالوں سے وضاحت کیجئے۔

حوالہ جات

(R-1)= Linguistic Survey of Pakistan (Vol. II) by G.A.Grierson, Lahore Accuratic Printers, P.9

(R-2)=Pashto Grammer by Dr. Trumpp, London, Imperial Academy, 1873 P.14

(R-3)= Chrestomathy of the Afghan Language by Barnhard Dorn. St. Petersburgh, Imperial Academy of Science. 1847, P. 3

(ح۔4)= بہادر شاہ ظفر،سید، پشتون اپنی نسل کے آئینے میں، پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، 1994ء، ص227

(ح۔5)= خیال بخاری، سید، پشتو ادب، مشمولہ پاکستانی ادب، عبدالشکور احسن (مرتب)، لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان 1981ء، ص130

(ح۔6)= اجمل خٹک، پشتو ادب، مشمولہ اٹک کے اس پار، فارغ ورضا (مرتبین)، لاہور، گوشۂ ادب، س ن، ص83

ح۔7۔ محمد مدنی عباسی، پشتو زبان وادب کی تاریخ، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، 1969، ص11

یونٹ نمبر 2

قدیم شعری ادب
(پشتو)

تحریر : عبداللہ جان عابد
نظرثانی : ڈاکٹر پرویز مہجور خویشکی
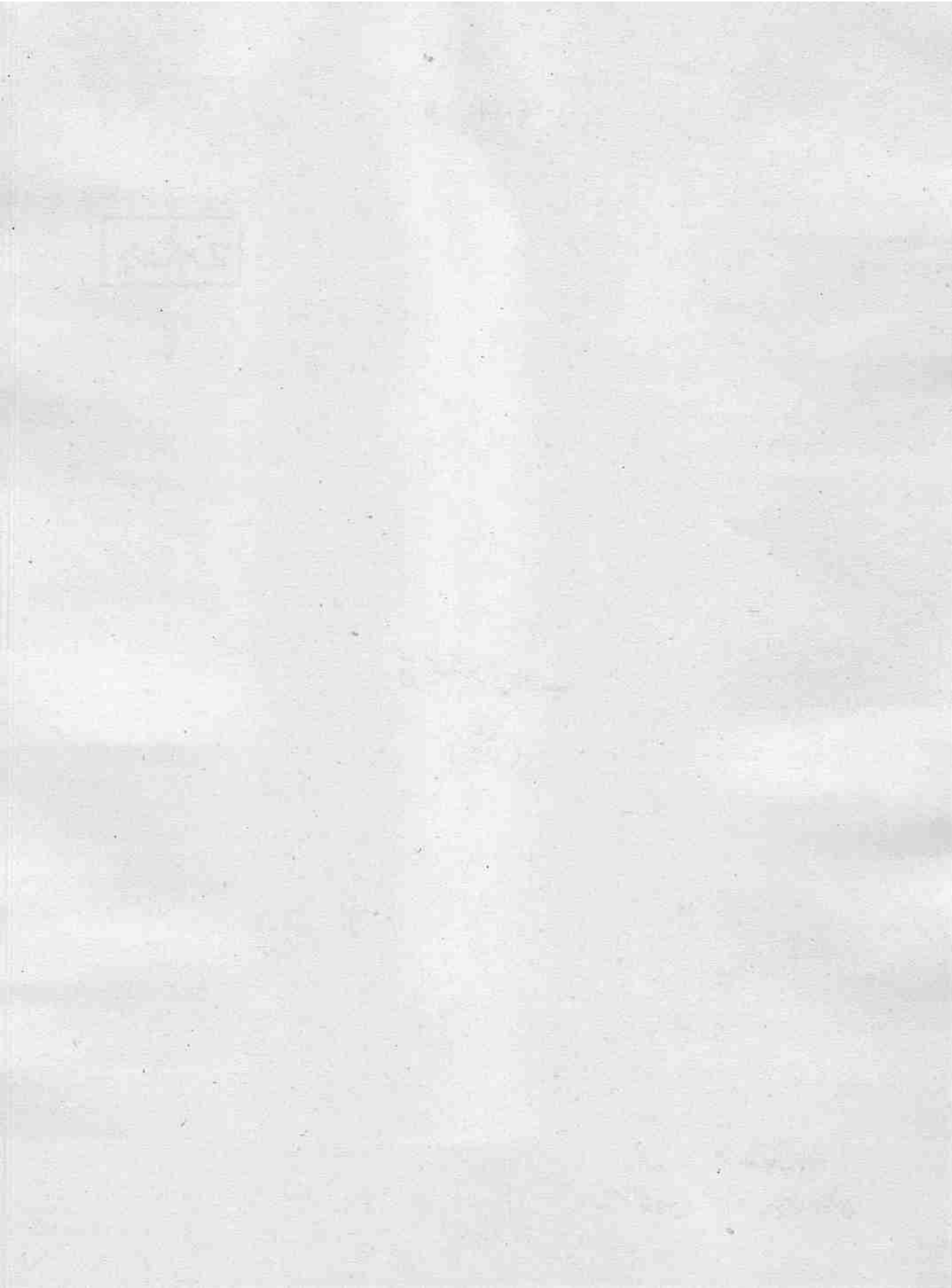
فہرست

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات

مطالعاتی رہنما کے اس یونٹ کا موضوع پشتو زبان کا قدیم شعری ادب ہے۔اس میں آپ پشتو کی قدیم اور لوک شاعری کا مطالعہ کریں گے۔ پشتو ادب کے علماء نے قدیم پشتو شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ان تین ادوار میں بہت سے شعراء نے نام پیدا کیا، تاہم اس یونٹ میں خوشحال خان خٹک اور عبدالرحمٰن بابا کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے کہ ان شعراء نے زبان و بیان کے اعتبار سے قدیم پشتو شاعری کو بام عروج تک پہنچایا۔ علاوہ ازیں زیر نظر یونٹ میں آپ پشتو لوک شاعری کی مختلف اصناف جیسے ٹپہ، چار بیتہ، بگتئ، نیمکئ، لوبہ، بدلہ اور اللہ ہُو کا بھی مطالعہ کریں گے۔قدیم پشتو شاعری کی تفہیم کے لئے صرف اس یونٹ پر انحصار نہیں کیا جانا چاہئے بلکہ اس کے لئے مجوزہ کتب کا مطالعہ بھی از حد ضروری ہے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- قدیم پشتو شاعری کے ارتقائی مدارج کو جان سکیں اور اس کے بارے میں وضاحت کر سکیں۔

2- قدیم پشتو شعری ادب کے اسلوب اور شعراء کے ادبی مقام سے واقف ہو سکیں۔

3- مختلف ادوار کی شاعری کی خصوصیات اور موضوعات بیان کر سکیں۔

4- لوک شاعری کی مختلف اصناف کے ناموں سے آگاہی کے ساتھ ساتھ ان کی ہیئت کے بارے میں جان سکیں۔
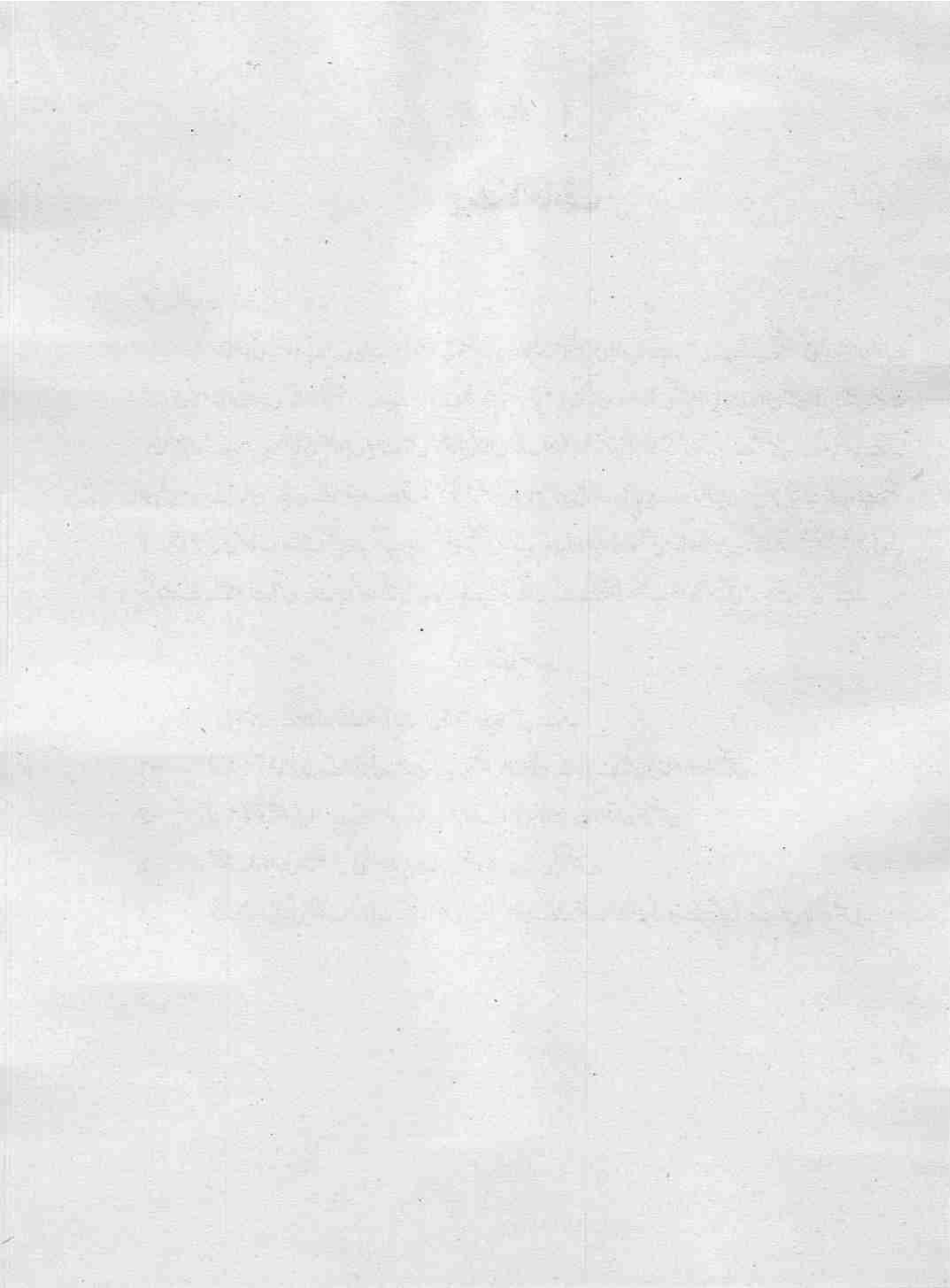
1۔ قدیم پشتو شاعری

پشتو کی قدیم شاعری تین ادوار پر مشتمل ہے۔ ذیل کی سطور میں ان ادوار کا مختصر تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

1.1- پہلا دور

قدیم پشتو شاعری کا پہلا دور دوسری صدی ہجری سے شروع ہو کر 900 ہجری پر ختم ہوتا ہے۔ یہ دور زیادہ تر ''پٹہ خزانہ'' (گنج مخفی)، ''دپختواد بیاتو تاریخ'' (تاریخ ادبیات پشتو) اور ''پختانہ شعراء'' (پشتون شعراء) سے اخذ کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ ''پٹہ خزانہ'' ایک ادبی و تاریخی تذکرہ ہے، جو محمد ہوتک ابن داود نے 42-1141ھ میں تحریر کیا۔ اس دور کا سب سے پہلا شاعر امیر کروڑ ہے، جو دوسری صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلامی دور کا پہلا معلوم شاعر ہے۔ پورا نام تاریخ نے امیر کروڑ جہان پہلوان سوری محفوظ کیا ہے۔ یہ 139ھ میں اپنے باپ کی موت کے بعد علاقہ غورستان کا امیر بنا۔ امیر کروڑ کا باپ ''امیر پولادسوری'' تھا جو ایک بہادر و جواں مرد بادشاہ تھا۔ امیر پولاد نے بنوامیہ کے خلاف ابومسلم خراسانی کا ساتھ دیا تھا اور یوں وہ خاندان بنوعباس کا ساتھی و مددگار تھا۔ امیر کروڑ کو قدرت نے شعر کہنے کا ملکہ بھی ودیعت کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ نہ صرف ایک جنگجو جواں مرد اور اپنے علاقے کا امیر تھا، بلکہ ایک اچھا شاعر بھی تھا۔ اس کی ایک نظم پٹہ خزانہ میں موجود ہے، جو ایک فخریہ اور حماسی رنگ رکھتی ہے۔ مذکورہ نظم کے سارے الفاظ خالص پشتو زبان کے ہیں۔ اس پر عربی، فارسی یا کسی اور زبان کا اثر نہیں ہے۔ اس نظم کے ابتدائی چار بندوں کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

میں اس دنیا میں مثل شیر کے ہوں
میرا ہمسر کوئی نہیں ہے
ہند و سندھ، تخار و کابل اور زابل میں بھی
میرا ہمسر کوئی نہیں ہے
میری ہمت کے تیر دشمن پر بجلی کی مانند گرتے ہیں
میں لڑائی کے میدان میں جا کر حملے کرتا ہوں
شکست کھا کر میدان جنگ سے بھاگنے والے
(میرے سامنے نہیں ٹھہرتے)

پہاڑ لرز جاتے ہیں، میں آبادیوں کو ویران کر ڈالتا ہوں
میرا ہمسر کوئی نہیں ہے
میں نے اپنی تلوار کے زور سے ہرات اور جروم کو
فتح کیا ہے، غرج اور بامیان کے باشندوں کے لئے
میرا نام باعث تسکین ہے، میرا نام روم میں بھی مشہور ہے
میرا ہمسر کوئی نہیں ہے

(اردو ترجمہ: محمد مدنی عباسی)

یہ دور کئی لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں کئی پشتون شعراء نے قدیم شعری ادب کو نئی اصناف سخن سے متعارف کرایا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شیخ اسعد سوری (425ھ) نے، جو سلطان امیر محمد سوری کا دوست تھا، امیر محمد شاہ سوری کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا، یہ پشتو ادب کا اولین قصیدہ سمجھا جاتا ہے جو چوالیس اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اسی دور کے ایک اور شاعر تایمنی (580ھ/1184ء) کا نام آتا ہے، جس نے چھٹی صدی ہجری میں ''مثنوی'' کی صنف کو متعارف کرایا۔ یہ شاعر شاہانِ غوریہ کے عہد میں پیدا ہوا۔ اس نے سلطان غیاث الدین غوری کی مدح میں ایک نظم لکھی، جو پشتو مثنوی کی پہلی شکل سمجھی جاتی ہے۔ اس کے ابتدائی چند اشعار مع اردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

نن زه گڼیگم په صفت د سلطان	آج میں سلطان کی تعریف میں رطب اللسان ہوں
چه دے بادار غازی ملک د جهان	جو مالک ہے، غازی ہے اور دنیا کا بادشاہ ہے
دفیروز کوه او غور رڼڼا له ده ده	کوہ فیروز اور غور کی روشنی اسی سے ہے
هم د تیرو تورو برېښنا له ده ده	اور تیز تلواروں کی چمک اسی کے دم سے قائم ہے
چه توره و کاگی چړتون کی خالی	جب وہ تلوار کھینچتا ہے اور نیام خالی ہو جاتی ہے
غلیم ئے کله کړی په توره سیالی	تو دشمن اس کی تلوار کی برابری نہیں کر سکتا
غیاث الدین دغور زمرے عالی شان	غیاث الدین ، غور کا عظیم شیر ہے
د اسلام دین دده په توره روخان	دین اسلام اسی کی تلوار کی بدولت روشن ہے

اس دور کا ایک اور شاعر بابا ھوتک (661ھ-740ھ) ہے، جس نے پشتو ادب میں پہلی دفعہ اپنی ایک نظم میں

مغلوں کے حملوں اور قتل و غارت کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔قدیم پشتو شعری ادب کے پہلے دور کا ایک اور اہم شاعر اکبر زمینداور (781ھ/1369ء) ہے، جس نے پہلی بار غزل کی صنف کو پشتو شعری ادب میں شامل کیا۔ان کی غزل میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی جھلک بھی نمایاں ہے۔انھوں نے ان شعراء کے بعد اپنے انداز میں خوبصورت غزلیں لکھیں۔ان غزلوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان تک پہنچتے پہنچتے پشتو غزل میں بہت سے نئے تجربات ہوئے ہوں گے اور ان کے سامنے غزل کا کوئی ایسا خوبصورت نمونہ ضرور موجود ہوگا، جسے بنیاد بنا کر انہوں نے خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔موجود تحریری اسناد کی رو سے اکبر پشتو زبان کے پہلے غزل گو شاعر بنتے ہیں، جنہوں نے پشتو کو پختہ اور معیاری غزل عطا کی اور پشتو کو وہ افکار اور تصورات دیئے، جو فارسی گو شعراء نے اپنی غزلوں میں پیش کئے تھے۔انھوں نے غزل کے علاوہ ایک رومانی نظم بھی لکھی جو پشتو میں ''مربع نظم'' کی پہلی شکل سمجھی جاتی ہے۔ان کی ایک غزل کے چند اشعار مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

چه مدام زه ستا و مخ و ته نظر وژم	جب میں تمہارے عارض کی طرف دیکھتا ہوں
دبیلتون له بیڑے زڑه زیر و زبر وژم	تو فراق کے ڈر سے میرا دل زیروزبر ہو جاتا ہے
که په مادے حکم وشی چه خادم شه	اگر مجھے حکم دیا جائے کہ "تو میرا نوکر ہو جا" تو میں
دغه ستا د نغری سورانگار په سر وژم	تیرے چولھے کے سرخ انگارے سر پہ اٹھا کر لیجاؤں
چه جمال په مهر اومینه راخکاره کی	جب (وہ) محبت سے اپنا جمال دکھاتا ہے تو میں
شین طوطی شم په هوا دمینے پروژم	سبز طوطی کی طرح خوشی سے ہوا میں اڑتا ہوں
که مے وژنے که مے پیرے رضا ستاده	مجھے مار ڈالو یا پرو ڈالو تمہاری مرضی
ستاو غشی ته مدام موخه ځیگروژم	میں تو ہمیشہ تمہارے ہی تیر کے سامنے اپنا جگر رکھتا ہوں
چه جمال دے په هجرانٔ کے راپه یادشی	جب فراق میں تیرا جمال یاد آتا ہے
هغه دم په تصور شمس و قمر وژم	تو میں اس وقت شمس و قمر کا تصور کر لیتا ہوں
ستاد تورو سنڑو خیال هسے طویل دے	تیری کالی زلفوں کا خیال اتنا طویل ہے، کہ
تل په زڑه کے دغه فکر زه اکبر وژم	اکبر اسے ساری زندگی انجام تک نہیں پہنچا سکتا

اس دور کے ایک اور شاعر خلیل نیازی نے پہلی بار پشتو شاعری میں رباعی کو متعارف کرایا۔یہ سلطان بہلول لودھی، (وفات 894ھ) کا درباری شاعر تھا۔

اس دور کی شاعرات میں بی بی زرغونہ اور رابعہ خاص شہرت رکھتی ہیں۔ یہ اس دور کے آخر یعنی 900 ھ میں بقید حیات تھیں۔ بی بی زرغونہ نے غزل اور مثنوی لکھنے کے علاوہ بوستان سعدیؒ کا پشتو نظم میں ترجمہ بھی کیا۔ رابعہ ایک صاحب دیوان شاعرہ تھی۔ پٹہ خزانہ (گنج مخفی) نے، اس کی صرف ایک رباعی کو درج کیا ہے۔ یہ دونوں شاعرات قندھار کی رہنے والی تھیں، جو دیگر شعراء اس دور سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں شیخ رضی لودھی، امیر نصر لودھی، شیخ بیٹن، شخ اسماعیل سڑبنے، خرشبون، ملک یار غرشین، شکارندوے، قطب الدین بختیار کاکی، شیخ متی، شیخ ملک یار، سلطان بہلول لودھی، شیخ محمد صالح، زرغون خان اور دوست محمد کاکڑ نمایاں ہیں۔

پشتو شاعری کا یہ پہلا دور کئی لحاظ سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ پشتو شاعری میں کئی اصناف سخن، مثلاً: مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، غزل اور مربع نظم اسی دور میں متعارف ہوئیں۔ اس دور کی نظمیں پیچیدہ افکار و تخیلات سے مبرا، سادہ اور عام فہم ہیں تاہم ان میں بعض استعمال شدہ الفاظ اب متروک ہیں۔ یہ دور آٹھ صدیوں پر محیط ہے، جس کے بارے میں محققین کی مجموعی رائے یہ ہے کہ امیر کروڑ کے بعد چوتھی صدی ہجری تک پشتو شاعری دوسری زبانوں کے اثر سے بالکل محفوظ رہی، لیکن چوتھی صدی ہجری کے بعد اس پر عربی، فارسی اور ترکی کا اثر نمایاں ہونا شروع ہوگیا۔

1.2۔ دوسرا دور

پشتو قدیم شاعری کا دوسرا دور "روشنیہ دور" کہلاتا ہے۔ اس دور کا سب سے مشہور نام بایزید انصاری المعروف بہ پیر روخان (پیر روشن، 32-931ھ تا 980ھ) ہے۔ (صوبہ سرحد کے جنوبی اضلاع کے لہجے کے مطابق پیر روخان کو پیر روشان کہا جاتا ہے۔ اردو میں ان دونوں کے لئے متبادل کے طور پر "پیر روشن" کہا جاتا ہے، جو صحیح ہے)۔ بایزید انصاری قبائلی علاقہ وزیرستان (کانی گرم) کے ایک مشہور مذہبی اور روحانی خاندان "انصاری" سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے پڑدادا ابراہیم دانشمند، جو عمر شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ اور مشہور صوفی زکریا ملتانی کے پیر بھائی تھے۔ عراق سے ملتان آئے اور ملتان سے وزیرستان آ کر یہیں کے ہو رہے۔

حضرت بایزید انصاری المعروف بہ پیر روخان / پیر روشان (پیر روشن) ایک صوفی دانشور تھے۔ وہ صوبہ سرحد کی تاریخ میں ایک اہم مذہبی اور صوفیانہ تحریک کے بانی تھے، جو صوفیانہ تعلیمات کے ساتھ ساتھ بدعت اور شرک کی مخالفت کا عزم لے کر وزیرستان سے اٹھ کر صوبہ سرحد کے جنوبی علاقوں سے ہوتے ہوئے شمالی علاقوں تک آئے، پشاور، چارسدہ اور مردان

پہنچے اور مردان کے علاقے میں ہی 980ھ میں وفات پا گئے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مقصود المومنین، صراط التوحید اور خیر البیان ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ''خیر البیان'' کو وہ الہامی کتاب قرار دیتے ہیں۔ اس کی تاریخ تصنیف بعض محققین کے نزدیک 957ھ/972ھ اور بعض کے نزدیک 975ھ ہے۔ تصوف کے موضوع پر لکھی گئی اس کتاب کے صوفیانہ افکار نے پشتو کی قدیم شاعری میں ایک ادبی مکتب کو جنم دیا، جسے پشتو ادب میں روخانی مکتب (روشنیہ مکتب) کہا جاتا ہے۔ بایزید انصاری کے افکار کو سب سے پہلے جس شاعر نے شعری جامہ پہنایا، وہ ملا ارزانی خویشکی (927ھ-1010ھ) تھے۔ (بی بی سی نے 2002ء میں ارزانی خویشکی پر پروفیسر عبدالخالق رشید کی ایک تحقیق کو نشر کرتے ہوئے، ان کا سن وفات 1028ھ بتایا، یہ ان کی لوح تربت پر، جو پٹنہ (ہند) میں ہے، لکھا ہوا ہے۔) یہ تحریک روشنیہ کے پہلے قابل ذکر شاعر ہیں اور موجود تحریری اسناد کی رو سے پشتو کے پہلے صاحب دیوان شاعر بھی۔ بایزید انصاری کے مرید تھے اور ساتھ ہی ان کے مسلک، افکار اور خیالات کے تشریح کنندہ اور مفسر بھی۔ ارزانی کے قبیلہ اور وطن کے بارے میں ''حالنامہ'' کے مؤلف علی محمد مخلص لکھتے ہیں: ''ملا ارزانی از قبائل خویشکی بود و وطن در قصور داشت'' یعنی ارزانی کا تعلق قبیلہ خویشکی سے تھا اور ان کا وطن قصور تھا۔

ارزانی خویشکی کا کلام تصوف کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ پشتو میں الف نامے اور موضوعاتی نظمیں لکھنے کی ابتدا انہوں نے کی۔ ان کی بعض موضوعاتی نظموں کے اشعار کی تعداد دو سو تک پہنچتی ہے۔ ارزانی کا ذکر اخون درویزہ بابا نے اپنے تذکرے میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ ایک اچھے عالم تھے اور چار زبانوں میں شاعری کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بایزید انصاری کی وضع کردہ تصوف کی آٹھ منازل شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت' قربت، وصلت، وحدت اور سکونت کی تشریح نہایت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے۔ وہ روشنیہ مکتبہ فکر کے پہلے شاعر تھے، جنہوں نے شعوری طور پر میاں روخان (میاں روشن) کی تعلیمات اور مسلک کو عام کرنے کے لئے کوششیں کیں اور اسے ایک خاص ادبی اسلوب سے نوازا۔ ان کے کلیات کو پشتو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل ہے، جس کی تمام شاعری چھوٹی بحر میں ہے:

اگر حق مجھے توفیق دے
تو میں اس کی ثنا لکھوں گا
پشتو زبان میں ایک دیوان
تیں حروف کا لکھوں گا

اس طرح میری یادگار باقی رہے گی

پشتو زبان میں حق گوئی کی

ارزانی پشتو میں کہتا ہے

صدقنا و آمنا

(ترجمہ: پروفیسر پردل خٹک)

بعدازاں اس اسلوب کو مرزا خان انصاری (وفات 1040ھ) نے مزید فلسفیانہ باریکی اور رومانی رنگینی سے مؤثر بنایا۔ مرزا خان انصاری کو روشنیہ مکتبہء فکر کے شعراء میں ایک منفرد مقام حاصل ہے اور یہ اس مکتبہء فکر کے وہ واحد نمائندہ شاعر ہیں، جن کے بعد آنے والے تمام شعراء نے ان کے شعری معیار کو اپنایا اور اس کی پیروی کی۔ ان کے کلام میں روشنیہ فلسفے کا بھرپور عکس موجود ہے اور انہوں نے ارزانی کے بعد اپنی شاعری کے ذریعے پشتو ادب کو علم تصوف سے روشناس کرایا۔ وہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باعمل صوفی بھی تھے چنانچہ انہوں نے اپنی تمام زندگی تصوف کے ایک اہم مقام، فنافی الشیخ کے مرتبے پر فائز ہو کر گزاری۔ ان کا دیوان پہلی بار 1959ء اور دوسری بار 1975ء میں شائع ہوا۔ مرزا خان انصاری کی شاعرانہ عظمت کو خوشحال خان خٹک نے بھی سراہا ہے اور ان کو واحد شاعر کہا ہے، جو علم عروض سے بہرہ ور ہے۔ انہوں نے بایزید انصاری کے مسلک کو شہرت بخشی۔ پشتو شاعری میں مرزا خان اس مکتبہء فکر کے بہت بڑے مبلغ اور غزل کو ایک خاص روش پر ڈالنے والوں میں شمار ہوتے ہیں:

میں کیا کہوں گا کہ کیا ہوں

میری نیستی اور ہستی انہی کی بدولت ہے

جو ہستی سے نیست ہو جائے

میں ہی اس کی ہستی کی مثال ہوں

وصال کی خواہش میں اڑتا ہوں

میں اس لامکاں کا پرندہ ہوں

کبھی سورج کے سامنے ذرے کی مانند

کبھی پانی کے قطرے کی طرح

مرزا کی زبانی بول رہا ہوں

میں ایک بے مثل روخان ہوں

(ترجمہ: پروفیسر پردل خٹک)

مرزا خان انصاری کے بعد دولت لوانی (وفات 1058ھ کے بعد)، روشنیہ مکتبہء فکر کے ایک اور معروف شاعر تھے۔ اس مکتبہء فکر کے دیگر شعراء کے مقابلے میں ان کا کلام قدرے آساں اور عام فہم ہے۔ پشتو میں پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ان کا ایک کلیات موجود ہے، جس میں فلسفہ تصوف بڑی شد و مد کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

یو اللہ دے پہ دوہ کونہ نور سہ نہ شتہ | چے سہ شتہ دے ھم لہ دهٔ واڑہ پہ دہ شتہ
ماوتا خپل سر سرگند کہ دے غایب شو | مخ بہ ھومرہ سرگند نہ کا سو زہ تہ شتہ
کل عالم ددہ پہ ذات زندہ دے پائ | د ماھی حیات وی ھومرہ سو اوبہ شتہ

ترجمہ: 1۔ دونوں جہانوں میں سوائے اللہ کے اور کچھ نہیں، جو کچھ ہے اسی پر موقوف ہے (اسی کی وجہ سے ہے)

2۔ میں نے اور تم نے اپنا اپنا سر اٹھایا اور وہ غائب ہو گیا، جب تک میں اور تو ہے۔ وہ اپنا چہرہ اشکارہ نہیں کریگا۔

3۔ سارا عالم اسی کے وجود سے زندہ ہے۔ ماہی کی زندگی تب ہوگی، جب تک پانی ہوگا۔

روشنیہ مکتبہ فکر کے ایک اور شاعر واصل روخانی ہیں جو مرزا خان انصاری کے ہمعصر ہیں، ان کی شاعری بھی فلسفیانہ باریکی اور رومانی رنگینوں سے مزین ہے بلکہ ان کی شاعری صوفیانہ تخیل اور رومانیت کی ایک منفرد مابعد الطبعیاتی امتزاج پیش کرتی ہے۔ چند اشعار مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

لکہ نمر د نیمے ورز پہ مقام رانغے | پہ یقین کے دگمان سایہ مشکلہ
معرفت د ریاضت جامہ اغوستے | پلک د سترگے ھم غلاف دے ھم صیقلہ
سوڑ دیدن د محبت پہ قطار نہ دے | د سپوگمۍ پہ رنڑا نہ پخیگی اوم
کہ عاشق راپسے ومری غم ئے سہ دے | د حیات نسیم ئے زہ یم پرے لگیم

ترجمہ: 1۔ جیسے سورج دن کے درمیانی حصے میں سر پر آتا ہے، یقین کے عالم میں سائے کا ٹھہر جانا مشکل ہو جاتا ہے۔

2۔ معرفت ریاضت کا لباس پہنے ہوئے ہے، آنکھوں کی پلکیں اس کا غلاف بھی ہیں اور صیقل بھی۔

3۔ بے خلوص ملنا محبت کے کام نہیں آتا، چاند کی روشنی میں کچی چیز نہیں پکتی۔

4۔اگر عاشق میرے پیچھے مرتا ہے تو اس کا غم ہی کیا ہے، کیونکہ میں ہی نسیم حیات ہوں، جو اس کے پاس سے گزرتی ہوں۔

واصل کے بعد علی محمد مخلص (20-1019ھ-1080ھ) روشنیہ مکتبہ فکر کے وہ شاعر ہیں، جنہوں نے روشنیہ تصوفی فلسفہ پر ابن عربیؒ کا رنگ چڑھایا اور پشتو کی صوفیانہ شاعری کو حکیم سنائیؒ اور مولانا رومؒ کی شاعری کا ہم پلہ بنا دیا۔ نمونہ کلام مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

اے مخلصہ د توحید تمثیل سرگند دے — دا مولیٰ مانند سیاھی خلق حروف

ھر نفس لار دہ سرگندہ و بیچوں تہ — چے پرلب دنھر زی ورشی جیحون تہ

پہ ظاھر کے د باطن مشاھدہ کڑہ — پہ مقنع کے سرگندیگی نوعروسہ

ترجمہ: 1۔اے مخلص توحید کی تمثیل واضح ہے۔ یہ خالق سیاہی کی طرح اور مخلوق حروف کی طرح ہیں۔

2۔بیچون کی جانب روح کی راہ واضح ہے جو کوئی نہر کے کنارے جاتا ہے وہ (دریائے) جیحون تک پہنچ جاتا ہے۔

3۔ظاہر میں باطن کا مشاہدہ کر کیونکہ دلہن کا چہرہ مقنع میں نظر آتا ہے۔

روشنیہ مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ایک اور شاعر کریم داد ہیں، جو علی محمد مخلص کے ہم عصر تھے۔ ان کی شاعری بھی روخانی تصوف اور تعلیمات کی آئینہ دار ہے۔ دیگر روشنیہ شعراء کے مقابلے میں ان کے دیوان کی ضخامت نہایت ہی کم ہے، تاہم انھوں نے پشتو کے ساتھ ساتھ فارسی کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا اور فارسی کلام میں اپنا تخلص ''عیشی'' استعمال کیا۔ ان کے پشتو دیوان کو خیال بخاری نے ایڈٹ کیا اور 1964ء میں پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے زیور طبع سے آراستہ کیا۔ علاوہ ازیں متعدد ادبی تذکروں اور دیگر منابع میں سے کئی ایسے شعراء کے نام اور ان کے کلام کے نمونے ہمیں ملتے ہیں، جو روشنیہ ادبی مکتب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ولی محمد، اھداد، جھان داد خان، یوسف خان، سمیل خان (اسماعیل خان) بوھار، میاں خان اور فتح خان قابلِ ذکر ہیں۔

قدیم پشتو شاعری کے اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے روشنیہ شعراء نے پشتو شاعری کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی، جس سے بجا طور پر بعد میں آنے والے شعراء نے استفادہ کیا۔ اس دور کے اکثر شعراء نے غزل میں چھوٹی اور بڑی بحروں پر بھی طبع آزمائی کی اور فنی مہارت سے صوفیانہ اور ادبی اصطلاحات پشتو میں منتقل کیں۔ الف نامہ، پشتو شاعری میں روشنیہ مکتب فکر کی ایک نئی ایجاد ہے۔ اس میں حروف تہجی کی اساس پر صوفیانہ اسرار بیان کیے جاتے ہیں۔ ارزانی خویشکی اس

قسم کی نظم کا موجد ہے۔

پشتو شاعری کا یہ دوسرا دور ایک صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔اس دور کی شاعری میں تین رنگ تصوف، پشتو زبان وادب کا فروغ اور قومی احساس نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔مجموعی طور پر بایزید انصاری اور ان کے حلقہءاثر کے دوسرے شعراء نے پشتو شاعری کی روایت کو مزید آگے بڑھایا اور اس میں خصوصی طور پر تصوف کے مضامین کو داخل کیا اور بالخصوص فلسفہءِ وحدت الوجود کو بھی اپنی شاعری کا بنیادی اور مرکزی موضوع بنایا۔اس کے ساتھ ساتھ پشتو شاعری میں دوسری مشرقی زبانوں کے محبوب موضوعات کو بھی رواج دیا، جس سے پشتو شاعری کا دامن اور وسیع ہوا۔

1.3۔ تیسرا دور

خوشحال خان خٹک (1022ھ - 1100ھ) قدیم پشتو شاعری کے اس تیسرے دور کے سرخیل ہیں اور اس دور کا آغاز ان کی انقلاب انگیز اور آفاقی شاعری سے ہوتا ہے۔اس سے پہلے روشنیہ شاعری کا موضوع تصوف تک محدود تھا اور اسلوب خالص علمی اور فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے تھا۔خوشحال خان خٹک نے اپنی شاعری میں زندگی کے مختلف موضوعات کا احاطہ کیا۔انہوں نے رزمیت وحماسیت' قومیت واخلاق، عشق وجنس اور سیروشکار کے ساتھ ساتھ تصوف کے مضامین بھی اپنی شاعری میں سموئے اور ان مضامین کے ساتھ ساتھ شاعرانہ اور فنی باریکیوں پر بھی بھرپور توجہ دی۔

خوشحال خان خٹک کے والد کا نام شہباز خان تھا، جو اپنے قبیلے کے سردار اور منصبدار تھے۔خوشحال بابا کے دادا یحیٰی خان اور پردادا ملک اکوڑ خان تھے۔قصبہ اکوڑہ انہیں کے نام پر ہے۔ملک اکوڑ خان کو مغل شہنشاہ اکبر نے دریائے اٹک سے نوشہرہ تک کی شاہراہ کی نگرانی کا کام سپرد کیا تھا اور اس خدمت کے عوض انہیں منصب عطا ہوا تھا۔یوں وہ چار پشتوں سے مغلیہ خاندان کے نمک خوار اور منصب دار چلے آرہے تھے۔ملک اکوڑ خان کے بعد اس کا بیٹا یحیٰی خان اور اس کے بعد اس کا بیٹا شہباز خان، شہنشاہ ہمایوں، جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد حکومت تک نہایت جان سپاری سے خدمات سرانجام دیتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک اکوڑ، یحیٰی خان اور شہباز خان، بلکہ شروع شروع میں کافی عرصے تک خود خوشحال خان خٹک نے بھی مغلوں کی طرف داری میں تلوار اٹھائی اور یوسف زیوں سے کئی لڑائیاں لڑیں۔(یہاں تک کہ خوشحال بابا کے باپ اور دادا دونوں انہی لڑائیوں میں یوسف زئی قبائل کے ہاتھوں کام آئے) لیکن آخرکار خوشحال بابا کی زندگی میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ وہ مغلوں کے آلہ کار بننے کی بجائے ان کے خلاف تلوار ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر تمام زندگی ان کے خلاف صف آراء رہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں پشاور کے ایک گورنر (صوبہ دار) نے ایک سازش کے تحت مغلیہ دربار کو مغلوں کے اس پرانے نمک خوار سے بدظن کر دیا۔ نتیجتاً خوشحال خان خٹک کو جو اس وقت تک علاقے کے حاکم کی حیثیت رکھتے تھے، پہلے پشاور بلایا گیا اور یہاں سے پابہ جولاں دہلی بھجوایا گیا۔ رہائی کے بعد خوشحال خان خٹک نے مغلوں کے خلاف پشتونوں کو متحد کرنے اور تلوار کے ذریعے ان کو اپنے علاقے سے نکال باہر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سارے پس منظر کی ایک جھلک ان کے اشعار میں دیکھئے:

نمک کھایا ہے مغلوں کا مگر اب
ہوں اورنگ زیب کے ہاتھوں دل افگار
مجھے ناحق اسیر غم کیا ہے
نہیں میں جرم سے اپنے خبردار
ہے افغانوں سے اس کے دل میں نفرت
میں اسکی نیتوں سے ہوں خبردار
کھرے کھوٹے کو میں سنگ محک ہوں
مجھے معلوم ہیں یہ سارے اسرار

☆☆☆☆

بسر ہوتی نہ ہو، جو آبرو سے
بھلا وہ زندگی کس کام کی ہے
نہ میں نقصان سے ہوں دل میں خائف
نہ خواہش کچھ مجھے انعام کی ہے
مجھے غیرت نے پاگل کر دیا ہے
دعا میں نے یہ صبح و شام کی ہے
بچا ذلت سے یا رب جو مغل نے
مناصب کے بہانے عام کی ہے
جو مغلوں کی غلامی کر رہا ہے

میں اس افغان سے ہوں آج بہتر
تھا جب تک پاس میرے منصب و جاہ
تو میں کیا تھا، فقط بے کار افسر
مگر اب میں ملک سے کم نہیں ہوں
گلے سے طوق دولت کو جھٹک کر
خدا کا شکر ہے آزاد ہوں میں
نہیں فرمانِ شاہی کا کوئی ڈر

☆☆☆☆

نہ درباروں میں اب جانے کی حاجت
نہ ہر اک در پہ ہے اب سجدہ ریزی
مجھے ان سادہ کپڑوں سے ہے الفت
نہیں مطلوب ہے اطلس کی تیزی
مجھے مرغوب اپنی جھونپڑی ہے
نہیں بھاتی، محل کی عطر بیزی
بھلے ہیں چھاچھ اور جو، کیوں کروں میں
پلاؤ کے لئے حق سے گریزی
اگرچہ ساٹھ برسوں سے زیادہ
ہوئی ہے عمر میری، پر جواں ہوں
سواری میں ہوں اب بھی مثل ازبک
یہ مانا میں شکستہ استخواں ہوں
میں اپنی قوم کی عزت کی خاطر
عدو کے واسطے تیغ و سناں ہوں
نہیں ثانی زمانے بھر میں جس کا
وہ غیرت مند، میں خوشحال خاں ہوں

لیکن اپنے ایک بیٹے اور چچاؤں کے ہاتھوں وہ اپنی اس مہم میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ خوشحال خان کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ وہ اگر ایک طرف اپنے قبیلہ کے سردار تھے، تو دوسری طرف چار پشتوں سے مغل دربار کے منصب دار بھی تھے۔ وہ ایک جری سپاہی، سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے سپہ سالار، شاعر، ادیب، حکیم، فلسفی، مؤرخ، جغرافیہ دان، رند، صوفی، عالم باعمل، عاشق، شکاری، سیاح، حسن پرست، دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن بھی تھے۔

اس وقت ہم خوشحال بابا کی اس ہمہ گیر شخصیت کے صرف ایک پہلو یعنی شاعری کو لیتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں شاعری انسان کے اندرونی احساسات و جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے اور انسان اپنی ذات اور اردگرد کے واقعات سے کسی وقت بھی لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ خوشحال خان کی شاعری میں بھی وہ تمام چیزیں سمٹ کر آ گئی ہیں جن سے ان کو سابقہ پڑا تھا۔

قدرت نے خوشحال بابا کو شعر کہنے کا ملکہ بدرجۂ کمال عطا کیا تھا۔ انہوں نے پشتو شاعری میں نئے نئے تجربے کئے اور قصیدہ، مثنوی، مسدس اور دوسری اصناف سخن سے پشتو شاعری کو روشناس کرایا اور ان اصناف میں ایسے ایسے نادر اور خوبصورت مضامین باندھے کہ اس سے پہلے پشتو شاعری اس سے ناآشنا تھی بقول پریشان خٹک:

> ''خوشحال خان خٹک نے پہلی دفعہ پشتو شاعری میں تقریباً ان تمام اصناف سخن کو متعارف کرایا، جو فارسی اور عربی شاعری میں موجود ہیں۔ انہوں نے غزل، رباعی، قصیدہ، مخمس، مسدس، معشر اور ترکیب بند وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔ فارسی اور عربی کی مختلف صنعتوں مثلاً تجنیس، حسن تعلیل، طباق الاضداد، ایہام، صنعت ترجیع، تنسیخ الصفات اور لف ونشر وغیر کو پشتو شاعری میں متعارف کرایا، لیکن اس بات کا خاص خیال رکھا کہ پشتو شاعری میں فارسی شاعری کی طرح فراریت (Escapism) شامل نہ ہو۔ وہ زندگی میں فرار کی بجائے عمل کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے شاعری میں رومانیت کے علاوہ بھی ہر موضوع پر طبع آزمائی کی اور اس کا حق ادا کیا۔'' (ح۔1)

خوشحال خان خٹک نے قصیدے کے مضامین کو وسعت دی اور اسے شخصیات کی مدح سے نکال کر اخلاقیات کے لئے استعمال کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کو پشتونوں کے مزاج سے ہم آہنگ کیا اور غزل کے مضامین کو اس قدر وسعت دی کہ بعد کے شعراء کو پشتو میں تنگ دامانی کا گلہ نہیں رہا اور اس وسعت کا احساس اور اندازہ انہیں زندگی ہی میں ہو گیا تھا کہ انھوں نے اپنے لازوال فن اور بے پناہ تیز قوت متخیلہ کی بدولت پشتو شعر و ادب میں نت نئے مضامین کا اضافہ کیا اور ساتھ ہی ان کی نادر

تشبیہات، استعارات اور تماثیل، لذّتِ شعر میں اضافے کے باعث بنے اور اس ضمن میں کلاسیکل دور کے تمام شعراء کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اس لئے تو برملا بول پڑے:

میں نے اونچا کیا جب ادب کا علم
آگئے، شعر کے ملک زیر سمند
ہیچ ہے میرے افکار کے سامنے
شعر شیراز و فکر کمال خجند
بحر و اوزان و تقطیع کی سلک میں
میں نے الہام کے دُر پرو کر دئے
بے زر و مال کا ایک بنجارہ تھا
میں نے اس کو درخشندہ گوہر دئے
خشک ٹکڑا تھا نان جویں کا مگر
میں نے قند و نبات و عسل کر دیا
میں نے ندرت سے تشبیہ و تمثیل کی
لذّت شعر کو بے بدل کر دیا
مُدعی ایک جگنو تھا میرے لیے
میں ستارے کی مانند ظاہر ہوا
بند بستے میں مرزا کا دیوان ہے
میں نے ارزانی پر بھی تمسخر کیا
چاہے، دولت تھا، واصل تھا یا کوئی اور
باتوں باتوں میں ان سب کو بے گُر کیا

مستشرقین کے علاوہ علامہ اقبال نے سب سے پہلے خوشحال خان کو اُردو خواں طبقے سے متعارف کرایا۔ خوشحال اور علامہ اقبال کے افکار میں بھی کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔

مثلاً علامہ اقبال نے مسلمانوں کوخودی کا درس دیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خود کو پہچاننے اور خودی کو بلند کرنے کا یہی درس ہمارے خوشحال بابا نے بھی مختلف پیرایوں میں دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

عارف وہ ہے جس نے اپنا آپ لیا پہچان
ہے عرفان ذات میں اے دل عرفان سبحان

شاعر مشرق ہمیں ستاروں پر کمند ڈالنے کا سبق دیتے ہوئے کہتے ہیں:

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

اب دیکھئے کہ خوشحال بابا یہی سبق چار سو سال پہلے ہمیں کس انداز میں دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

اور بھی ہیں کتنے ہی جہاں
تم ہی نہ دیکھ سکے ناداں
کتنی زمینیں کتنے فلک
تیری نظروں سے ہیں نہاں
اپنے دل کو ٹٹول کے دیکھ
عرش سے اونچے ہیں انساں
آئینہ دل کو صیقل کر
سب کچھ ہو جائے گا عیاں

خوشحال خان خٹک ایک کثیر التصانیف مصنف تھے۔ میجر راورٹی نے اپنی کتاب ''گرامر آف دی افغان لینگویج'' کے مقدمہ میں ان کی کتابوں کی تعداد 360 بتائی ہے، لیکن معروف محقق دوست محمد کامل (ح۔2) نے ان میں سے صرف بارہ (12) دستیاب کتابوں کا ذکر کیا ہے، جن میں کلیات خوشحال خان خٹک، دستار نامہ، باز نامہ، سوات نامہ، فضل نامہ، فراق

نامہ،فرخنامہ، بیاض، صحت البدن یا طب نامہ، آئینہ، ھدایہ اور زنجیریؑ شامل ہیں۔ پشتو کے ایک اور محقق ھمیش خلیل نے ان کی دو اور کتابوں کا کھوج لگا کر ''اخلاق نامہ'' اور ''نام حق'' کے نام سے شائع کی ہیں۔

کلیات خوشحال خان خٹک میں نظم، غزل، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مثنوی، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند اور فارسی غزلیں شامل ہیں۔ ''دستار نامہ'' میں متفرق نثری مضامین سیاست، اخلاق، تصوف، فنون سپاہ گری اور فنون لطیفہ شامل ہیں۔ مثنوی ''باز نامہ'' میں بازوں کے پالنے کے طریقے، ان کی اقسام، ان کی مختلف بیماریوں اور علاج کا ذکر ہے۔ ''سوات نامہ'' سوات کی جغرافیائی تمدنی اور سماجی زندگی سے متعلق ہے۔ ''فضل نامہ'' چھوٹی بحر کی مثنوی ہے، جس میں ارکان خمسہ اور عبادات کا ذکر ہے۔ ''فراق نامہ'' قید و بند کے حالات کی روداد ہے۔ ''فرخ نامہ'' مناظرہ شمشیر و قلم ہے۔ ''بیاض'' خوشحال کے خود نوشت حالات زندگی ہے۔ صحت البدن یا طب نامہ حفظان صحت اور طب سے متعلق ہے۔ ''آئینہ'' فقہ کی کتاب کا عربی سے پشتو ترجمہ ہے۔ ''ھدایہ'' معروف عربی کتاب ہدایہ کا پشتو ترجمہ ہے اور ''زنزیریؑ'' پشتو شارٹ ہینڈ، جو ان کی اپنی ایجاد ہے۔ نمونہ کلام کا اردو منظوم ترجمہ ملاحظہ ہو:

غزل

تیغ کی تیزی تو ہے بس وار کے لئے
پیچ و خم ہے زلف کا دلدار کے لئے
کیوں مجھے کہتے ہو کہ خوباں کو نہ دیکھو
آنکھیں تو پیدا ہوئیں دیدار کے لئے
شیخ وقف سجدہ ہے، میں محوِ مئے کشی
آئے ہیں اپنے اپنے ہی کردار کے لئے
کہتی ہو مجھ سے کہ میرا تلخ ہے بوسہ
مجھ کو دوا دو دلِ بیمار کے لئے
مئے و چنگ و یار کے ہمراہ میں خوشحال
شعر بلب جاتا ہوں گلزار کے لئے

(ترجمہ: فارغ ورضا)

مرد

مرد وہ، ہمت سے پہنچے آسماں تک جس کی خاک
زندگی کرنے کا جس میں ہو سلیقہ تابناک
چہرہ روشن، قول سچا، عہد اُس کا باوفا
بے دروغ و بے فریب و بے ریا اُس کا تپاک
یوں تو کم آمیز ہو لیکن عمل میں تیز ہو
مثلِ غنچہ بند اُس کا منہ ہو اور سینہ ہو چاک
بات پستی اور بلندی کی اگر چھڑ جائے، تو
وہ بلند افلاک کی مانند ہو، پستی میں خاک
ذکر تمکیں ہو تو مثل سرو سر افراز وہ
پستیوں میں بار سے جیسے جھکی ہو شاخ تاک
چہرہ تازہ باغ میں جیسے شگفتہ پھول ہو
بلبل شوریدہ کے دل میں ہو اس چہرے کی دھاک
سن کے میں خوشحال حیراں ہوں ترا حسن سخن
لائی یہ ادراک آخر کس فلک سے تیری خاک

(ترجمہ: خاطر غزنوی)

قدیم پشتو شاعری کے حوالے سے خوشحال خان خٹک کے بعد اس کے بڑے بیٹے اشرف خان ہجری (1044ھ۔1106ھ) کا نام آتا ہے جنہیں ''زنجیروں کا شاعر'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بھی خان بابا کی طرح صاحب سیف وقلم تھے۔ انہوں نے اپنی قیمتی زندگی کے 14 سال بیجاپور دکن میں مغلوں کی قید میں گزارے۔ اسیری کے دوران ان کی تخلیق کردہ شاعری ''حبسیاتی ادب'' کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ سادہ اور عام فہم ہے، تاہم بعض جگہوں پر عربی اور فارسی الفاظ کے استعمال کی وجہ سے مفاہیم سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ان کی شاعری میں عشق ومحبت، ہجر، غریب الوطنی کے جذبات اور اخلاقی مضامین کے علاوہ اپنے وطن کے ساتھ شدید محبت کے احساسات بھی ملتے ہیں:

ما هلہ ماتم دَ زان وکڑہ پہ وینو

چہ اٹک وتہ مے شاکڑہ پہ ژڑا شوم

اوس بہ سہ د وطن کانڑی بوٹی ژاڑم

د رخصت سلام مے وکڑو ترے جدا شوم

ترجمہ:"جب اٹک کی طرف میری پشت ہوگئی (یعنی جب مغل مجھے گرفتار کرکے اٹک سے لے جا رہے تھے) تو میں نے خون کے آنسو بہائے اور اپنی جان کا ماتم کیا۔ اب میں وطن کے پودوں اور پتھروں کے لئے کیوں روؤں۔ میں تو ان سے جدا ہوتے وقت انہیں الوداعی سلام کہہ چکا ہوں۔"

شاعری کی دنیا میں اشرف خان ہجری کے علاوہ خوشحال خان خٹک کے کئی اور بیٹوں اور نواسوں نے بھی بڑا نام کمایا۔ بیٹوں میں عبدالقادر خان خٹک، سکندر خان خٹک، صدر خان خٹک، عابد خان خٹک اور گوہر خان خٹک وغیرہ کے نام شامل ہیں جبکہ نواسوں میں کاظم خان شیدا نے نازک خیالی اور باریک بینی میں مثال قائم کی۔

خوشحال خان خٹک کے بعد اسی دور کا سب سے بڑا نام عبدالرحمٰن بابا کا ہے، جنہیں شاعر کے علاوہ ایک برگزیدہ شخصیت اور ولی اللہ سمجھا جاتا ہے اور ان کے کلام کو تقدس کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ رحمان بابا مہمند قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ خوشحال خان خٹک کی اولاد کے ہم عصر تھے۔ پنجابی ادب میں جو مقام بابا بلھے شاہ اور سندھی ادب میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کو حاصل ہے، وہی مقام پشتو میں رحمان بابا کو حاصل ہے۔ ان کا کلام زبان کی سلاست اور بیان کی شیرینی کا مظہر ہے۔ پشتون سوسائٹی میں ان کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے دیوان کو جو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوئی۔

خوشحالا او دولتا مے غلامان دی

زۀ رحمان پہ پشتو جبہ عالمگیر یم

ترجمہ: خوشحال خان اور دولت (لوانڑے) میرے غلام ہیں۔ میں رحمان پشتو زبان میں عالمگیر ہوں۔

ان کے اشعار داخلی سوز و گداز کی وجہ سے ہر دل کی آواز بن چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں تصوّف کے ساتھ ساتھ عشقیہ اور اخلاقی موضوعات کا ایک بڑا حصہ موجود ہے، جس میں وہی فضا ملتی ہے، جو حافظ شیرازی کی فارسی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے صوفیانہ مضامین، عام فہمی اور گہرائی دونوں پہلوؤں پر محیط ہیں۔ وہ ایک شاعرِ انسانیت، ہمہ جہت

غزل

صدائے کبک گر ہوتی نہ غماز
اچک سکتا اسے ہرگز نہ شہباز
ہوا ثابت کہ اس دور جہاں میں
ہراک شے ہوتی ہے خود اپنی غماز
ذرا منصور کا انجام دیکھو
نہ ہو افشا کسی انسان کا راز
اگر فرزند ہو ے خوار ہمدم!
تو گھر والد کا ہو جاتا ہے بے ساز
بھلا ہوتا، اگر محسوس کرتے!
ہم اس انجام کو ہنگام آغاز
نہیں ہو سکتا منکر، کوئی ''رحمان''
ترے شعروں میں ہے کچھ ایسا اعجاز

(ترجمہ:فارغ ورضا)

پشتو غزل

ہر مطرب چے غوگے تاؤ کا دَ رباب
پہ دا تاؤ کے زما زڑہ کاندی کباب
چے سامع ئے پہ نغمہ پہ ترانہ شم
دیوانہ شم گریوان سیرے مست خراب
ہم ئے تار ہم ئے گفتار ھسے اثر کا
چے ھیس سوک ئے نہ طاقت لری نہ تاب
یوئے ساز بل ئے اواز وی دَ لحتیو

دریم شعر پر آغاز کا انتخاب

سلورم ئے یو ساقی دَ سنگہ کینی

چے مخے ئے نہ آفتاب وی نہ مہتاب

دا سلور واڑہ فتنے پہ سلور گُنجہ

او پینزمہ صراحی د میوناب

شپگم وقت د نوبھار او دَ زوانیہ

اووم شغل دَ بیاض او دَ کتاب

چے دا ہومرہ آفتونہ سرہ ٹول شی

تروسوک سئہ رنگ زِنے کاندی اجتناب

چے دا ھسے دلبران پر اثر نہ کا

یا بہ دیو یا بہ دیوار وی یا دواب

مرد ھغہ چے تَر سود تیر شی ثواب وَکا

نہ ھغہ چے ڈیرئے سود وی لگ ثواب

اردو منظوم ترجمہ

جو بزمِ عشق میں مُطرب کوئی اُٹھائے رباب

وہ میرے دل پہ سجیلے سروں کا لائے عذاب

سنوں جو گوشِ حقیقت سے میں ترانۂ شوق

جنونِ عشق بناتا ہے مجھ کو مست و خراب

کرے جو تار بھی گفتار دل لرزنے لگے

کہاں کا صبر وسکوں اور کہاں کی طاقت وتاب

زہے نصیب جمال و کمالِ نغمہ و ساز

ہر ایک سانس ہو ہر دل کے واسطے مضراب

اور ایسی بزم میں مینا بدوش ہو ساقی
کچھ آفتاب کہیں اس کو اور کچھ مہتاب
ادائے گل بدنی ہو صدائے ہم سخنی
اور انجمن میں رواں ہو صراحیِ مئے ناب
سوادِ فصلِ بہاراں بھی ہو جوانی پر
کوئی کتاب میں گم ہو کوئی رَہینِ رباب
جہاں لگا ہو یہ رنگیں قیامتوں کا ہجوم
نہ اجتناب کا یارا وہاں نہ صبر کی تاب
جو بزمِ گل سُخناں مہہ رُخاں میں رہ کر بھی
اثر پذیر نہ ہو آدمی ہے وہ برفاب
جو کارِ خیر ہو اپنے مفاد کی خاطر
اگرچہ نیک عمل ہے مگر نہیں ہے ثواب

(ترجمہ: پروفیسر محمد طٰہٰ خان)

متفرق اشعار

1. سخاوت سے خزانوں میں کمی آتی نہیں ہرگز
نکالو جس قدر دریا کا پانی اور بڑھتا ہے
2. خالی شکم پہ کی جو قناعت رباب نے
نغمات دل پذیر عطا ہو گئے اسے
3. نااہل سے وفا کی تمنا نہ رکھ کبھی
گنے کا رس نصیب کہاں خشک بانس کو

4 شکستہ کھنڈر دیکھ کر منہ نہ پھیرو
یہ ویرانیاں کل کی آبادیاں تھیں

5 کہو تم نے کہیں وہ مہر عالم تاب دیکھا ہے
کہ جو رکھتا ہو قد بھی زلف بھی لبہائے لعلیں بھی

6 پڑے زلف سیہ کا جس پہ سایہ
نہیں کرتا تمنا وہ ھما کی

7 ہماری زیست کے مرکب کی باگ ہے نہ رکاب
سوار عمر گرے گا یہاں کہیں نہ کہیں

8 یہ سنا تھا ظلمتوں میں ہے مقام آب حیواں
مجھے مل گیا یہ تحفہ ترے حسن کی ضیاء میں

9 زلف اور رخسار تیرے مہ جبیں
ہیں یہی شام و سحر میرے لئے

10 ترے شہیدوں ہی کی خاک میں ہے یہ تاثیر
ہر ایک مٹی سے لالہ اُگا نہیں کرتا

11 کبھی ہے مجھ پہ کبھی التفات غیروں پر
کہ خوب و زشت برابر ہیں ابر باراں کو

12 ایک دن ڈوبے گی آخر موت کے سیلاب میں
کاغذی کشتی پہ کر لو سیر دنیا چند روز

13 زندگی بے لگام مرکب ہے
اور انسان ایک خفتہ سوار

14 ماہی کی ساری عمر سمندر میں کٹ گئی
پر بے خبر ہے موج کی فطرت سے آج تک

15 جو مجھ کو تیری محبت سے باز رکھتے ہیں
وہ تیری چاہ میں مجھ سے ہیں دو قدم آگے
16 دست رنگیں کسی کا اے ''رحمان''
سرخ پھولوں کی شاخ ہے گویا

(ترجمہ: فارغ بخاری/رضا ہمدانی)

اس دور کا ایک اور اہم شاعر، جو رحمان بابا کا ہم قبیلہ اور ہم علاقہ تھا، عبدالحمید مومند (1075ھ-1155ھ کے بعد) ہے- اس کی شاعری اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔ وہ پشتو ادب میں ایک الگ سبک (مکتب) کا پیش رو ہے جو نازک خیالی اور باریک بینی کا سبک کہلاتا ہے۔ حمید بابا کی شاعری میں نازک خیالی، مضمون آفرینی، نادر تشبیہات اور استعارات کا بے بہا خزانہ پایا جاتا ہے۔ پشتو میں ان کے اشعار کا دیوان ''درومرجان'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے، شاہ وگدا اور نیرنگ عشق، نام کی دو مثنویاں بھی فارسی زبان سے پشتو میں ترجمہ کیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

مڑا وے رنگ زما پوختہ لہ مڑاوسترگو — داچے وی خبردارے د خوار پہ خوار
سرہ لمبہ شو لالہ زار زمالہ آھہ — د زڑہٗ سووپہ زڑہٗ سو زڑہ سوے کیگی
ھسے پٹ مہر پہ قھر کے کڑی ښکلے — لکہ سوک چے کفرستان کے دینداری کڑی
بیابہ نہ موے بوسہ لہ خوگو شو نڈ و — سو دے زڑہٗ پہ شان د پانو پُرخون نشی

ترجمہ: 1۔ میرا مرجھایا ہوا رنگ اپنی مرجھائی ہوئی آنکھوں سے پوچھ، کیونکہ خوار لوگ خوار لوگوں کی صورت حال سے ہی آگاہی رکھتے ہیں۔

2۔ لالہُ زار میری آہ سے شعلہ زار بن گیا ہے، کیونکہ دل جلوں کا دل جلوں پر ہی دل جلتا ہے۔

3۔ حسین لوگ قہر میں مہر پوشیدہ طور پر اس طرح کرتے ہیں جیسے کفرستان میں کوئی دینداری کرتا ہے۔

4۔ آپ تب تک شکر کا بوسہ نہیں پا سکتے، جب تک آپ کا دل پان کی طرح پُرخون نہ ہو جائے۔

حمید بابا کے بعد کاظم خان شیدا (وفات 1194ھ) پشتو کی قدیم شاعری میں ''ہندی سبک'' کا ایک مکمل نمائندہ شاعر ہے، جو افضل خان خٹک کا بیٹا اور اشرف خان کا پوتا اور خوشحال خان خٹک کا پرپوتا تھا۔ وہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح عالم وفاضل شخص تھا۔ ادبیات سرحد کے مصنف اس کے مکتبہ فکر اور فنِ سخن کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"پشتو ادب میں حمید بابا نے جس مکتبہء فکر کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔..... شیدا نے اس قصر کے نقش و نگار کو اچھوتے اور شوخ رنگوں سے ابھارا۔ اس طرح شیدا، خوشحال خان کے گھرانے سے ہوتے ہوئے بھی حمید بابا کے مکتبہء خیال کا ایک ممتاز فرد، ماہر صناع اور اسی طرز کا دلدادہ نکلا بلکہ بعض خصوصیات میں تو اس نے اس ماحول میں اپنے لئے ایک خاص مقام پیدا کیا۔ شیدا کے ہاں لفظی مصوری اپنے عروج پر ہے۔ تصویر کے خطوط کی دلکشی و تناسب، رنگوں کا امتزاج اور دیدہ زیبی، پس منظر کا حسن اور مواد کا انتخاب ان سب نے مل کر شیدا کے کلام میں یونانی مصوری جیسی عظمت پیدا کر دی ہے" (ح-3)

اس نے اپنے فن کے ذریعے پشتو غزل کو لطافت اور نازک خیالی کی معراج تک پہنچایا۔ اس نے اپنی شاعری میں دوسری زبانوں کی اصطلاحات و تراکیب اور مشکل الفاظ استعمال کئے، جس کی وجہ سے اس کے کلام کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، تاہم اس کی غزلوں کا مطالعہ یہ پتہ دیتا ہے کہ اس نے یہ اصطلاحات اپنے معنوں سے بھی زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال کی ہیں۔ شیدا کے چند اشعار مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

سہ حاصل دمسکانو لہ دولتہ
داشعار بحر وی تل بے تراونہ
سر گردان کاندی گرداب خلاف د بحر
پیروی دہ دکلان بے مضرتہ
دمرآت غوندے جوہر پہ ایرو ورکا
کلہ فعل د صاف دل وی بے حکمتہ
ھمیشہ وی نرم چوب غذا د کرم
شیدا مہ شہ مرد خالی لہ سیاستہ

ترجمہ: 1۔ کنجوسوں کی دولت کا کیا فائدہ، اشعار کے سمندر میں تراوت نہیں ہوتی۔
2۔ بحر کی مخالفت نے بھنور کو سر گردان کر رکھا ہے، بڑوں کی پیروی بے مضرت ہوتی ہے۔
3۔ آئینے کو جوہر، راکھ سے دیتے ہیں، صاف دلوں کا فعل حکمت سے کب خالی ہوتا ہے۔

4۔نرم لکڑی ہمیشہ کیڑوں کی غذا ہوتی ہے، شیدا آدمی کو کبھی سیاست سے خالی نہیں ہونا چاہئے۔

قدیم پشتو شاعری کے اس تیسرے دور کا ایک اور نمائندہ شاعر علی خان ہے۔ وہ غزل کے فن کا استاد ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں خالص پشتو اصطلاحات استعمال کی ہیں اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔ فنی لحاظ سے علی خان کی غزل پر کامگار خٹک اور کاظم خان شیدا کا رنگ غالب ہے۔ علی خان اور اس کے ہم عصروں کے بعد پشتو شاعری ایک نئے پیغام، نئے انقلاب اور نئے اسلوب کے انتظار میں ایک جگہ رکی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے دو اشعار کا منظوم اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

کتنے آوارہ گرد ہیں آنسو !!
اب ٹھہرتے نہیں ہیں دامن میں
ماہ و پروین و کہکشاں ہیں کہاں
بات جو ہے حسین دلہن میں

اس سبک کے مشہور پیروکاروں میں پیر محمد کاکڑ، میرزا حنان، قلندر، عبداللہ محزون، کامگار خان خٹک اور محمدی صاحبزادہ شامل ہیں۔

قدیم پشتو شاعری کے اس دور کو پشتو ادب کا ''عہد زریں'' کہا جاتا ہے کیونکہ اس دور میں خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا جیسے عظیم المرتبت شعراء اور نابغہ روزگار شخصیات پیدا ہوئیں۔ اس لئے اس دور کی شاعری موضوع اور فنی تنوع کے اعتبار سے عروج پر ہے۔ پشتو ادب اور پشتو شاعری کا یہ سنہرا دور خوشحال خان خٹک' اس کی اولاد اور اس کے ہم عصروں سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے متعلق ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک لکھتے ہیں کہ'' یہ وہ دور ہے کہ جس میں نہ صرف پشتو ادب اور شاعری تکمیل تک پہنچی بلکہ پشتون ثقافت کے خدوخال کی تصویر کی ہر لکیر نمودار ہوئی اور تہذیب کا مکمل چہرہ نظر آیا''۔(ح-4)

مختصر یہ کہ قدیم پشتو شاعری کا یہ تیسرا دور پچھلے ادوار کے مقابلے میں موضوعات کے تنوع، صنائع بدائع کے استعمال، اصناف سخن کی فراوانی، مضمون آفرینی، فنی اور فکری پختگی غرض ہر لحاظ سے مالا مال اور غنی ہے۔ حقیقت پسندی، رندی و مستی، فلسفہ، فطری شاعری اور تصوف اس دور کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس دور میں تین مکتبہ ہائے فکر و فن نظر آتے ہیں، جن میں خوشحال کا مکتب، رحمان بابا کا مکتب، حمید کا مکتب اور سبک ہندی شامل ہیں۔

2۔ لوک شاعری

اگر کسی قوم کے مجموعی مزاج کا اندازہ لگانا ہوتو اس کے لوک گیتوں سے لگایا جاسکتا ہے کہ قومی جذبات لوک گیت میں کھل کر سامنے آتے ہیں۔ لوک گیت تصنع اور تکلف سے پاک ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقت پسندی اور بے ساختگی ہوتی ہے اور یہ کسی خاص طبقے کی ترجمانی کے بجائے عام لوگوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لوک گیت کروڑوں لوگوں کی عادتوں، رسموں، عقیدوں، اندازفکر، طرز معاشرت اور روحانی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ پشتو میں وہ تمام اصناف سخن رائج ہیں جو اردو، فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں میں رائج ہیں، لیکن پشتو لوک گیتوں کا سرمایہ معیار ومقدار دونوں کے لحاظ سے زیادہ قدر و قیمت کا حامل ہے۔ یوں تو ہر علاقے میں اپنے اپنے لوک گیت ہوتے ہیں مگر پشتو میں کچھ لوک گیت ایسے بھی ہیں جو تمام پشتونوں کا مشترکہ ورثہ ہیں۔ ان میں لنڈئی، چاربیتہ، نیمہ کئی، بگتئی، بدلہ، لوبہ اور اللہ ہو شامل ہیں۔ ان تمام اقسام کے گیتوں میں کچھ مشترکہ پہلو بھی ہیں اور تکنیک کے لحاظ سے ان میں کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ لوک شاعری کی ان معروف اصناف میں سے چند کی فرداً فرداً تفصیلات یوں ہیں:

2.1۔ ٹپہ

ٹپہ پشتو لوک شاعری کی معروف اور قدیم صنف ہے۔ اسے لنڈئ اور مصرعہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا مصرعہ نو سیلابوں اور دوسرا تیرہ سیلابوں کا ہوتا ہے۔ اس قدیم صنف سخن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پشتون تہذیب وتمدن، ثقافت، مذہب، روحانیت، دستور، اقدار و روایت اور تاریخ کے سارے مظاہر جلوہ گر ہوتے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی اس صنف ادب میں مذہبی، معاشرتی، رزمیہ، عشقیہ اور المیہ موضوعات کے علاوہ معاشرتی زندگی سے متعلق تمام پہلوؤں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ اس منفرد صنف کو جو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی وہ پشتو لوک شاعری کی کسی اور صنف کے حصے میں نہیں آئی۔ ٹپے عمومی طور پر دائیں کان پر دایاں ہاتھ رکھ کر ''یہ قربان''، ''یہ درزارشمہ'' اور ''یہ کہ زار'' کی لمبی تان الاپ کر گائے جاتے ہیں۔ مختلف موضوعات سے متعلق دو ٹپے دیکھیے:

زان ئے زڑو جامو کے جوڑ کڑو
لکہ پہ وران کلی کے باغ دگلو وینہ

کہ د وطن پہ ننگ شھید شوے
پہ تار د زلفو بہ کفن درتہ گنڈمہ

ترجمہ: 1۔ میری محبوبہ نے اپنے پرانے کپڑوں میں خود کو آراستہ کر رکھا ہے۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے کسی ویران گاؤں میں پھولوں کا باغ ہو۔

2۔ اگر تو وطن کی خاطر شہید ہو جائے تو میں زلفوں کی تار سے تمہارا کفن سیوں گی۔

ٹپے کے حوالے سے پشتو زبان کافی ثروت مند ہے اور اس میں ہزاروں کی تعداد میں ٹپے موجود ہیں۔ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کی طرف سے چھتیس ہزار پشتو ٹپے دو ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

2.2۔ چاربیتہ

چاربیتہ بھی لوک شاعری کی ایک معروف صنف ہے۔ یہ عموماً مرد حضرات گاتے ہیں۔ عوامی صنف ہونے کے ناطے چاربیتہ بھی سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ فرانسیسی مستشرق جیمز ڈارمسٹیٹر کے مطابق چاربیتے پشتونوں کی تحریر شدہ تاریخ ہے، جن میں ان کی لڑائیوں اور اسلامی جنگوں کی روداد کو محفوظ کیا گیا ہے۔ فنی اعتبار سے اس میں پہلے ایک مطلع ہوتا ہے جو دو یا دو سے زیادہ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے بعد بند شروع ہوتا ہے۔ بند کے مصرعوں کی تعداد متعین نہیں ہے۔ بالعموم چار سے لے کر بارہ مصرعوں کا ایک بند ہوتا ہے، لیکن اکثر بند آٹھ مصرعوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ چاربیتہ کئی بندوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بند جب ختم ہوتا ہے تو اس کے اختتام پر مطلع دہرایا جاتا ہے۔ ہر بند کے تمام مصرعے مطلع کے مصرعوں کے ہم وزن ہوتے ہیں۔ پشتو میں ہیئت کے اعتبار سے چاربیتہ کی کئی اقسام درج ہیں اور ان کے بندوں کا معاملہ بھی چاربیتہ کی قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ طویل نظم سے مشابہ ہوتا ہے اور مکالمے کی صورت یا دوگانے کی طرز پر لکھا جاتا ہے:

مرد:

گڈریا بن کے تری بکریاں چرالوں گا
میں تجھ سے ملنے کی تدبیریں نکالوں گا
ترے بغیر سسکتی ہے زندگی میری
ترے بغیر فراواں ہے بیکلی میری
ترے بغیر تڑپتی ہے روح بھی میری
میں تیرے واسطے ہر اک ستم اُٹھالوں گا
گڈریا بن کے تری بکریاں چرالوں گا

عورت:

ملک کی بیٹی ہوں میں، تو کسان بیچارا
یہ میرا حسن ہے دہکا ہوا سا انگارا
چمک دمک سے سمجھتا ہے تو جسے تارا
تو سوچتا ہے اسے آنکھ میں چھپا لوں گا
گڈریا بن کے تری بکریاں چرا لوں گا

مرد:

ڈرا نہ مجھ کو کہ عزم و عمل کی جان ہوں میں
غریب ہوں پہ زر و سیم سے گراں ہوں میں
نحیف ہوں پہ حمیت میں اک چٹان ہوں میں
ہر ایک حیلے سے تیرا سراغ پا لوں گا
گڈریا بن کے تری بکریاں چرا لوں گا

عورت:

سنا کے حجرے میں میرے جنوں کے افسانے
خدارا یوں مجھے بدنام کر نہ دیوانے
ہر اک سے کہتا ہے مارا ہے مجھ کو لیلیٰ نے
ملی نہ وہ تو عدم کا میں راستہ لوں گا
گڈریا بن کے تری بکریاں چرا لوں گا

(ترجمہ: فارغ بخاری و رضا ہمدانی)

2.3- بگتئی

یہ صنف سخن بلوچستان اور سرحد کے جنوبی اضلاع میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ گانے کے وقت اس کے ساتھ رقص بھی کیا جاتا ہے۔ اس میں عموماً عشقیہ مضامین پورے جوش اور ولولہ کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ فنی اور تکنیکی اعتبار

سے بگتئی کا آغاز ایک شعر سے ہوتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں جو سر کہلاتا ہے۔ سر کے بعد بند شروع ہوتا ہے۔ گتئی کئی بندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے ہر بند میں چار مصرعے ہوتے ہیں اور ہر بند کا آخری مصرعہ سر کا ہم قافیہ ہوتا ہے جس کے ساتھ سر دہرایا جاتا ہے۔

2.4۔ بیمہ کئی

یہ بالخصوص عورتوں کی صنف سخن سمجھی جاتی ہے، جو اسے عموماً شادی بیاہ کے موقع پر گاتی ہیں۔ اس میں زیادہ تر ٹپے گائے جاتے ہیں، جن میں رزمیہ، بزمیہ، عشقیہ، طربیہ اور المیہ جیسے موضوعات سمائے ہوئے ملتے ہیں۔ فنی اور ساخت کے اعتبار سے اس کی ترتیب یوں ہوتی ہے کہ شروع میں ٹپے کا پہلا مصرعہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا مصرعہ لگایا جاتا ہے۔ اس چھوٹے مصرعے کے بعد ٹپے کا دوسرا مصرعہ ہوتا ہے اور اس مصرعے کے بعد وہی چھوٹا مصرعہ دہرایا جاتا ہے۔ یہ مختلف مواقع پر کورس کی شکل میں گائی جاتی ہے۔ مثلاً :

زما زړ ګے کوی درد ونه	میرے دل میں درد ہے
خیر خورے ولے؟	کیوں بہن کیا ہوا؟
دَ آشنا غم راباندے زیات دے مړه به شمه	محبوب کا غم بڑھ گیا ہے مر جاؤں گی
خیر خورے ولے؟	کیوں بہن خیر تو ہے؟
ته به بستر کوے خوبونه	تم بستر پر نیند کے مزے لوٹتے ہو
خیر خورے ولے؟	کیوں بہن کیا ہوا؟
ځما په مخ کے اوښکے لارے جوړه وینه	میرے چہرے پر آنسوؤں نے راستے بنالئے ہیں
خیر خورے ولے؟	کیوں بہن کیا ہوا؟
ستا په فرقت مِ زړه قلم شو	تیری فرقت نے دل میں شگاف ڈال دیئے ہیں
خیر خورے ولے؟	کیوں بہن کیا ہوا؟
لکه لوئے غر چه زلزلے چولے وینه	جیسے عظیم پہاڑوں میں زلزلے دراڑیں ڈال دیتے ہیں
خیر خورے ولے؟	کیوں بہن کیا ہوا؟
چه اول مرګ وے بیا ژوندون وے	کاش موت کے بعد ایک دفعہ پھر زندگی ملتی

خیر خورے وے؟ کیوں بہن کیا ہوا؟
چہ راتہ معلوم وے د پردو خپلو نیتونہ تا کہ اپنے بیگانوں کی نیت کا پتہ چل جاتا
خیر خورے وے کیوں بہن کیا ہوا؟

(پشتو لوک گیت)

2.5- لوبہ

لوبہ بھی لوک شاعری کی ایک معروف صنف سخن ہے۔ لوبے دوگانے کی صورت میں بھی گائے جاتے ہیں اور انفرادی طور پر بھی۔ اس کا وزن خالص مقامی موسیقی پر قائم ہے۔ اس میں بالعموم عشق و محبت کے مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ کئی بندوں پر مشتمل ہوتا ہے جس کا آغاز ''سَر'' سے ہوتا ہے، جو دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، جس کا پہلا مصرعہ قدرے طویل اور دوسرا مصرعہ چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دو یا دو سے زیادہ مصرعے ہوتے ہیں۔ ہر بند کے آخر میں سر دہرایا جاتا ہے۔ تاہم فنی لحاظ سے سارے لوبے اسی ایک طرز پر نہیں ہوتے۔ نمونہ دیکھیے:

خمارے سترگے چہ راواڑوی صنم
زڑۂ مے شی قلم قلم
پہ دنیا کے رب پیدا کڑے مہ جبینے
زہ دے یار یم پہ ریختینے
راشہ راشہ پہ لیمومے گدہ قدم

ترجمہ: محبوب جب خماری آنکھیں میری طرف پھیر لیتا ہے
تو میرا دل پارہ پارہ ہوتا ہے
جب خدا نے تمہیں دنیا میں پیدا کیا
میں تمہارا سچا عاشق ہوں
آؤ میری پلکوں پہ قدم رکھو

پہ سپین مخ کے دخالونہ زرزری دی

سرۂ لبان دِ آناری دی

ما پرے ایخے سرو مال دی مقدم

ترجمہ: تیرے سفید مکھڑے پہ زرین خال (تل) ہیں

تیرے سرخ ہونٹ انار کی مانند ہیں

میں نے سرومال اس پر قربان کرنے کے لئے بڑھایا ہے۔

زۂ پہ تاباندے مئین یم تل مدام

سروے قدے، گل اندام

دغم اوخکے مے پہ مخ زی دم پہ دم

ترجمہ: میں ہمیشہ تمہارا عاشق ہوں

اے سروقد، گل اندام

غم کے آنسو ہر وقت بہاتا ہوں

خوب خنداپہ ځان حرام کڑہ توکلہ

ځان دمہ کڑہ بے عملہ

سوال قبلیگی پہ وخت د صبحدم

ترجمہ: توکل! اپنے اوپر ہنسی اور نیند حرام کرلے

اپنے آپ کو بے عمل نہ بنا

صبح کے وقت دعا قبول ہوتی ہے

(پشتو لوک گیت)

2.6۔ بدلہ (داستان)

بدلہ مثنوی کے طرز پر لکھا جاتا ہے اس میں رومانی، تاریخی اور رزمیہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ آدم خان درخانی، مومن خان شیرینی، فتح خان رابیا، جلاتے محبوبہ وغیرہ پشتو ادب کی مشہور داستانیں ہیں، مگر اسے بدلہ خاص طور پر اس وقت کہا جاتا ہے، جب اسے ساز اور سر کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے سندرہ (گیت) بھی کہا جاتا ہے۔

2.7۔ اللہ ہو

پشتو زبان میں اللہ ہو لوری کا مترادف ہے۔ پشتو اللہ ہو کے بارے میں فارغ بخاری لکھتے ہیں:

''پشتو اللہ ہو کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بچے کو بلی کتے یا ھوّ ے سے ڈرانے کے بجائے بہادری، اولوالعزمی اور غیرت وحمیت کا درس دیا جاتا ہے جو آئندہ زندگی میں بچے کے لیے حرز جان بن جاتا ہے اس میں اسلاف کے اولوالعزمانہ کارنامے، جنگ کی کہانیاں، حب الوطنی اور سخت کوشی کا درس ملتا ہے یا ماں اپنے جذبات پیش کرتی ہے، دشمنوں کو کوستی ہے۔ بچے کو بڑا ہو کر دشمنوں سے انتقام لینے کی تلقین کرتی ہے اور آنے والی عمر میں اسے دکھوں اور مصائب سے آگاہ کرتی ہے۔''

نمونے کا منظوم اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

مری جاں چین سے جھولے میں سو جا
حسیں خوابوں کے نظاروں میں کھو جا
گیا ہے باپ تیرا جنگ کرنے
وطن کی آن پر جاں سے گزرنے
کیا حملہ فرنگی فتنہ گر نے
مری جاں چین سے جھولے میں سو جا
حسیں خوابوں کے نظاروں میں کھو جا
گیا ہے باپ تیرا جنگ کرنے
نہیں آتا جہاں سے کوئی جا کر
ہیں بے پایاں حریفوں کے عسا کر
مری جا چین سے جھولے میں سو جا
حسیں خوابوں کے نظاروں میں کھو جا
ادھر غم زاد بھائی بھی ہیں ناری
چلا بس تو کریں گے وار کاری
جگر کا خون ہے آنکھوں سے جاری

مری جا چین سے جھولے میں سو جا
حسیں خوابوں کے نظاروں میں کھو جا

(ترجمہ: فارغ بخاری)

3۔ خود آزمائی

1۔ قدیم شاعری کے پہلے دور میں جو فارسی اصناف سخن پشتو شاعری میں متعارف ہوئیں ان کے بارے میں وضاحت سے لکھیں۔

2۔ روشنیہ مکتبہ فکر کے شعراء کی شاعری خالص صوفیانہ فلسفے سے بھری پڑی ہے۔ مدلل بحث کریں۔

3۔ قدیم پشتو شاعری کا تیسرا دور ''زریں دور'' کہلاتا ہے۔ کیوں؟

4۔ خوشحال خان خٹک کے عہد کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں، اسے مفصل بیان کیجئے۔

5۔ کیا رحمان بابا صوفی شاعر تھے؟ کلام کے حوالے سے وضاحت کریں۔

6۔ قدیم پشتو شاعری کی تاریخ اس طرح بیان کریں کہ اس میں تمام ادوار کا تذکرہ ہو جائے۔

7۔ پشتو لوک شاعری کی مختلف اصناف پر روشنی ڈالیں۔

☆ حوالہ جات

(ح۔1)= پریشان خٹک، پشتو شاعری (مقدمہ)، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، 1987ء، ص 65

(ح۔2)= دوست محمد خان کامل، کلیات خوشحال خان خٹک، پشاور، ادارہ اشاعت سرحد، 1952ء، ص اط۔ای

(ح۔3)= رضا ہمدانی، ادبیات سرحد، ص 287

(ح۔4)= راج ولی شاہ خٹک، ڈاکٹر، دپختو ادبی تحریکونہ، پشاور، پشتو اکیڈمی، 1989ء، ص 154
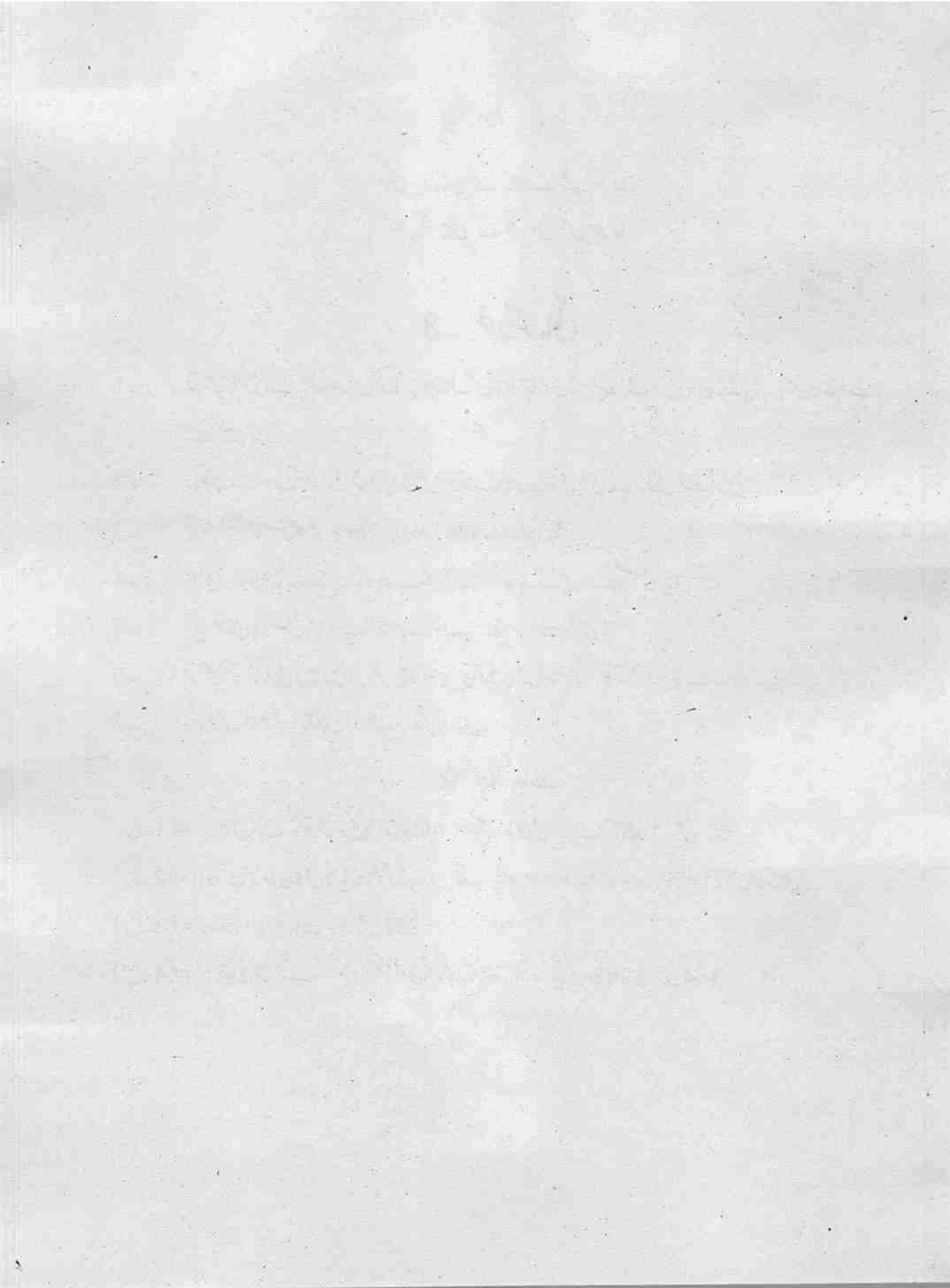
یونٹ نمبر 3

قدیم نثری ادب
(پشتو)

تحریر : عبداللہ جان عابد
نظرثانی : ڈاکٹر پرویز مہجور خویشکی

فہرست
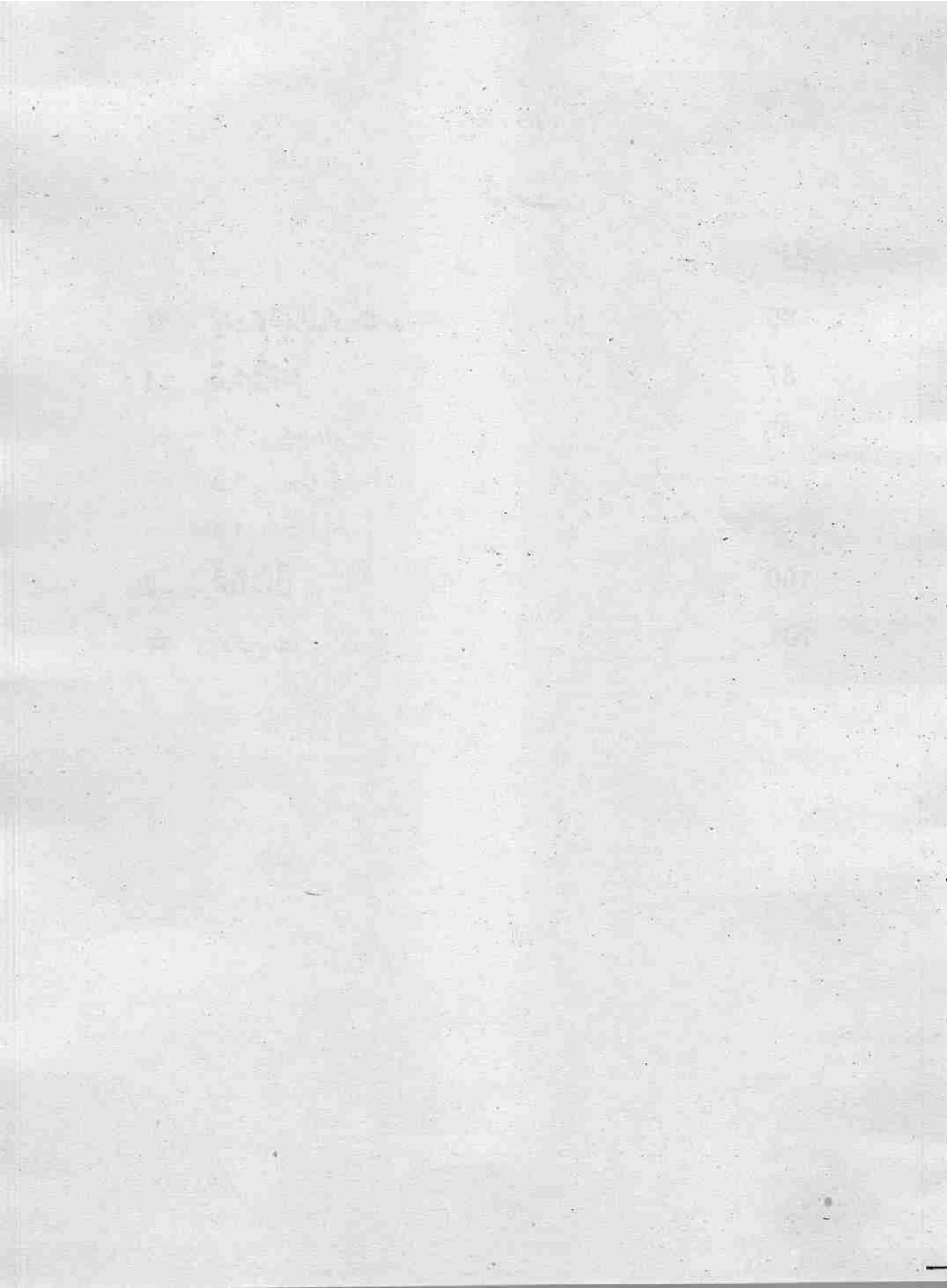
یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات

اس یونٹ میں آپ قدیم پشتو نثری ادب کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کریں گے۔قدیم پشتو شاعری کی طرح قدیم پشتو نثری ادب بھی تین ادوار پر مشتمل ہے۔ان تین ادوار میں پشتو نثر کا انداز اور معیار ایک دوسرے سے مختلف ہے، پہلے دور کی نثر آسان اور عام فہم، دوسرے دور کی نثر مسجع و مقفٰی اور تیسرے دور کی نثر کو مسجع' موزوں اور معاصر نثر کے درمیان ایک پل تصور کیا جاتا ہے۔اس یونٹ اور مجوزہ کتب کے تفصیلی مطالعے کے بعد ان مختلف ادوار میں قدیم پشتو نثر میں رونما ہونے والی مذکورہ بالا تبدیلیاں آپ پر واضح ہو جائیں گی۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1۔ پشتو کے قدیم نثری ادب کے اسلوب کے بارے میں مکمل شعور حاصل کر سکیں۔
2۔ مسجع اور مقفٰی نثر کے بارے میں جان سکیں اور ان کے نمونے ملاحظہ کر سکیں۔
3۔ قدیم پشتو نثری ادب کے مختلف ادوار کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں اور ان کا تقابلی جائزہ پیش کر سکیں۔
4۔ اردو تراجم کے ذریعے قدیم پشتو نثر کے چند نمونوں کا مطالعہ کر کے ان کے موضوعات اور ان کی خصوصیات جان سکیں۔
5۔ قدیم دور کے حوالے سے پشتو کے اہم نثر نگاروں کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔
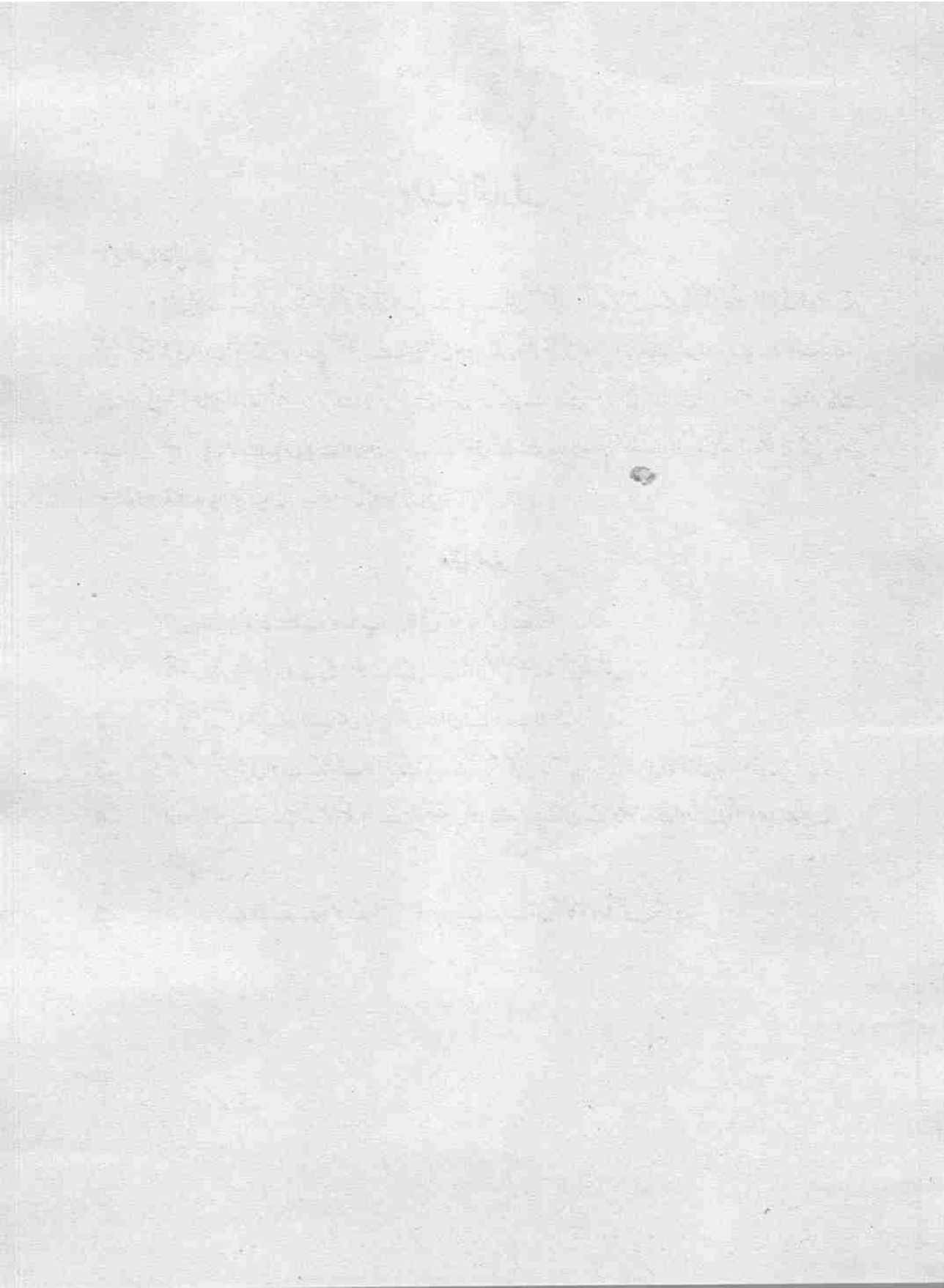
1۔قدیم پشتو نثر

قدیم پشتو شاعری کی طرح قدیم نثری ادب بھی تین ادوار پر مشتمل ہے اور ہر دور کی نثر کی خصوصیات اور اسلوب ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ذیل میں تینوں ادوار کی نثر کا مختصر تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

1.1 ۔ پہلا دور

قدیم پشتو نثر کا آغاز ''پٹہ خزانہ'' (گنج مخفی) کی روایت کے مطابق محمد ابو ہاشم سروانی (223ھ-297ھ) نے کیا، جن کی کتاب کا نام ''دسالووگمہ'' (نسیم صحرا) ہے۔ یہ کتاب خلیل بن احمد کی عربی کتاب کا ترجمہ ہے، جس میں عربی اشعار اور فصاحت و بلاغت پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ پشتو نثر کی اولین کتاب شمار ہوتی ہے مگر اس کی حقیقت صرف نام تک محدود ہے۔

اس کے بعد پشتو نثری ادب کی دوسری کتاب ''تذکرۃ الاولیاء'' ہے جو سلیمان ماکو نے 612ھ میں لکھی ، اس میں ان اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کے حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں، جو پشتو کے اس اولین دور کے شاعر بھی ہیں، مگر اس وقت اس کتاب کے صرف سات صفحات موجود ہیں۔ یہ صفحات قندھار میں پروفیسر عبدالحئی حبیبی نے دریافت کئے اور پہلی مرتبہ ''سالنامہ کابل'' 1319ھ ش/ 1940ء میں، دوسری مرتبہ ''پختانہ شعرا'' (پشتون شعراء، جلد اول) میں اور تیسری بار ایک مستقل کتابچے کی شکل میں شائع کئے۔ اس کی نثر سادہ اور رواں ہے، تاہم اس پر فارسی کے علاوہ عربی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ ہر چند کہ یہ مسجع اور مقفٰی اثر سے آزاد ہے، تاہم کہیں کہیں جملوں میں ترنم پیدا کرنے کے لئے اس سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کی نثر کے جملے چھوٹے چھوٹے اور فصاحت سے بھرپور ہیں۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> '' پہ سن دولس شپگ سوہ د ھجری تللے وم او د پشتونخوا پہ راغواو کلیو گرزیدم او مراقد د اولیا او واصلینو مے پلٹل او پہ ھر لوری مے کاملان موندل او د دوی پہ خدمت کے خاکپائے وم او ہر کلہ پہ سلام ورتہ ولاڑ۔ چہ لہ دے سفرہ پہ کور کے کیناستم او تژا کے مے د چاؤدلے د پخو، بیا پاسیدلم او لہ ښتنہ مے مرستون سوم چہ احوال دھغو کاملانو وکاگم۔'' (ح- 1)

ترجمہ: ”612ھ میں، میں نے پشتونخواہ کے دشت ومواضع کا سفر کیا اور اولیاء اور واصلین کے مراقد تلاش کرتا رہا۔ ہر سمت مجھے بزرگانِ کامل ملے اور ان کی خدمت میں خاکِ پا بنا رہا اور سلام کے لئے ہر دم مستعد رہا۔ جب اس سفر سے گھر لوٹا اور پاؤں کے چھالے پھٹ گئے تو پھر اٹھا اور اللہ پاک سے مدد مانگی تاکہ ان اولیائے عظام کے حالات لکھوں۔“

ایک تیسری کتاب جو اس دور سے تعلق رکھتی ہے اس کا نام ”دفتر شیخ ملی“ ہے۔ شیخ ملی ایک یوسفزئی افغان تھا اور زمینوں کی پیمائش کا ماہر تھا۔ صوبہ سرحد میں مختلف قبائل کے درمیان جو موجودہ تقسیم ہے۔ وہ اسی کے ہاتھوں کی ہوئی ہے، جن تواریخ نے ”دفتر شیخ ملی“ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں اخون درویزہ (940ھ۔1048ھ) کا ”تذکرۃ الابرار والاشرار“ میر دادخیل اور پیر معظم شاہ کی ”تاریخ افاغنہ“ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں خوشحال خان خٹک نے بھی اس کا ذکر کیا ہے، وہ کہتا ہے:

پہ سوات کے دی دوہ سیزہ کہ خفی دی کہ جلی
یو مخزن د درویزہ دے بل دفتر د شیخ ملی

ترجمہ: ”سوات میں خواہ پوشیدہ ہو یا آشکارا، صرف دو چیزوں کا چرچا ہے۔
ایک اخون درویزہؒ کے ”مخزن“ کا اور دوسرا شیخ ملی کے دفتر کا۔“

مستشرقین میں سے میجر راورٹی (1825ء۔1906ء) نے اپنی ”پشتو گرامر“ اور ”پشتو ڈکشنری“ کے مقدمات میں شیخ ملی کو ایک لکھاری کی حیثیت سے یاد کیا ہے اور اس کی کتاب ”دفتر شیخ ملی“ کا ذکر کیا ہے۔ جیمز ڈارمسٹیٹر (1849ء۔1894ء) نے میجر راورٹی کے حوالے سے ”د پشتونخوا د شعر هار و بهار“ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ افغانستان کے ادبی تذکروں اور تواریخ میں اس کتاب کا سن تصنیف 820ھ لکھا گیا ہے، لیکن پروفیسر محمد نواز طائر نے ”تواریخ حافظ رحمت خانی“ کے مقدمہ میں یہ سن 930ھ لکھا ہے۔

اس دور کی ایک اور مشہور کتاب ”تاریخ خان کجو“ ہے۔ خان کجو یا کجو خان بھی شیخ ملی کی طرح ایک قابل اور زیرک انسان تھا۔ میجر راورٹی ”پشتو ڈکشنری“ کے مقدمہ میں لکھتا ہے۔ ”میرے پاس خان کجو کی ایک پشتو تاریخ موجود ہے، جو 900ھ میں لکھی گئی ہے“ تاہم بدقسمتی سے یہ تاریخ ابھی تک دستیاب نہیں ہے۔

1.2۔ دوسرا دور

”تذکرۃ الاولیاء“ کے بعد پشتو نثر کا مستند اور تاریخی اعتبار سے معتبر نمونہ ”خیر البیان“ کی نثر ہے، جو بایزید انصاری

(930ھ-980ھ) کی تصنیف ہے۔ یہ پشتو زبان میں نثر کی پہلی با قاعدہ کتاب ہے، جس میں پشتو' عربی' فارسی اور ہندی (قدیم اردو) زبانیں استعمال کی گئی ہیں۔ یہ کتاب 957ھ، 972ھ اور بعض ناقدین کے نزدیک 975ھ میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں بایزید انصاری نے اپنے تصوفی افکار کو بہت موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

خیر البیان کی نثر مسجع اور مقفی ہے۔ یہ سورۃ رحمٰن کے آہنگ میں لکھی گئی ہے اور شروع سے آخر تک یہ آہنگ برقرار رہتا ہے۔ بایزید انصاری نے پشتو نثر کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی، جو بعد میں ایک الگ مکتبۂ فکر کی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ خیر البیان کا اسلوب وہ نہیں ہے، جو سلیمان ماکو کے "تذکرۃ الاولیاء" کا ہے۔ اُنھوں نے شعوری طور پر خیر البیان کے پشتو حصے کو خالص پشتو بنانے کی کوشش کی اور عربی و فارسی کی صوفیانہ تراکیب اور فقہ اسلامی کی اصطلاحات کے لئے پشتو الفاظ وضع کئے۔ علاوہ ازیں انہوں نے بعض الفاظ اور اشیاء کے ناموں کو بھی پشتو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

خیر البیان کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"او بایزید! زما ڈیر ستر صفت وکڑہ' خوشی مے پیداشی چہ زما ڈیر ستر صفت وائی آدمیان! گورہ! زما تسبیح وائی چہ زما پہ مزکہ کے دی (یا) پہ آسمان۔ نشتہ ہیس بیرون چہ زما تسبیح وائی تہء باور وکڑہ پہ دابیان، یسبح للہ مافی السمٰوت ومافی الارض" (ح۔2)

ترجمہ : "اے بایزید! بہت سی حمد وثنا لکھ۔ اس لئے کہ جب کوئی انسان میری حمد وثنا کرتا ہے تو مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ دیکھ! جو کوئی بھی زمین پر ہے یا آسمانوں میں ہے، میری ثنا کرتا ہے۔ کوئی بھی ایسی مخلوق نہیں ہے جو میری حمد نہ کرتی ہو۔ اس ارشاد پر یقین کر "یسبح للہ ما فی السمٰوت و ما فی الارض"

قدیم پشتو نثر کے اس دوسرے دور کے ایک اور عالم اور نثر نگار اخوند درویزہ (940ھ-1048ھ) ہیں، جو نظریاتی سطح پر بایزید انصاری سے سخت اختلاف رکھتے تھے۔ ان کی کتاب کا نام "مخزن" ہے جو "خیر البیان" کی ضد میں لکھی گئی۔ یہ کتاب گیارہویں صدی ہجری کے ربع اول میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ مختلف دینی کتب کے پشتو تراجم پر مبنی ہے۔ ہر چند کہ اس کی نثر بھی مسجع اور مقفی ہے، لیکن خیر البیان کی نثر کے مقابلے میں قدرے رواں اور آسان ہے۔ پشتو کی قدیم نثری کتابوں میں اس نے بڑی شہرت پائی اور اس کے بے شمار قلمی نسخے تیار کئے گئے۔ صرف پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی

کی لائبریری میں اس کے پچاس سے زیادہ قلمی نسخے موجود ہیں۔اس کتاب نے پشتو میں نثر لکھنے کی ایک تحریک پیدا کی اور اس کے تتبع میں دینی موضوعات پرمبنی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔مخزن کی نثر کا ایک نمونہ مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

''چے حادث لہ دوہ حالہ خالی نہ وی یا اعیان وی یا اعراض وی لیدہ کیگی سکہ اعیان سیزونہ چے قیام ئے پہ خپل ذات لکہ جسم یا جوھر دے۔جوھر نہ دوہ زایہ کیگی او اعراض ھغہ سیزونہ چے قیام ئے پہ ذات نہ وی۔دوی پہ جسم پہ جوھر پورے موندہ شی لکہ رنگ او بوی مزہ وی چے پہ سکل یا پہ خواڑہ یا پہ لیدہ کے نوی سرگندیگی سکہ اعیان اعراض دی دواڑہ نوی نوی پیدا شوی چے حادث قدیم گڑینہ ھغہ کس بہ کافر کیگی۔''

ترجمہ: ''حادث دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا یا اعیان یا اعراض ہوتا ہے، جیسا جسم یا جوہر ہے۔جوہر دو میں تقسیم نہیں ہوسکتا اور اعراض وہ چیزیں ہیں، جن کا قیام اپنی ذات پر نہیں ہوتا۔یہ جسم اور جوہر کے بغیر نہیں پائے جاسکتے، جس طرح رنگ، بو اور ذائقہ ہوتا ہے جو چکھنے یا کھانے یا دیکھنے میں نئے (انداز سے) ظاہر ہوتا ہے۔ اعیان اور اعراض دونوں، نئے نئے پیدا ہوئے ہیں، جو حادث کو قدیم سمجھے، وہ شخص کافر ہوگا۔''

اخون درویزہؒ کے ''مخزن'' کے اس ''سبک'' کو ان کے خاندان کے لکھنے والوں اور مریدوں نے پروان چڑھایا۔اس سلسلے میں اس کا بیٹا کریمداد، بھتیجا ملا اصغر اور پوتے محمد حلیم اور عبدالسلام قابل ذکر ہیں اور ان کے شاگردوں اور ارادت مندوں میں عمر خان شلمانی، بابو خان، اخوند قاسم پاپین خیل شنواری، خلیل، ملا چالاکؒ، ملامست زمند، میر حسین ہروی، شیخ محمد سعید، اخوند موسیٰ اور اخوند میاں داد نمایاں لکھاری ہیں۔یہ سارے لکھاری گیارہویں صدی ہجری سے تعلق رکھتے ہیں۔مسجع نثر نگاری کا یہ ''سبک'' جسے بایزید انصاری المعروف بہ پیر روشن نے شعوری طور پر اپنایا اور جو گیارھویں صدی ہجری کا ایک مقبول ''سبک'' بنا۔اس نے تیرھویں صدی ہجری تک طول کھینچا۔

اس سبک میں جو کتابیں لکھی گئیں ان میں زیادہ تر شرعی اور فقہی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔عرفانی افکار، قصص اور حکایات، پیغمبر اسلام کی سیرت اور شمایل، قرآنی آیتوں اور احادیث نبوی کے ترجمے، طب اور حکمت، دینی نقطہ نظر سے

معاشرتی اوراجتماعی مسائل، اس سبک کی لکھاریوں کی من پسند موضوعات رہے ہیں۔ اس سبک کے لکھاریوں کا مقصد صرف دین کی توضیح اورتشریح کرنا تھا۔ اس لئے ان کا انداز بیان خشک اور ناصحانہ ہے۔ اس میں ادبی رنگ مفقود ہے، لیکن نثر میں مسجّع نگاری کے اس رجحان کے ساتھ ساتھ، رواں نگاری کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ اس رواں نگاری کی پہلی جھلک پیر روشن کی زندگی میں ہی نظر آنے لگتی ہے۔ یہ نثر پیر روشن کے ایک ہمعصر مرید ارزانی خویشکی (927ھ-1010ھ) نے لکھی ہے۔ نثر کا ایک چھوٹا سا رسالہ جو ناقص الاول وآخر ہے۔ صرف 22 صفحات پر مشتمل ہے، جو ارزانی خویشکی کے ایک دیوان (اندراج نمبر 937، کتب خانہ، پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی) کے ساتھ آخر میں منسلک ہے۔ اس نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''خلیفہ دے ووائی ستا جوندون پہ چا دے۔ دے بہ وائی زما جوندون پہ خدائے دے۔ ستا دستر گو بینائی دے چا دہ، دے بہ وائی دخدائے دہ۔ ستا گویائی دے چا دہ، دے بہ وائی دخدائے دہ'' (ح۔3)

ترجمہ: ''خلیفہ (مرید سے) پوچھے کہ تیری زندگی کس پر ہے، (مرید) کہے گا کہ میری زندگی خدا کی دی ہوئی ہے۔ تیری آنکھوں کی بینائی کس کی ہے؟ تو (مرید) کہے گا کہ خدا کی ہے۔ تیری گویائی کس کی ہے؟ یہ (مرید) کہے گا کہ خدا کی ہے۔''

روشنیہ تحریک سے تعلق رکھنے والا دوسرا مشہور شاعر اور ادیب علی محمد مخلص (1020ھ-1080ھ) ہے، جس نے نثر میں ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا، جو اپنے وقت کے حوالے سے رواں نگاری کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ یہ رسالہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، جو ارزانی خویشکی اور میرزا خان انصاری کے دواوین کے ساتھ ایک قلمی مجموعہ میں محفوظ ہے۔ (ح۔4)

علی محمد مخلص کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''هر کله چے هغه وینہ روح نباتی تر دماغہ ورسوی روح حیوانی پکے داخل کا، حرکت، پینزۂ حسہ پکے ورشی گورہ پینزۂ گوهرہ پینزۂ چراغ دی هر کله چے دا پینزۂ چراغہ پہ پینزۂ زایہ صورت کے بل کا هالہ روح انسانی پکے داخل کا''۔ (ح۔5)

ترجمہ: ''جب خون روح نباتی کو دماغ تک پہنچائے، تو روح حیوانی اس

میں حرکت کرتی ہے۔ پانچ حواس (حواس خمسہ) اس میں داخل ہو جاتے ہیں،
دیکھو پانچ گوہر پانچ چراغ کی مانند ہوتے ہیں، جب یہ چراغ پانچ صورتوں میں
پانچ جگہ جلائے جائیں، تو اس وقت روح انسانی اس میں داخل ہو جاتی ہے۔
(یعنی روح انسانی بیدار ہو جاتی ہے)''

علی محمد مخلص کی نثر ارزانی خویشکی کی نثر کی طرح سجع سے آزاد ہے۔ دونوں کی نثروں کے جملے چھوٹے اور واضح ہیں، البتہ ارزانی خویشکی کی نثر میں جو ثقالت نظر آتی ہے، وہ مخلص کی نثر میں نہیں ہے۔ ارزانی خویشکی کی نثر میں ثقالت کا سبب چند پرانے الفاظ کا استعمال ہے جیسا ترو، خپسر وغیرہ۔ مخلص کی نثر میں دیگر زبانوں کی لغات، اصطلاحات اور ترکیبات نسبتاً زیادہ ہیں۔

اخوند عبدالکریم (کریمداد) اخوند درویزہؒ کا (جو سجع نگاری کے بانیوں میں سے ہے) بیٹا ہے۔ کریم داد خود بھی ایک مسجع نگار ہے، لیکن اس کی اپنے والد بزرگوار کی کتاب ''تذکرۃ الابرار والاشرار'' کے ایک قلمی نسخے کے آخر میں ایک منثور تحریر ملتی ہے، جو نثر عاری کا ایک اچھا نمونہ ہے:

''ای خدایہ ستاد عام کرم زنے اوستاد قدیم لطف زنے امیدلرم، چے دلتہ دسھو
اوخوید واثر پرے نگدم او پہ نظر دمعزز واواشراف وعلما واو پرھیز گار واوغورہ شویو
عارفانوئے قبول کڑے چے پہ صحت دَدے کتاب او پہ حفاظت دَایمان زموگ پہ
حق کے قبول کڑے۔ زموگ پہ خطا گانو قلم دَعفوے را کاگے اوموگ پہ لار برابر
کڑے''۔ (ح۔6)

ترجمہ: ''اے اللہ میں تیرے کرم عام اور تیرے لطف قدیم سے یہ امید رکھتا
ہوں کہ میں یہاں سہو اور خطا کا اثر نہ چھوڑ جاؤں اور معزز و اشراف علماء اور پرہیز
گار و منتخب عرفاء اسے قبول کریں تا کہ وہ اس کتاب کی صحت اور میرے ایمان کی
سلامتی کے لیے دعا کریں۔ اے اللہ! ان کی دعائیں ہمارے حق میں قبول فرما،
ہماری خطاؤں کو قلم عفو سے محو کر اور ہمیں صراط مستقیم پر قائم فرما''۔

سجع نگاری کے اس دور میں ہمیں رواں نگاری کے جو چھوٹے چھوٹے نمونے ملتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو

جاتی ہے کہ اس وقت کے نثر نگار، نثر عاری سے بے خبر نہیں تھے، مگر اس وقت مذہبی اور دینی مسائل وموضوعات کو سمجھنے اور سمجھانے کی جو تحریک اٹھی تھی، اس کے لئے سجع نگاری ایک موزوں اسلوب قرار دیا گیا تھا اور رواں نگاری کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔

1.3۔تیسرا دور

خوشحال خان خٹک (1022ھ-1100ھ) پشتو ادب کی وہ نابغۂ روزگار ادبی شخصیت ہے، جس نے اپنی بالغ نظری اور فہم وذکا سے نظم اور نثر دونوں میدانوں میں قدیم اسلوب کے سیلاب کا رخ موڑنے میں اہم کردار ادا کیا اور وقت کی دہلیز پر کھڑے ہو کر جدیدیت کے لئے نئے راستے تلاش کئے۔اس نے شعوری طور پر ان تبدیلیوں کو ایک تحریک کی شکل دی۔

کہ دَ نظم کہ دَ نثر کہ دَ خط دے

پہ پشتو جبہ مے حق دے بے حسابہ

ترجمہ : ''نظم ہو یا نثر یا خط۔پشتو زبان پر میرا بہت حق ہے''۔

خوشحال خان خٹک کی جدید نثر کے جو ابتدائی نمونے ہمیں ملے ہیں وہ 1050ھ سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ نمونے پشتو ادب میں ''بیاض'' کے نام سے مشہور ہیں۔''بیاض'' کی نثر گزشتہ ادوار کی نثر کے مقابلے میں زیادہ آسان، رواں اور سلیس ہے اور اس کا انداز مکالماتی ہے، جس کی وجہ سے یہ عام بول چال کی زبان کے بہت قریب ہے، بیاض کی نثر کے بارے میں دوست محمد خان کامل لکھتے ہیں:

> ''خان علیین مکان کے چھوٹے چھوٹے فقرے عبارت کو بے حد پُر لطف اور دلآویز بناتے اور اسے بالکل مکالمے کا رنگ دیتے ہیں۔یوں معلوم ہوتا ہے، خان حجرے میں بیٹھا کسی سے باتیں کرتا ہے۔وہ کچھ پوچھتا ہے اور خان اسے نہایت برجستہ ومختصر جواب دیتا ہے۔''(ح۔7)

بیاض کتابی صورت میں دستیاب نہیں ہے تاہم ''تاریخ مرصّع''میں اس کی نثر کے نمونے موجود ہیں۔ایک نمونہ پیش خدمت ہے:

> ''دوہ درے تنہ مے بیا روان کڑہ چے ھغہ ھندوانو ناپکارو تہ ووائی چے کہ یو سیر غلہ پہ ھر خرسوی زر موجود دی، مضائقہ دز رونشتہ۔دا بے مروتی چے موکڑے

دہ چہ قلعہ تہ مو پرے نخو وداڈیرہ دہ، غلہ لہ موگ مہ دریغوئ پہ زڑۂ ئے رحم وشہ۔
اوڑۂ ئے پہ طریق دضیافت راستول هغه یو سیر اوڑۂ او هغه پسۂ موقسمت
کڑل''۔(ح۔8)

ترجمہ: ''دو تین لوگوں کو روانہ کیا تا کہ ان نابکار ہندوؤں کو کہے کہ اگر ایک سیر
غلہ ایک مہر پر بیچتے ہو تو پیسے موجود ہیں۔ پیسوں کا کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بے
مروتی جو تم نے کی ہے کہ قلعہ کے اندر نہیں آنے دیا، یہ کافی ہے، غلہ نہ روکیں۔
ان کے دلوں میں رحم آ گیا اور ایک سیر آٹا ضیافت کے طور پر بھیج دیا۔ وہ ایک سیر
آٹا اور ایک دنبہ جو قسمت میں تھا، کھایا۔''

خوشحال خان خٹک کے نثری آثار میں ''دستار نامہ'' البتہ کتابی شکل میں دستیاب ہے، جو کہ 17 ربیع الاول 1076ھ میں اس وقت لکھا گیا جب وہ رنتھمبور کے قلعہ میں قید تھا۔ اپنی کتاب ''دستار نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''پہ خاطر فاتر ورسیدل چہ یوہ موجزہ مختصرہ رسالہ پشتو کڑم انشا چہ عبارت ئے
روان وی قریب الفہم''۔(ح۔9)

ترجمہ: ''خاطر فاطر میں آیا کہ پشتو میں ایک مختصر رسالہ لکھوں، جس کی
عبارت رواں ہو (اور) قریب الفہم ہو۔''

اس وقت اس کے پاس کوئی کتاب یا دیگر ماخذات نہیں تھے، صرف حافظے کے زور پر سب کچھ لکھا۔ اس کے باوجود اس نے دستار نامہ میں یادداشت کے بل بوتے پر چند کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جو یہ ہیں۔ تحفۃ الغیاثی، شرف الدین علی یزدی کا ''ظفر نامہ'' تاریخ روضۃ المصفا، رسالہ تیر اندازی اور امام غزالی کے چند آثار۔ ان کے علاوہ قرآنی آیتوں، احادیث نبوی، پشتو اور فارسی اشعار سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ دستار نامہ کی نثر کے بارے میں صدیق اللہ رشتین لکھتے ہیں:

''دستار نامہ'' کی نثر میں عربی اور فارسی الفاظ زیادہ ہیں مگر بیاض کی نثر میں
دوسری زبانوں کے کلمات بہت کم ہیں۔ بیاض کی نثر محاورے اور عام بول چال
کے قریب ہے جبکہ ''دستار نامہ'' کی نثر علمی اور ادبی انداز میں لکھی گئی ہے۔ پھر
بھی یہ نثر ایک عاری اور آزاد نثر ہے اور ہم اسے اپنے وقت کی بہترین نثر سمجھتے
ہیں۔''(ح۔10)

اس کتاب میں ایک اچھے اور کامیاب حکمران کے لئے بیس ہنر اور بیس خصلتیں بیان کی گئی ہیں۔ ''دستارنامہ'' کی نثر میں ''بیاض'' کی نثر کے مقابلے میں عربی اور فارسی کلمات کا استعمال نسبتاً زیادہ ہے۔ پھر بھی یہ ایک آزاد اور سلیس نثر ہے جو اپنے دور کی بہترین نثر شمار کی جاتی ہے۔

دستارنامے کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ کریں:

''دَ خصلتونو دَ ہنرونو پہ طریق چہ منحصر دَ دستار دَ قابلیت دی دَ دستار لائقت موقوف پہ ہغو خصلتونو ہنرونو دے۔ نقصان ئے پہ عدم محصول کے دے۔ ہنرونہ' کسبونہ' فنونہ' حرفتونہ' صنعتونہ' خصلتونہ' خویونہ ڈیردی۔ تر شمارہ تیردی کہ پہ واڑو پسے سوک زغلی عمر دَ نوح (علیہ السلام) بویہ چہ پہ تعلیم ئے حاصل کا۔''

ترجمہ: ''خصائل اور فنون کے لحاظ سے وہ فہرست جو دستار فضیلت کیلئے لازمی ہے، دستار کی لیاقت بھی ان ہی خصائل اور فنون پر مبنی ہے۔ ان کا نہ ہونا باعث نقصان ہے۔ ہنر، کسب، فنون، حرفت، صنائع اور خصائل و عادات بہت اور بے شمار ہیں اگر ان سب کے حصول کے درپے رہو گے تو اس کے لئے عمر نوح درکار ہوگی''۔

خوشحال خان خٹک کی نثر اس حد تک آسان اور سادہ ہے کہ بعض نقادوں نے انہیں جدید نثر کا بانی بھی قرار دیا ہے، لیکن یہ بات کلی طور پر صحیح نہیں تاہم اس نے پشتو کے قدیم نثری ادب کا ایک نیا سبک ایجاد کیا، جو مسجع، موزوں نثر اور معاصر نثر کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔

خوشحال خان خٹک کے بعد اس کے بیٹوں اور نواسوں نے بھی نثر میں کئی کتابیں لکھیں، جن میں سے اس کے بیٹے عبدالقادر خان خٹک (1063ھ-1126ھ) کا نام سرفہرست ہے۔ اس نے 1124ھ میں پشتو نثر میں ''گلدستہ'' کے نام سے ''گلستان سعدی'' کا ترجمہ کیا۔ اس کتاب کے شروع میں اس نے دیباچہ بھی تحریر کیا، جو اس کی طبع زاد نثر کا بہترین نمونہ ہے۔ روانی اور سلاست کے اعتبار سے اس دیباچے کی نثر پر موجودہ دور کی نثر کا گمان ہوتا ہے۔ اس دیباچے کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''یوہ ورز ددۂ پہ خدمت ناست اوم لہ یوہ زایہ روپے راغلے وے پہ مستحقا نوئے

پہ چیل لاس قسمت کڑے۔ لاسونہ ئے وکتل تورشوی وو۔ کوزہ خدمتگار راوڑہ چے
لاسونہ ئے وِلِل راتہ یے وفرمایل چے لکہ لاسونہ ددوی پہ قربت توریگی، زڑونہ ئے
لاسیاہ شی دلاسونو سیاھی خو پہ وللو لاڑہ شی۔ امادزڑہ دسیاھی تلہ دشوار دی بے دحق
تعالٰی دتوفیق لہ اوبونہ سپینیگی"۔ (ح۔ 11)

ترجمہ: "ایک دن اس (خوشحال خان خٹک) کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا۔
ایک جگہ سے کچھ رقم آئی تھی، خود اپنے ہاتھوں سے مستحقین میں تقسیم کی۔ ہاتھوں
کو جب دیکھا تو سیاہ ہو چکے تھے۔ نوکر کوزہ لایا۔ ہاتھوں کو جب دھو رہے تھے تو
مجھے فرمایا جس طرح یہ ہاتھ اس کی قربت سے سیاہ ہو جاتے ہیں، اس طرح دلِ
بھی اس کی محبت سے سیاہ ہو جاتے ہیں۔ ہاتھوں کی سیاہی تو دھونے سے دور ہو
جاتی ہے، لیکن دل کی سیاہی کا مٹ جانا دشوار ہے۔ بغیر خدا کی توفیق کے پانی
سے نہیں دھوئی جاسکتی۔"

اب ذرا پشتو ترجمے کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

"یو بادشاہ پہ کشتئی کے ناست وو۔ یو مریئے عجمی ہم ورسرہ پہ خدمت حاضر وو -
مرئی کلہ سیند لیدلے نہ وو۔ دکشتئی ناستہ یئے آزمیلے نہ وو۔ ژڑا زاری فریاد یے
آغاز کڑو۔ (ح-12)

ترجمہ: "ایک بادشاہ کشتی میں بیٹھا تھا - ایک عجمی غلام بھی ساتھ تھا - غلام
نے کبھی دریا نہیں دیکھا تھا۔ اسے کشتی میں بیٹھنے کا بھی کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔
اس نے فوراً گریہ وفریاد اور آہ وزاری شروع کر دی۔"

اس کا ترجمہ بھی رواں اور سلیس ہے، جملے چھوٹے اور مختصر ہیں۔ عبارت صاف اور مقصد واضح ہے۔ حروف عطف و
ربط کا استعمال کم ہے۔ ترکیبات زیادہ تر پشتو زبان کے رنگ میں رنگی ہوئی ہیں، مگر پھر بھی فارسی کے اثر سے آزاد نہیں۔ مضاف
پہلے اور مضاف الیہ بعد میں لائے گئے ہیں، لیکن یہ نقص تیسرے دور کے تمام نثر پاروں میں پایا جاتا ہے۔
اس دور کا ایک اور نام گوہر خان خٹک (1070ھ-1136ھ کے بعد) ہے۔ یہ بھی خوشحال خان خٹک کا بیٹا

تھا۔اس نے 1120ھ میں ''قلب السیر'' کے نام سے فارسی کی ایک کتاب کا پشتو نثر میں ترجمہ کیا۔اس کتاب کا ایک خطی نسخہ پشاور کے عجائب گھر اور دوسرا اکمل نسخہ پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔نثری خصوصیت کے حوالے سے اس کتاب کی نثر ''گلدستہ'' کی نثر کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔جملے چھوٹے چھوٹے اور مطلب واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، تاہم روانی کے تقاضے پورے ہوتے نظر نہیں آتے۔اس میں جگہ جگہ فارسی تراکیب اور اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔اس کے باوجود اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے کہ سیرت کے حوالے سے یہ پشتو میں ہونے والا اولین ترجمہ ہے، جو کتابی صورت میں موجود ہے۔

خوشحال خان خٹک کے بیٹوں کے بعد پشتو نثر میں اس کے نواسے افضل خان خٹک (1075ھ-1183ھ) کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے، جو کہ اشرف خان ہجری کا بیٹا تھا اور خوشحال خان کی طرح صاحب سیف وقلم بھی تھا۔اس نے ''تاریخ مرصع'' کے نام سے پشتو نثر میں ایک ضخیم کتاب لکھی۔تاریخ کے موضوع سے متعلق یہ پشتو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، جس میں اس دور کے حالات کا مفصل تذکرہ بھی موجود ہے اور مختلف پیغمبروں اور اولیائے کرام کے حالات کے علاوہ خٹک قبیلے کی تاریخ، پشتون قوم کی تاریخ اور مغلیہ خاندان کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔

ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''اخوند درویزہ چہ ددلازاکو پہ ھغہ آدان پہ میرہ دلنگر کوٹ استوگنہ وہ او یوسفزوئی پہ ھشنغر وہ او پہ داسبب چہ دلازاکو دلنگر کوٹ گردونواحی سرہ نیولی وو۔چہ بہ د یوسفزو مال مواشی میرے تہ پہ چراہ گاہ ورغلل تاخت وتاراج بہ ئے کڑ۔'' (ح۔13)

ترجمہ: ''نقل ہے اخون درویزہ سے کہ دلازاک اس وقت لنگر کوٹ کے صحرا میں رہائش پذیر تھے اور یوسفزئی ہشت نگر میں اور چونکہ دلازاک لنگر کوٹ کے گردونواح پر قابض تھے۔اس لئے جب بھی یوسف زئیوں کے مال مویشی ان کی چراہ گاہ کی طرف جاتے، چراہ گاہ کو تباہ وبرباد کردیتے''

افضل خان خٹک کی ایک اور نثری کاوش ''علم خانہ دانش'' ہے۔یہ کتاب ابوالفضل کی ''عیار دانش'' کا ترجمہ ہے، جسے افضل خان خٹک نے 1128ھ میں مکمل کیا۔کتاب کا ایک خطی نسخہ لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے، جس کا سن تحریر 14 محرم 1183ھ ہے۔

''علم خانہ دانش'' کی نثر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''راوڑی ئے دی چے یوہ بیزووہ تر کانڑئے ولید چے لرگے ئے پریکاوہ۔ دوہ
میخہ ورسرہ وو، یومیخ بہ ئے پہ ھغہ لرگی ٹک واھئہ تر یوہ زایہ بہ شگاف وشہ، بیا بہ
ئے ھغہ لرے کڑہ، بل میخ بہ ئے پرے ووا ھہ پہ دارنگ ئے چاوَہ، ھغہ تر کانڑ
چے سہ کارتہ پاسیدلاڑ بیزوراغلہ پہ ھغہ چوب کیناستہ پریکاوہ یے، دواڑہ پچے
ئے دلرگی پہ شگاف ننوتے اول میخ ئے وکیخ چے بل ٹک وھی دواڑہ پچے ئے محکمے
پہ ھغہ لرگی کے ونختے بیزو پہ ژڑا شوہ دائے ووے زما کارمیوہ ٹولول دی نہ ارہ
سکول ہنر زمادزنگل تماشہ دہ نہ تبرتیشہ''

ترجمہ: ''کہا گیا ہے کہ ایک بندر تھا اس نے ایک بڑھئی (ترکھان) کو دیکھا،
جو لکڑی کاٹ رہا تھا۔ اس کے پاس دو میخیں تھیں۔ ایک میخ ایک جگہ ٹانکتا تو کچھ
حد تک (لکڑی میں) شگاف پڑ جاتا، پھر اس کو نکالتا تو دوسری میخ ٹانکتا۔ اس
طریقے سے (لکڑی کو) چیرتا جاتا۔ بڑھئی کسی کام کے لئے اٹھا اور چلا گیا۔ بندر
(فوراً) آ گیا اور اس چوب کے اوپر بیٹھ گیا اور (لکڑی کو) چیرنے لگا۔ (نتیجتاً)
اس کے دونوں پاؤں لکڑی کے شگاف میں پھنس گئے، جب پہلی میخ نکالی تاکہ
دوسری ٹانکے تو اس کے دونوں پاؤں پوری طرح اس لکڑی میں پھنس گئے۔ بندر
رونے لگا اور بولا! میرا کام تو پھلوں کو کھانا ہے نہ کہ آرہ چلانا، میرا ہنر جنگل کا
تماشہ ہے نہ کہ کلہاڑی مارنا اور تیشہ چلانا۔''

افضل خان خٹک کی نثر، خوشحال خان خٹک کی نثری سبک کی ایک بہتر نثر سمجھی جاتی ہے۔ اس کی پہلی نثر تاریخی ہے اور دوسری قصصی۔ دونوں قسم کی نثر کے جملے بھی چھوٹے چھوٹے ہیں۔ مقصد کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔ زیادہ مشکل اور ناآشنا لغات نہیں لاتا۔ حروف عطف کا استعمال بھی کم کرتا ہے۔ تاریخ مرصع کی نثر میں خوشحال خان خٹک کی نثر کی بھرپور جھلک ملتی ہے بلکہ بعض جگہ اس کی نثر پر خان بابا کی نثر کا گمان ہوتا ہے۔

''علم خانہ دانش'' چونکہ ترجمہ ہے، لہذا اس کی نثر پر عربی اور فارسی کلمات کا اثر موجود ہے، لیکن ان صفات کے باوجود اس کی ساری نثر پوری طرح ایک جیسی خوبی سے مزین نہیں۔ کہیں کہیں اس میں سختی اور سنگینی پائی جاتی ہے۔ ''علم خانہ

دانش'' کی نثر پر فارسی جملوں اور ترکیبات کا رنگ چڑھا ہوا نظر آتا ہے۔میاں تقویم الحق کا کاخیل، افضل خان خٹک کی نثر میں سادگی اور روانی سے انکار کرتے ہیں۔(ح۔14) مگر صدیق اللہ ریشتین ان سے اتفاق نہیں کرتے۔

گوہر خان خٹک کے علاوہ جن دیگر نثر نگاروں نے افضل خان خٹک کی تشویق پر فارسی اور عربی زبانوں سے تاریخی اور قصصی کتب کے پشتو میں ترجمے کئے۔ان میں عبدالحلیم اور محمد مظفر زیادہ مشہور ہیں۔عبدالحلیم نے مختلف تفاسیر اور قصصی کتابوں سے پیغمبروں کے حالات کو جمع کر کے ''تاج القصص'' کے نام سے پشتو میں ترجمہ کیا۔محمد مظفر نے ''تاریخ اعثم کوفی'' کا پشتو میں ترجمہ کیا۔یہ کتاب سب سے پہلے خواجہ احمد بن اعثم کوفی نے عربی زبان میں لکھی، پھر محمد بن احمد مستوفی نے 596ھ میں فارسی میں ترجمہ کیا، بعد ازاں محمد مظفر نے 1126ھ میں اس کا پشتو میں ترجمہ کیا۔

مسعود کا نام بھی قدیم نثری ادب کے اس تیسرے دور کے نثر نگاروں میں اہم ہے۔اس نے پشتو کی ایک لوک داستان ''آدم خان درخانئ'' نثر میں لکھی، جس کا ایک خطی نسخہ کابل اکیڈمی میں موجود ہے۔یہ پشتو کی اولین نثری داستان سمجھی جاتی ہے۔اس کی نثر کا اسلوب وہی ہے جو خوشحال خان خٹک کی نثر کا ہے، لیکن معیار کے اعتبار سے قدرے کمزور ہے، تاہم سادہ، رواں اور سلیس ضرور ہے۔ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''پہ پخوا زمانہ کے پہ یوسفزو کے یو زوان پیدا شو چہ آدم خاں نو مانده، دَحسن خان زوئے وواو یو خزہ پیدا شوہ چہ دُرخو نو ماندہ وہ، دَطاؤس خان لوروہ۔''

ترجمہ : ''گذشتہ زمانے میں علاقہ یوسف زئی میں ایک جوان پیدا ہوا، جس کا نام آدم خان تھا۔وہ حسن خان کا بیٹا تھا اور ایک عورت پیدا ہوئی، جس کا نام درخو تھا۔وہ طاؤس خان کی بیٹی تھی۔''

اسی دور سے ایک اور اہم نثر نگار محمد ہوتک ابن داؤد ہیں، جنھوں نے 1142ھ میں ''پٹہ خزانہ'' (گنجِ مخفی) کے نام سے ایک تذکرہ لکھا، جس میں پچاس سے زیادہ پشتون شعراء اور ادباء کے حالات اور ان کی ادبی کاوشوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ان کی نثر سادہ، رواں اور بامحاورہ ہے لیکن اس کا معیار وہ نہیں ہے جو تاریخ مرصع کی نثر کا ہے۔''پٹہ خزانہ'' کی نثر کا ایک نمونہ مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

''زہ چہ محمد ھوتک یم او پہ اصل پختون پہ قندھار کے اوسم لہ ڈیرہ دہ، چہ پہ ویلو دد اسے ویناؤ بوخت یم او دشپے او ورزے مے ھمد غہ کار دے او داڈیر وقتونہ

تیر سول چہ ماغوختہ چہ زۂ پختنو شاعرانو تذکرہ وکاگم''(ح-15)

ترجمہ: ''میں کہ محمد ہوتک ہوں اور نسلاً پشتون، قندھار کا باشندہ ہوں اور کافی عرصہ سے اس قسم کی باتوں میں مصروف ہوں۔ دن رات میرا یہی کام ہے اور کافی عرصہ بیت گیا کہ میں چاہتا تھا کہ پشتون شعراء کا تذکرہ لکھوں۔''

اس دور میں جن دیگر لوگوں نے نثر لکھی۔ ان میں شیخ اخوند احمد، غلام محمد، ملک یار محمد ہوتک، یونس، محمد ظفر، پیر محمد کاکڑ، نواب محبت خان، نور محمد، جان محمد، ابراہیم، امیر محمد انصاری' نواب اللہ یار خان، نواب مستجاب خان' قاسم علی آفریدی، شمس الدین اور نواب افضل الدولہ کے نام قابل ذکر ہیں، چونکہ اس دور کے تمام نثر نگار عالم فاضل لوگ تھے۔ اس لئے ان کی نثر میں عربی اور فارسی کلمات کا استعمال زیادہ ملتا ہے، جس کی وجہ سے بعض جگہوں پر ایک عام قاری کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس دور میں نثر نئے موضوعات اور مضامین سے آشنا ہوئی اور اس میں کافی حد تک روانی و سلاست آئی۔ قدیم نثری ادب کا یہ تیسرا اور آخری دور 1300ھ کے اواخر میں ختم ہو جاتا ہے۔

2۔ خود آزمائی

1۔ قدیم پشتو نثری ادب کے دور اوّل کا تذکرہ کرتے ہوئے اس دور کے نثری ادب میں سلیمان ماکو کے ''تذکرۃ الاولیاء'' کی اہمیت پر روشنی ڈالیں۔

2۔ محمد ہوتک ابن داؤد کی تالیف ''پٹہ خزانہ'' کے بارے میں اپنے مطالعے کا خلاصہ تحریر کریں۔

3۔ مسجع اور مقفٰی نثر سے کیا مراد ہے؟ پشتو کے قدیم نثر پاروں میں اس کے نمونے کہاں کہاں ملتے ہیں۔ مدلّل حوالوں کے ساتھ وضاحت کیجئے۔

4۔ ''خیر البیان'' کی نثر کو ہم نثر مرصّع کہہ سکتے ہیں کیوں؟ وضاحت کیجئے۔

5۔ خوشحال خان خٹک کے اسلوب نثر کی نمایاں خصوصیات مثالوں کے ساتھ بیان کیجئے۔

6۔ کیا ''دستار نامہ'' کی نثر کو ہم سلیس اور آزاد نثر کہہ سکتے ہیں۔ اگر جواب ہاں میں ہے، تو کیوں؟

☆ حوالہ جات

(ح۔1)= سلیمان ماکو، تذکرۃ الاولیاء، پشاور، پروفیسر حبیبی ریسرچ سنٹر، 2000ء، ص6
(ح۔2) = بایزید انصاری، خیرالبیان، پشاور، پشتو اکیڈمی، 1988ء، طبع دوم، ص140
(ح۔3) = ارزانی خویشکی، کلیات ارزانی (مخطوطہ)، مملوکہ کتب خانہ پشتو اکیڈمی، اندراج نمبر 937
(ح۔4) = زلمے ھیوادمل، دپختو نثر اتہ سوہ کالہ، لاہور، ملت پرنٹرز، 1996ء، ص267
(ح۔5) = زلمے ھیوادمل، دپختو نثر اتہ سوہ کالہ، ص268
(ح۔6) = ایضا ص271
(ح۔7) = دوست محمد خان کامل، خوشحال خان خٹک، پشاور، ادارۂ اشاعت سرحد، 1951ء، ص398
(ح۔8) = افضل خان خٹک، تاریخ مرصع، مقدمہ از دوست محمد خان کامل، پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، 1974ء، ص211
(ح۔9) = خوشحال خان خٹک، دستارنامہ، پشاور، پشتو اکیڈمی، 1991ء، ص398
(ح۔10)= صدیق اللہ رشتین، دپختو نثر ھندارہ، پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، س ن ص104
(ح۔11)= عبدالقادر خان خٹک، گلدستہ، پشاور، پشتو اکیڈمی، 1981ء، بار دوم، ص79
(ح۔12)= عبدالقادر خان خٹک، گلدستہ، ص93
(ح۔13)= افضل خان خٹک، تاریخ مرصع، ص150
(ح۔14)= سید تکریم الحق کاکاخیل، بی بی نورہ، مقدمہ از تقویم الحق کاکاخیل، 1963ء، ص18,17
(ح۔15)= محمد ھوتک ابن داود، پٹہ خزانہ، کابل، وزارت تعلیم، 1339ھ ش، بار دوم، ص4
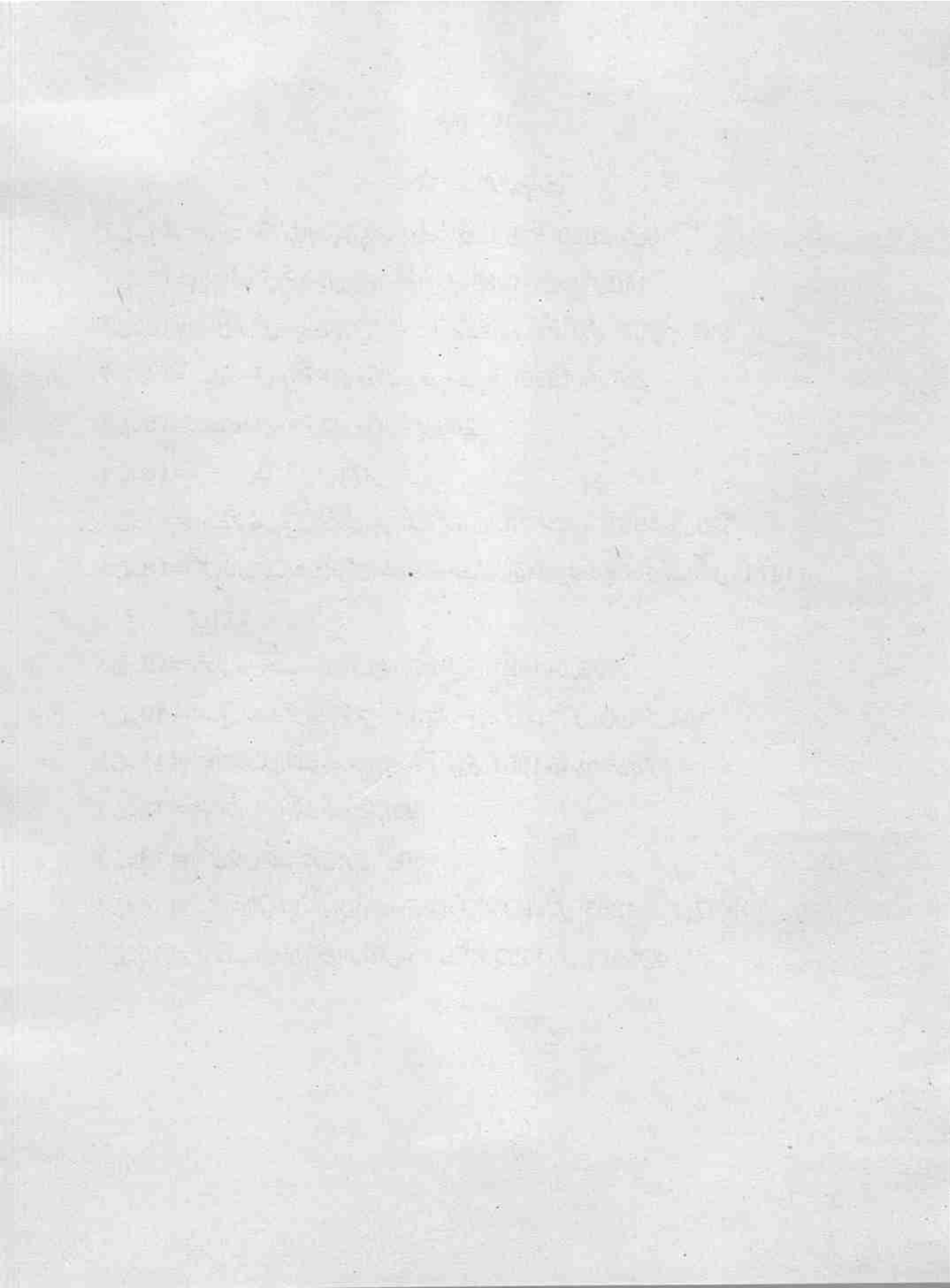
یونٹ نمبر 4

جدید شعری ادب

(پشتو)

تحریر : عبداللہ جان عابد

نظرثانی : ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات

مطالعاتی رہنما کے اس یونٹ کا تعلق پشتو کے جدید شعری ادب سے ہے۔پشتو شاعری میں جدید رجحانات کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے، جب برصغیر میں بیسویں صدی کے اوائل میں آزادئ وطن اور اصلاح احوال کی تحریکیں شروع ہوئیں، جن کا براہ راست اثر دوسری پاکستانی زبانوں کی طرح پشتو ادب پر بھی پڑا۔ان تحریکوں کے زیر اثر جس رجحان نے سب سے پہلے پشتو شاعری میں فروغ پایا، وہ وطن پرستی، حریت پسندی اور قومی اتحاد و یکجہتی کا رجحان ہے۔اس کے بعد اس زبان کی شاعری پر بالترتیب رومانی تحریک کے زیر اثر رومانی افکار اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ترقی پسندانہ افکار کا ورود ہمیں نظر آتا ہے۔اس یونٹ میں ان جدید ادبی رجحانات کے علاوہ اس زبان کے چند جدید شعراء سمندر خان سمندر، حمزہ شنواری، فضل حق شیدا، سید رسول رسا، غنی خان، ایوب صابر، یونس خلیل، اشرف مفتون، اجمل خٹک، پریشان خٹک، قلندر مومند، عبدالرحیم مجذوب اور قمر راہی کے فنِ سخن کا مطالعہ شامل ہے اور ساتھ ہی ان کے کلام کے نمونے بھی اردو تراجم کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔پاکستانی زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناتے آپ اس یونٹ کا بغور مطالعہ کیجئے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- جدید پشتو شاعری کے آغاز وارتقاء کے بارے میں جان سکیں۔

2- پشتو شاعری میں فنی اور فکری اعتبار سے جدید ادبی رجحانات سے آگاہی حاصل کر کے ان پر بحث کر سکیں۔

3- کورس میں شامل شعراء کے مقام و مرتبہ پر اظہار خیال کر سکیں۔

4- جدید شعراء کے رنگِ کلام سے آشنا ہو سکیں۔

5- ان شعراء کے درج شدہ کلام کا بغور مطالعہ کر کے ان کی مناسب تشریح کر سکیں۔

6- جدید پشتو شاعری کے بارے میں مجموعی طور پر آگاہ ہو سکیں۔
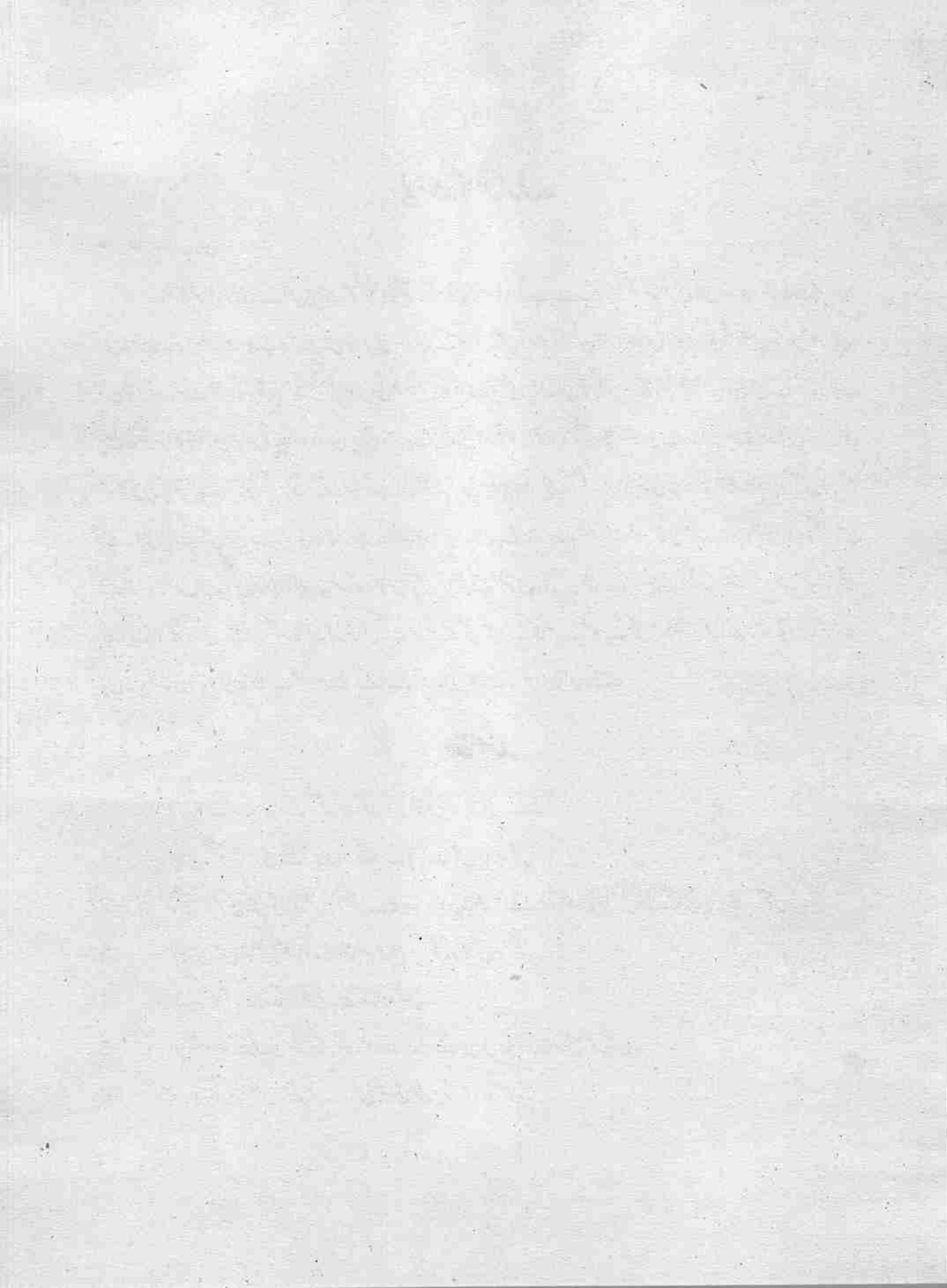
1۔ پشتو شاعری میں جدید ادبی رجحانات کا آغاز

انگریزوں کے یہاں آنے سے جن مختلف ہندوستانی زبانوں کے ادب پر اثرات پڑے، ان میں پشتو زبان بھی شامل ہے۔ پشتو کے شعری ادب میں ہیئت (Form) اور مضمون (Subject) کے لحاظ سے جدیدیت کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے، جب صوبہ سرحد میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک شروع ہوئی یعنی بیسویں صدی کے اوائل سے پشتو شاعری میں جدید رجحانات کا آغاز ہوتا ہے اور اس کے نصف دوم میں ان جدید رجحانات میں تیزی آئی، بعض ناقدین کی رائے ہے کہ پشتو زبان وادب نے جدید ادبی رجحانات انگریزی ادب سے براہ راست قبول کیے، مگر اس رائے کی پوری طرح تائید ممکن نہیں، کیونکہ ان دنوں پشتو میں بہت کم لکھنے والے اس معیار کے تھے کہ انگریزی ادب سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ البتہ معروف رائے یہ ہے کہ ہمارے اکثر ادیبوں نے اردو کی وساطت سے پشتو میں نئے ادبی رجحانات داخل کئے، یہ ادبی رجحانات فکری بھی تھے اور فنی بھی۔ فکری لحاظ سے ان رجحانات نے ادب کو زندگی کے قریب ترلانے کی کوشش کی اور ادب کے لیے نئی راہیں متعین کرنے کا ایک کامیاب وسیلہ ثابت ہوئے۔

1.1۔ جدید پشتو شاعری اور تحریک آزادی

بیسویں صدی کے اوائل میں سب سے پہلے جو رجحان تحریک آزادی کے زیر اثر پشتو شاعری میں فروغ پاتا ہے وہ وطن پرستی، حریت پسندی اور قومی اتحاد و یکجہتی کا رجحان ہے اور یہ رجحان ان شعراء کی شاعری میں نمایاں ہے، جو خدائی خدمتگار تحریک سے وابستہ تھے۔ جن شعراء نے اس دور میں اپنے آپ کو آزادی کے لئے وقف کئے رکھا اور تحریک آزادی سے متعلق قومی تحریکات میں شامل رہے، آزادی کے حق میں بیداری اور شعور پیدا کرنے کے لئے آتش نوا، پرمعنی اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں اور اس جذبے کو تقویت دی، ان میں غازی فضل محمود (1884ء-1946ء)، محمد اکبر خادم (1888ء-1954ء)، عبدالخالق خلیق (1895ء-1978ء)، میاں احمد شاہ بیرسٹر (1896ء-1961ء)، کاکا جی صنوبر حسین مومند (1897ء-1965ء)، عبدالمالک فدا (1897ء-1957ء)، فضل احمد غر (1899ء-1965ء)، عبدالاکبر خان اکبر (1900ء-1977ء)، ماسٹر عبدالکریم (1908ء-1961ء) اور امیر نواز خان جلیا (1910ء-1979ء) شامل ہیں۔ ان حریت پسند شعراء نے 1930ء میں آزادی کے حق میں اتنی زبردست فضا ہموار کی کہ انگریز حکمرانوں سمیت ہندوستانی رہنماؤں نے بھی اسے شدت سے محسوس کیا۔ اس ضمن میں بالترتیب غنی خان اور محمد اکبر خادم کا ایک ایک شعر مع اردو ترجمہ پڑھیے۔

؎ کہ خازے شنے مے پہ قبروی ولاڑے
کہ غلام مڑ یم رازئ تو کی پرے لاڑے

ترجمہ: ''اگر میری قبر پر سبز خازے (کتبے) ایستادہ ہوں اور میں غلام مرگیا ہوں تو ان پر تھوکو۔''

؎ نہ کلونہ دَ غلام پہ غلامیٔ کے
نہ ساعت دَ آزادئ کہ زنکدن وی

ترجمہ:'' حالت غلامی میں ہزار سالہ زندگی سے عالم نزع کے ایک لمحے کی آزادانہ زندگی بہتر ہے۔''

ان شعراء میں غازی فضل محمود مخفی، وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے آزادی کی تحریک کے پیش نظر جدید سوچ اور فکر کو نظم کا جامہ پہنایا اور جدید پشتو شاعری میں موضوع کے ساتھ ہیئت میں تبدیلی بھی ان کے ہاتھوں متعارف ہوئی۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے حریت و آزادی کا درس دیا۔ اس حوالے سے اسی دور کے ایک اور شاعر سید راحت زاخیلی (1884ء-1963ء) ہیں، جو مخفی کے ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ ان کی شاعری میں بھی فکری لحاظ سے جدیدیت کا ایک دھندلا سا عکس نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں کی ساخت روایتی ہے، لیکن ان کا انداز بیاں اور مضامین جدید ہیں۔ وہ علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی کی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ انہوں نے اقبال کی کتاب ''بانگ درا'' کا پشتو میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔ انہوں نے غزل، رباعی، نظم اور مثنوی بھی لکھی۔ وہ اپنے دور کے تعلیم یافتہ طبقے میں ''افغانی اقبال'' کے نام سے مشہور تھے۔

1.2۔ جدید پشتو شاعری اور رومانوی تحریک

جدید پشتو شاعری میں دوسرا اہم رجحان فلسفیانہ مضامین کے ساتھ ساتھ رومانیت کا اظہار ہے۔ رومانیت کی تحریک جس طرح انقلاب فرانس کے بعد برطانیہ میں شروع ہوئی اور پاک و ہند میں اردو شعراء نے انگریزی سے براہ راست اس کا اثر قبول کیا۔ اسی طرح پشتو میں اس کا حلقہ اثر بڑھانے میں پشاور یونیورسٹی (اسلامیہ کالج) کا کردار نمایاں ہے اور یوں ان اثرات کی بدولت پشتو شاعری کلاسیکی دور سے رومانیت کے دور میں داخل ہوئی۔ پشتو شاعری کا جائزہ لیا جائے تو کلاسیکل دور میں خوشحال خان خٹک کی شاعری میں رومانیت کے عناصر بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ دور جدید میں حمزہ شنواری اگر چہ مجموعی لحاظ سے کلاسیکی شاعر ہیں، لیکن رومانوی شاعری کا ایک جز فطرت نگاری ان کی شاعری میں زیادہ نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مضامین کی حد تک، اپنے انداز میں اسے جگہ دی، ان کی شاہکار نظم ''جونگڑہ'' (جھونپڑی) خالص رومانی نظم ہے۔ اجمل خٹک اگر چہ ترقی پسند شاعر ہیں، لیکن ان کے مضامین بالعموم رومانوی افکار کے آئینہ دار ہوتے ہیں، تاہم پشتو کے

رومانی شعراء میں غنی خان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ ان کی شاعری رومانویت کے تمام عناصر سے معمور ہے۔ان کی نظموں کی ہیئت بھی اپنا ہے اور مضامین بھی معنویت کے اعتبار سے رومانوی ہیں ۔علاوہ ازیں اشرف مفتون بھی پشتو شاعری میں رومانویت کی توانا آواز ہے۔ناقدین کے نزدیک پشتو ادب میں رومانوی تحریک کا دورِ عروج بیسویں صدی کے ربع چہارم تک نمایاں نظر آتا ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے اس دور کی نظمیں قدیم و جدید کا ایک حسین امتزاج ہیں۔ رومانویت کے علمبردار دوسرے شعراء میں سید رسول رسا، یونس خلیل اور عبدالرحیم مجذوب کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

1.3۔ جدید پشتو شاعری اور ترقی پسند تحریک

اس کے بعد جدید پشتو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر ترقی پسندانہ افکار کا رجحان پایا جاتا ہے اور ان افکار کا باقاعدہ ورود بیسوی صدی کے پانچویں عشرے میں ہمیں نظر آتا ہے کہ اس دوران پشاور میں 1947ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے باقاعدہ تنقیدی اجلاس ہونا شروع ہوئے۔ پشتو کے ترقی پسند ادیب اور شاعر صنوبر حسین مومند اس انجمن کے صوبائی صدر تھے۔ پشتو کے تمام ترقی پسند قلم کار، ان تنقیدی اجلاسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے رہے۔ بقول فارغ بخاری:

> ''ہمارے یہ اجلاس اتنے مشہور ہوئے کہ ان میں سرحد اسمبلی کے سپیکر ملک خدا بخش خان، عبدالرب خان نشتر، سرحد کے وزیرِ اعلیٰ عبدالقیوم خان بھی کبھی کبھی شرکت کے لیے آجاتے تھے اور برصغیر کی بڑی بڑی مشہور ادبی و سیاسی شخصیتوں فیض احمد فیض، مولانا حسرت موہانی، عبدالحمید عدم، چراغ حسن حسرت، تلوک چند محروم، سعادت حسن منٹو، مولانا تاجور نجیب آبادی نے ان نشستوں کی صدارت کی۔''

احمد ندیم قاسمی اس دوران ریڈیو پاکستان پشاور سے منسلک تھے، وہ بھی ان اجلاسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ رفتہ رفتہ ان تنقیدی اجلاسوں کا دائرہ کوہاٹ، نوشہرہ، بنوں، مردان اور ڈیرہ اسماعیل خان تک پھیلا اور وہاں اس انجمن کی باقاعدہ ذیلی شاخیں قائم ہوئیں۔ اس تحریک نے پشتو کے جدید ادب کو خاصا متاثر کیا اور پشتو کے ترقی پسند شعراء اور ادباء نے ''سماجی شعور''، ''سماجی ناانصافی'' اور ''جدلیاتی مادیت'' جیسی اصطلاحات پشتو ادب میں داخل کیں۔ اس تحریک نے پشتو ادب کو زندگی کے شانہ بشانہ چلنے، زندگی کے نشیب و فراز کو ادب کے ذریعے بیان کرنے اور اظہارِ خیال پر قدغن نہ ماننے کی جو مثال قائم کی، اس کا بھرپور عکس اس تحریک سے وابستہ پشتون شعراء کی شاعری میں نمایاں ہے۔ صنوبر حسین کاکاجی، اجمل خٹک اور

افضل بنگش براہ راست اس تحریک سے منسلک تھے، بعد میں سلیم راز بھی وابستہ ہوئے۔ اس تحریک سے وابستگی کے حوالے سے اجمل خٹک یوں بیان کرتے ہیں:

''ان ہی دنوں دہلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی معیت میں میرا ان سے رابطہ قائم ہوا۔ وہاں سے مجھے باقاعدہ لٹریچر بھیجا جانے لگا، جس کے مطالعے سے میری شاعری بھی، معاشرے کے تضادات اور محروم طبقات کی مظلومیت کی جانب متوجہ ہوئی۔ مجھے پشتو کی روایتی شاعری اور قومی آزادی کی شاعری میں ترقی پسندانہ رجحانات شامل کرنا پڑے''۔

علاوہ ازیں جن شعراء نے بلاواسطہ طور پر اس تحریک کے اثرات قبول کئے۔ ان میں قلندر مومند، ہمیش خلیل، ایوب صابر، ولی محمد طوفان اور مراد شنواری وغیرہ سرفہرست ہیں۔ انجمن کی سرگرمیوں پر پابندی لگنے کے بعد پشتون اہل قلم نے اولسی ادبی جرگہ (قیام 1951ء) کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی اور اس انجمن کا تسلسل قائم رکھا۔ پشتو ادب میں انیسویں صدی کے آغاز میں جدید رجحانات کا جو ورود شروع ہوا تھا۔ اس کا ارتقائی سفر 1951ء میں اس جرگے کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔ بقول ایوب صابر:

''یہ وہ دن تھے کہ آزادی سے پہلے کے اثرات مٹتے چلے جا رہے تھے اور پشتو ادب میں نئی آوازیں جنم لینے اور گونجنے لگی تھیں۔۔۔۔ پشتو ادب میں پہلے حب وطن کا جذبہ تو موجود تھا، مگر حب انسان کا جذبہ اس شدت سے موجود نہیں تھا، جس شدت سے ایک افضل انسانی معاشرہ میں موجود ہونا چاہیئے یا اگر موجود تھا تو خوشحال خان خٹک، رحمٰن بابا اور ایسے ہی چند دیگر بزرگوں کے افکار تک محدود تھا۔ اس جذبے کو تقویت پہنچانے کا سہرا بھی اولسی ادبی جرگہ کے سر ہی جاتا ہے۔ اس جذبے کی بدولت پشتون شعراء۔۔۔ ویت نام، الجزائز، کوریا، لاطینی امریکہ اور فلسطین وغیرہ کے مسائل کو بھی موضوع سخن بنانے لگے۔ یہ پشتو ادب میں جدید ترین اور ترقی پسندانہ رجحان تھا اور اس کو پھیلانے میں اس پود کے

شعراء پیش پیش تھے جو سمندر خان سمندر، امیر حمزہ خان شنواری، سید رسول رسا
اور فضل حق شیدا وغیرہ کے بعد منظر عام پر آئے۔''

ترقی پسندانہ افکار کی ایک جھلک بالترتیب اجمل خٹک اور ایوب صابر کے اشعار میں دیکھئے:

اجمل خٹک:

سیرتوں کا حسن لے کر آئے کچھ دنیا میں لوگ
کچھ جلو میں لے کے اپنی جنتیں پیدا ہوئے
آؤ! ان کچلے ہوئے لوگوں کو جنت بخش دیں
لے کے جو قسمت میں اپنی دوزخیں پیدا ہوئے

(اردو ترجمہ: خاطر غزنوی)

ایوب صابر:

داسے دنیا کے بہ زہ سنگہ اوسم
زہ بہ ترسو داسے بے ننگہ اوسم
داسے ژوندن بہ زہ ترسو تیروم
دا زیگر خون بہ زہ ترسو تیروم

ترجمہ: ایسی دنیا میں کیسے میں بے وقار زندگی گزاروں گا (جہاں اچھے حالات اور مساوات نہیں) میں کب تک اپنا خونِ جگر پیتا رہوں گا۔

دَ نادارو غم خواریٔ نہ بہ وا نہ وڑم
زہ قسم پہ کلکو ترُو د خیبر خورم

ترجمہ: ''میں خیبر کی مضبوط چٹانوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ناداروں کی غمگساری سے کبھی منہ نہیں موڑوں گا۔''

1.4۔ جدید پشتو غزل

پشتو غزل کی روایت آٹھویں صدی ہجری میں شروع ہوئی اور اکبر زمینداور نے اس کی داغ بیل ڈال دی۔ روشنیہ مکتبہ فکر سے وابستہ شعراء نے اسے روحانی اور صوفیانہ افکار عطا کیے۔ خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا نے اسے درجہ کمال تک

پہنچایا۔عبدالحمید مومند، اشرف خان ہجری، عبدالقادر خٹک، کاظم خان شیدا اور علی خان نے اس میں نئے موضوعات کا اضافہ کیا۔ بیسویں صدی میں حمزہ شنواری نے اس میں روایتی موضوعات نئے رنگ و انداز میں پیش کیے اور اس میں جدت و تنوع پیدا کیا۔ان کی غزلوں میں پشتون ثقافت کے خدوخال اجاگر کرنے کے علاوہ وحدت الوجود کا فلسفہ بڑی شدت سے بیان کیا گیا ہے۔

حمزہ شنواری کے بعد پشتو غزل کو متعدد شعراء نے انفرادی طور پر جدت و تنوع سے ہمکنار کیا اور رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور دوسری تحریکوں نے بھی اسے اپنے اپنے انداز میں متاثر کیا۔ جدید دور کی بیشتر غزلیں رومان اور حقیقت کا بہترین امتزاج ہیں لیکن پشتو کی جدید غزل زیادہ تر امیر حمزہ شنواری کی جدت فکر اور تکنیکی تنوع کی مرہون منت ہے۔اس لئے کہ بیسویں صدی کے اکثر شعراء نے ان کا اثر قبول کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بالکل منفرد اسلوب میں غزل کہنے والوں کی بھی کمی نہیں۔اشرف مفتون، سید رسول رسا اور عبدالرحیم مجذوب نے جدید مغربی اثرات کے زیر سایہ اور انگریزی ادب کے براہِ راست مطالعے کی وجہ سے پشتو غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا۔ایوب صابر، قلندر مومند اور اجمل خٹک نے اس کا ناطہ زمینی حقائق سے جوڑ کر ایک نئے اسلوب کا اضافہ کیا اور پشتو غزل میں بھوک اور افلاس جیسے انسانی مصائب زیر بحث لاکر اس میں مقصدیت پیدا کی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وطن سے محبت کا جذبہ بھی ان کی غزلیات کا اہم موضوع ہے۔قمر راہی اور فضل حق شیدا بھی اس نغمے کے ہم نوا ہیں۔سمندر خان سمندر نے عروضی شاعری کے زمرے میں غزل کے آہنگ میں تجربے کئے۔خاطر آفریدی، ناظر شنواری اور اکرام اللہ گران کے نام پشتو غزل میں بے ساختگی و برجستگی کے حوالے سے لئے جاسکتے ہیں۔یونس خلیل، صاحب زادہ فیضی اور علاقہ یوسف زئی کے متعدد شعراء رومانوی تحریک کے زیر اثر اپنی شاعرانہ بصیرت و صلاحیت کو بروئے کار لا رہے ہیں۔جدید پشتو غزل گو شعراء کے ناموں کی فہرست بہت طویل ہے۔چند مشہور غزل گو شعراء کی غزلوں سے منتخب اشعار کا نثر میں لفظی اردو ترجمہ ملاحظہ ہو، جس سے پشتو کی جدید غزل کے فکری معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''اے عشق تو خودبیں ہے اور میں پشتون ہوں
لہذا میں نے آنکھوں کو گداگری نہیں سکھائی''

''سوزِ دل، چشم پرنم اور زرد چہرہ
میرے پاس تمہاری یہ تین نشانیاں ہیں''

(حمزہ شنواری)

''نہ خود سے واقف نہ جہاں سے باخبر
پہنچا یہاں تک ہوں درماندہ درماندہ''
(پریشان خٹک)

''اپنی محبت کے مزار پر بغیر پوچھے بکھرتا ہوں
جب کبھی میری حسرتوں کے گلاب مرجھا جاتے ہیں''
(قمر راہی)

''قلندر کی جوانی مرگ کے علاج، موت
وہ تو اب آنے سے رہی، تو کب آئے گی''
(قلندر مومند)

''نیند کی طرح آکر آنکھوں میں سما جاؤ
میری زندگی ایک طویل شب جگا ہے''
(محمد اعظم اعظم)

''معصوم محبت جب شباب تک پہنچے گی
تو اس کے لیے بڑی مدت درکار ہو گی''
(طاہر کلاچوی)

1.5۔ جدید پشتو نظم

پشتو شاعری میں قدیم اصناف قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کا رواج تو کلاسیکی دور سے ہے، لیکن نظم کی جدید شکل بیسویں صدی کے اوائل ہی میں نمودار ہوئی۔ اسلم خان کمالی، راحت زاخیلی اور فضل محمود مخفی جدید نظم کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان ہی کی مساعی سے پشتو میں نظمِ جدید کا آغاز ہوا۔ ابتدا ہی سے نظم میں ہیئتی تجربے بھی شروع ہوئے اور موضوعاتی تنوع بھی نظر آیا۔ پابند نظم کی مختلف اشکال کے ساتھ ساتھ نظم معریٰ، آزاد نظم، حتیٰ کہ نثری نظم تک کے تجربے ہوئے۔ موضوع و معنویت کے حوالے سے جذبہ حریت پسندی، رومانویت اور ترقی پسند رجحانات پشتو کی جدید نظم میں ایک نئی صورت اور منفرد اسلوب میں سامنے آئے۔ نظم کی جن نئی اشکال کو جدید پشتو شاعری میں متعارف کرایا گیا۔ ان کی تفصیل ذیل میں بیان کی جاتی ہے۔

1.6۔ نظم معریٰ

پشتو ادب میں نظم معریٰ کا تجربہ کیا گیا، مگر اسے خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی، تاہم اس کی مثالیں پشتو ادب میں موجود ہیں۔ جن شاعروں نے اس صنف میں اظہار خیال کیا، ان میں سید رسول رسا، فضل حق شیدا، اشرف مفتون، یونس خلیل، اجمل خٹک، لطیف وھمی، محمد نواز طائر اور رشید علی خان دہقان کے نام قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں قمر راہی کا شعری مجموعہ ''سیرہ'' (کرن) بھی جدید معریٰ نظموں سے معمور ہے۔ نظم معریٰ کا ایک پشتو نمونہ مع اردو ترجمہ دیکھئے جس کا عنوان ہے ''دیو تصویر پہ لیدو'' (ایک تصویر کو دیکھ کر):

داخاموشہ نازنینہ	یہ خاموش ناز پرور
دَ سپو گمئ رنڑا اودہ دہ	چاند کی روشنی جو سو رہی ہے
پہ یو خوشی بیابان کے!!	ایسے ایک دشت میں جو کچھ بھی نہ ہو
کہ یو خوب دے راگیر شوے	یا تو اک خواب ہے یہ ایسا کہ
دَ حالا تو پہ ازغو کے	جھاڑیوں میں الجھ گیا ہو جو
کہ تصویر دَ ھغے خوگ دے	یا تو تصویر ہے اِک زخمی سی
چے بے نومہ بے سبب وی	ہاں وہ تصویر جو گمنام بھی ہو
کہ یو اوخکہ پہ بنڑو دہ	یا ہے اک قطرۂ اشک ایسا
بے حاصلہ انتظار کے	جو تک رہا ہے کسی کا رستہ
یا کہ عکس دَ تنھائی دے	یا تو تنہائی کی تصویر ہے یہ
دَ زوانئ پہ آئینہ کے	آئینۂ شباب میں ظاہر

(یونس خلیل)

1.7۔ آزاد نظم

پشتو میں آزاد نظم کو داخل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا، تاہم اس نے بطور خاص صنف سخن اپنے لیے ایک مقام پیدا کیا ہے۔ آزاد نظم کے حوالے سے روزنامہ ''بانگ حرم'' پشاور میں سال 1963ء اور اس کے بعد موافق اور مخالف مباحث کا جو

سلسلہ چلتا رہا۔اس نے پشتو ادب میں تنقیدی رجحان کو فروغ دیا۔آزاد نظم کے حامیوں میں مراد شنواری، لطیف وھمی، ایوب صابر، سلیم راز، پروفیسر محمد نواز طائر، میاں سید رسول رسا، ہاشم بابر، تقی شراب ہاشمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، جبکہ مخالفین میں محمد نواز خٹک، امیر حمزہ شنواری، پروفیسر رحمت اللہ درد، سعد اللہ جان برق اور عبدالرحیم مجذوب کے نام لیے جا سکتے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ آزاد نظم کو پشتو میں ایک صنف کے طور پر تسلیم کیا جاتا رہا ہے، مگر یہ فیصلہ ابھی باقی ہے کہ پشتو زبان میں آزاد نظم کا بانی کون ہے؟ اس اعزاز کے کئی ایک دعویدار ہیں، جن میں میاں سید رسول رسا، ارباب ہدایت اللہ، ایوب صابر اور امین اللہ خاموش خٹک شامل ہیں، مگر جو بات زیادہ قرین قیاس ہے، وہ یہ کہ ارباب ہدایت اللہ اور امین اللہ خاموش خٹک میں سے کوئی ایک اس اعزاز کا مستحق ہے۔ارباب ہدایت اللہ نے ''ستارے سے خطاب'' جبکہ امین اللہ خاموش خٹک نے ''برسات کی بارش'' کے عنوان سے آزاد نظمیں لکھیں۔سال کا صحیح تعین مشکل ہے، مگر یہ سال 1950ء یا اس کے بعد کا ہو سکتا ہے۔بہرحال سید رسول رسا، میجر یونس خلیل، ایوب صابر، محمد نواز طائر، سلیم راز، سلمیٰ شاہین اور عنایت اللہ ضیاء وغیرہ کی بعض آزاد نظمیں ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔خصوصاً ایوب صابر کی ''گمنام سپاہی'' اور ''ضمیر کی آواز'' بڑی معیاری نظمیں ہیں۔نوجوان لکھاریوں میں سیدہ حسینہ گل، افضل شوق اور پیر محمد کاروان کی نظمیں اسلوب کی انفرادیت اور موضوعاتی تنوع کے حوالے سے قابل ذکر ہیں۔محمد نواز طائر کی ایک آزاد نظم مع اردو ترجمہ ملاحظہ کیجیے جس سے پشتو آزاد نظم کے معیار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تا تہ مے خط لیکلو	تمہیں خط لکھنا چاہتا تھا
لا مے لیکلے نہ وَ	ابھی لکھا نہیں تھا
چہ دَ کاغذ د پاسہ	کہ کاغذ کے اُوپر
دوہ ملغلرے	دو موتی
دَ دوَو سترگونہ را پریوتلے	دونوں آنکھوں سے آ ٹپکے
ما وے بس دغہ بس دے	میں نے سوچا، بس یہی کافی ہے
ستا دغہ خط مے تا تہ دغہ شان درواستولو	تمہارا یہ خط تمہیں اسی طرح بھیج دیا
روستو مے سوچ کولو	بعد میں سوچا
چہ تۂ بہ سنگہ	کہ تم کیسے
ددے تش کاغذ پہ راز پوہ شے؟	اس خالی کاغذ کے راز کو پا سکو گے؟

1.8۔ سانٹ

پشتو شعراء نے سانٹ لکھنے کا بھی تجربہ کیا اور یہ تجربہ کامیاب بھی رہا، مگر اس کی مشق نہیں کی گئی لہٰذا یہ تجربہ محض ایک تجربہ ہی رہا، تاہم معروف شاعر ہاشم بابر نے اس میں باقاعدگی سے طبع آزمائی کی اور ان کے طبع شدہ شعری مجموعوں میں، اس کے متعدد نمونے ملتے ہیں۔ پشتو میں سانٹ لکھنے والے شعراء میں عبدالرحیم مجذوب، ڈاکٹر امین الحق امین اور سلیم راز شامل ہیں۔

1.9۔ ہائیکو

ہائیکو جو ایک جاپانی صنف ہے۔ اردو کے راستے پشتو میں در آئی اور شعراء نے اسے جدید پشتو شاعری کی ایک مقبول صنف بنایا۔ اس ضمن میں متعدد شعراء کے ہائیکو کے مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے ہیں، جن میں پروفیسر محمد نواز طائر کا ''خوبونہ پہ چپل کلی کے'' (خواب اپنے گاؤں میں)، اسماعیل گوہر کا ''مسکا'' (مسکراہٹ)، پروفیسر اظہار اللہ اظہار کا ''راتہ غوگونو کے بنگڑی شرنگوی'' (میرے کانوں میں چوڑیاں بجا رہی ہے) اور ناہید سحر کا ''حپلو خوبونو لہ تعبیر لٹوم'' (اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتی ہوں) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ قاسم محمود، رومان ساغر، غازی سیال اور ہمایوں صیاد بھی ہائیکو لکھتے ہیں۔ پشتو ہائیکو کا ایک نمونہ مع اردو ترجمہ دیکھئے:

غم ے لگ سپک شو
ما آئینے تہ کتل
زان رانہ ورک شو
(اظہار اللہ اظہار)

ترجمہ: دیکھیئے بے چہرگی کا معجزہ
آئینہ گم صم تھا، میں بھی کھو گیا
کچھ تو دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا

2- جدید پشتو شعراء

جن شعراء نے باقاعدہ طور پر فکر، ہیئت اور موضوعات کے اعتبار سے پشتو شاعری کو نیا رخ دیا۔ان میں سے چند کے فنِ سخن کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

2.1۔ سمندر خان سمندر

سمندر خان سمندر (1901ء - 1990ء) کو جدید پشتو شعری ادب میں عروضی مکتب کا بابا آدم تصور کیا جاتا ہے۔انھوں نے پشتو شعری ادب میں کئی ہزار اشعار کا اضافہ کیا۔شاعری کا آغاز نظم سے کیا۔تحریک آزادی کے دوران میں متعدد قومی، انقلابی اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں اور عوام میں جذبہ حریت موجزن کیا، چنانچہ قیام پاکستان کے بعد 1948ء میں انہیں ''ملک الشعراء'' کا خطاب دیا گیا۔وہ طویل نظمیں لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ان کا سب سے اہم ادبی، علمی اور مذہبی کارنامہ کلمہ طیبہ کی منظوم شرح ''دَ توحید ترنگ'' (زمزمہ توحید) ہے۔یہ دس جلدوں اور چونسٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے، جو پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہوا ہے، جبکہ ''دبلال بانگ'' (بانگِ بلال) ''دایلم سوکہ'' (ایلم کی چوٹی) اور ''دَقرآن ژڑا'' (قرآن کی فریاد) ان کی طویل نظمیں ہیں، جو الگ الگ کتابی صورت میں دستیاب ہیں۔سمندر خان سمندر جدید پشتو ادب کے وہ مینارۂ نور ہیں، جن کے کلام میں وہ زور بیاں' سلاست و شستگی اور فصاحت و بلاغت موجود ہے، جو فردوسی کی پرشکوہ شاعری کا خاصا ہے- ان کے آخری دور کی شاعری بالخصوص غزلیں جدت پسندی، مضمون آفرینی، منفرد اسلوب، مضامین، الفاظ کی مطابقت اور جذبات نگاری کی آئینہ دار ہیں۔

سمندر خان سمندر نے پشتو شاعری میں عروض کا باقاعدہ خیال رکھا اور اس کے لئے شعوری کوششیں کیں جن کے باعث، ان کی شاعری نے اگر ایک طرف تخیل وفکر کے لحاظ سے گہرائی کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے، تو دوسری طرف وزن و بحر کی پابندیوں نے اسے مشکل اور پیچیدہ بھی بنا دیا ہے۔انہوں نے علم عروض پر ایک کتاب ''ژور سمندر'' (گہرا سمندر) بھی لکھی۔ان کی نظموں کا مجموعہ ''لیت اولار'' (راستہ اور مشعل) کے نام سے شائع ہوا۔اس کے علاوہ انہوں نے اقبال کی دو کتابوں ''اسرار خودی'' اور ''رموز بے خودی'' کا پشتو میں منظوم ترجمہ بھی کیا۔انہیں حکومتِ پاکستان نے تمغہ امتیاز سے بھی نوازا۔ان کی ایک مصوّت نظم ''دَ خٹکو گڈا'' (خٹک رقص) کے ابتدائی حصے کا اردو منظوم ترجمہ ملاحظہ ہو۔یہ نظم اپنے مخصوص آہنگ اور ردم کے حوالے سے بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس نظم میں انہوں نے پشتونوں کے مشہور خٹک رقص کے

ساتھ موسیقی وآہنگ کو بھی مدنظر رکھا ہے اور ساتھ ہی پشتونوں کی غیرت، حمیت اور جلال کو بھی لفظوں کے سانچے میں اس انداز سے ڈھالا ہے کہ نظم نے شاہکار کی حیثیت حاصل کی ہے:

ددرنگ

ددرنگ، ددرنگ، ددرنگ

کانِ، جواہر

میں پشتون

میں سنگین ہوں درون پشتون
درون پشتون ہوں درون پشتون

درون پشتون ہوں درون پشتون
میں درُون، میں درون درون پشتون

درون پشتون ہوں درون پشتون
میں سنگین ہوں درون پشتون

زندہ خوں کی علامت ہوں
سرتاپا میں محنت ہوں

بڑھتا چلوں میں ہمت ہوں
ہمدم ہر دم قوت ہوں

گل ہوں گل کی نکہت ہوں
پیار ہوں، رحم ہوں، شفقت ہوں

میں ناموس ہوں عزّت ہوں
غمگینوں کی راحت ہوں

میں غیوّر ہوں غیرت ہوں
دُر دنیا کی زینت ہوں

دُنیا و دیں کی دولت ہوں
میں پرواز کی جرأت ہوں

اپنے در کی شوکت ہوں
ہر درماں کی نیّت ہوں

برق بلا کو آفت ہوں
معصُوموں کی رفاقت ہوں

شیرینی کو شربت ہوں
تلخ نوا کی شامت ہوں

اِک ملّت اِک اُمّت ہوں
اپنے خُدا کی رحمت ہوں

خوں کی حرارت ہوں پشتون

(ترجمہ: خاطر غزنوی)

2.2- امیر حمزہ خان شنواری

امیر حمزہ خان شنواری (1907ء-1994ء)، 1930ء تک اردو میں شاعری کرتے رہے، مگر اس کے بعد اپنے مرشد پیر عبدالستار شاہ کے حکم پر پشتو میں شعر کہنے لگے۔ انھوں نے جدید پشتو شعراء کی ذہنی وفکری تربیت اور جدید پشتو ادب کے ارتقائی سفر میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ادائیگی کے لحاظ سے ان کے کلام میں کلاسیکل رچاؤ کے ساتھ ساتھ جدیدیت بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کو قدیم دور کے اختتام اور جدید دور کے آغاز کے درمیان ایک پُل کی حیثیت حاصل ہے۔ وہ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ ان کی غزل متنوع خصوصیات کی حامل ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں اکبر زمینداور نے پشتو زبان وادب میں غزل کی جس روایت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس روایت کی تکمیل کا سہرا بابائے غزل امیر حمزہ شنواری کے سر بندھتا ہے۔ انہوں نے روایتی موضوعات نئے رنگ وانداز میں پیش کئے اور ان میں جدت وتنوع پیدا کیا۔ ان کی شاعری میں فنی پختگی اور شاعرانہ تلازمات کے بہترین التزام کے ساتھ ساتھ تصوف اور تغزل کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ چوں کہ وہ عملی صوفی بھی تھے اور علمی شخصیت بھی، اس لئے ان کے اشعار میں تصوف اور بالخصوص وحدت الوجود کا فلسفہ بڑی شدت سے بیان کیا گیا ہے:

حمزہ کہ شی حجاب دَ ماسوا دَ زڑہ نہ دور

کثرت عین وحدت دے پہ کثرت کے نشتہ ھیس

ترجمہ: ''اے حمزہ اگر ماسوا کا حجاب دل سے ہٹ جائے تو کثرت محض وحدت ہے۔
اس کے علاوہ کثرت میں کچھ بھی نہیں۔''

حمزہ وحدت چہ دَ خایست مے اولید

هلتہ خبر شُم چہ دَ چا یمہ زہ

ترجمہ: ''اے حمزہ! جب میں نے حسن کی وحدت دیکھ لی تب معلوم ہوا کہ میں کس کا ہوں۔''

ستا پہ نظر کے چہ بریښنا ځکاری

ستا پہ کګو کے پہ خندا یمہ

ترجمہ: ''تیری نظروں میں جو کوندوں کی لپک ہے۔ وہ تو میں تیری ہی آنکھوں کی پتلیوں میں ہنس رہا ہوں۔''

حمزہ شنواری نے اگر ایک طرف اپنی شاعری میں عشق حقیقی اور اخلاقیات کے مضامین بیان کئے ہیں، تو دوسری طرف انہوں نے پشتون اتحاد اور پشتون ثقافت کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔

سوچہ راغونڈ پہ یو مرکز یے نہ کڑم
هرے تپے تہ دَ جرگو سرہ زم

ترجمہ: ''جب تک پشتونوں کو ایک مرکز پر جمع نہ کرلوں۔ اس وقت تک ہر قبیلے کے پاس جرگے لے کر جاؤں گا۔''

حُسنہ تہ خود بین ئے زہ پشتون یمہ
ما نہ دہ خودلے گدا سترگو تہ

ترجمہ: ''اے حسن! تو خود بیں ہے اور میں پشتون ہوں۔ لہٰذا میں نے آنکھوں کو گداگری نہیں سکھائی ہے''

سروہ تہ دَ حسن او چنار زۂ د پختو یمہ
نہ کومہ ستا دَ قدقامت غلامی نہ کوم

ترجمہ: ''تم حسن میں شمشاد کے درخت کی مانند ہو اور میں پشتو کا چنار ہوں۔ لہٰذا میں تمہاری قد و قامت کی غلامی کبھی بھی نہیں کروں گا (یعنی اگر تم حسن میں بڑھ کر ہو تو میں ایک غیرت مند پشتون ہوں)''

حمزہ شنواری ایک طرف تو ایک مسلم الثبوت غزل گو شاعر ہیں اور غزل کے اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں، تو دوسری طرف ایک زبردست نظم گو شاعر بھی ہیں۔ مقفیٰ نظم گوئی میں حمزہ کے اعلیٰ معیار تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔ ان کی نظموں میں جامعیت بھی ہے اور تنوع بھی اور خوبصورت اور نادر تشبیہات کے استعمال کی خوبی بھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ان کی غزل میں جو فلسفیانہ رجحان ملتا ہے، وہ ان کی نظموں میں بھی ملتا ہے۔ انہی خوبیوں نے ان کی نظم کو ایک منفرد مقام بخشا ہے ویسے تو حمزہ نے ہر ایک نظم میں موضوع کا حق ادا کیا ہے، مگر اس کی بعض نظمیں مثلاً جونگڑہ (جھونپڑی) اور شپون او شپیلئ (گڈریا اور بانسری) شاہکار نظمیں ہیں۔

حمزہ شنواری کو پشتو کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو پر بھی مکمل دسترس حاصل تھی۔ اس لئے انہوں نے پشتو میں کئی منظوم تراجم بھی کئے، جن میں علامہ اقبال کے دو مجموعے ''ارمغان حجاز''، ''جاوید نامہ'' اور صبا اکبر آبادی کے اردو کلام ''چراغِ بہار'' کا منظوم پشتو ترجمہ ''دسپرلی ڈیوہ'' شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اپنے کلام کے بھی کئی مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں ''غزونے، پیروونے، یون، سلگئ، بھیر، سپرلے پہ آئینہ کے اور کلیات حمزہ (پانچ جلدوں میں) شامل ہیں۔ حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکرگی اور ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا ہے۔ ان کی ایک صوفیانہ غزل اور اس کا اردو منظوم ترجمہ دیکھئے:

زَم خپل زان تہ نامہ بریمہ پہ خپلہ
مبتدا دَ خپل خبریمہ پہ خپلہ
لہ گذارہ بے پروا اوبہ صفت یم
چے مرہم دَ خپل پرھر یمہ پہ خپلہ
خپل جوہرے آئینے دَ نسبت ورک کڑو
خائَ د اچے کوروکر یمہ پہ خپلہ
انتظار دَ ازل خوب دے، ترابدہ
شوہ خکارہ چے منتظریمہ پہ خپلہ
سپیلنی دَ زڑہ رقصان لرم لہ سوزہ
بد نظر لرے، مجمریمہ پہ خپلہ
د دنیا پہ خوب کے ورک یم پیدا خکارم
ہُم مقام او ہُم سفر یمہ پہ خپلہ
زہ حمزہ بہ ھسے وچ او پا مال خود یم
چے د تکیو تہ گودر یمہ پہ خپلہ

اردو منظوم ترجمہ

رواں ہوں اپنی طرف اور نامہ بر بھی میں
میں مبتدا بھی خود اپنا ہوں اور خبر بھی میں
میں پانیوں کی طرح بے نیاز ضرب رہا
کہ خود ہی زخم بھی مرہم بھی چارہ گر بھی میں
میں آپ جوہر گم کردہ آئینے کا ہوں
ہوں خود ہی محو نظارا بھی، بے بصر بھی میں
ازل کے خواب کو ہے انتظار صبح ابد

عیاں ہے یہ کہ رہا اپنا منتظر بھی میں
سپند دل مرا رقصاں ہے سوز الفت سے
بری نظر بھی ہوں میں، مجمر و اثر بھی میں
جہاں کے خواب میں گم ہوں مگر نہیں ہوں گم
میں آپ اپنی ہی منزل ہوں اور سفر بھی میں
سراب جاں بھی ہوں میں اور پائمال بھی آپ
تمام تشنہ لبوں کو ہوں رو د تر بھی میں
(ترجمہ: خاطر غزنوی)

2.3 - فضل حق شیدا اور سید رسول رسا

فضل حق شیدا اور سید رسول رسا جدید پشتو ادب کے دو ایسے نام ہیں جو مختلف حوالوں سے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ رہے۔ یہی قدرِ مشترک اُن کی جدید پشتو شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کا تذکرہ ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ پشاور میں ایڈورڈز کالج اور اسلامیہ کالج کے قیام سے پشتو کے جدید شعری ادب میں مغربی ادب کی مختلف ادبی تحریکات کے اثرات پڑنے شروع ہوئے۔ اسی پس منظر میں یہ دو نام، فضل حق شیدا (1910ء-1984ء)، جنہوں نے 1932ء میں اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی سے آرٹس میں گریجویشن کیا اور سید رسول رسا (1910ء- 1990ء)، جنہوں نے 1934ء میں اسلامیہ کالج پشاور سے بی۔ایس۔سی کی ڈگری لی، جدید پشتو شعری ادب کے سرخیل مانے جاتے ہیں۔ ان دونوں کا شمار ادب کے ان علمبردار شعراء میں ہوتا ہے، جنہوں نے جدید پشتو شاعری اور بالخصوص پشتو نظم میں نت نئے فنی تجربے کئے اور اس میں اسلوب، ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے جدت پیدا کی۔

فضل حق شیدا پشتو کے علاوہ فارسی اور اردو کے بھی شاعر تھے۔ 1932ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ جدید پشتو شاعری میں ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ انہوں نے غزل کی بجائے نظم پر توجہ دی اور اپنی نظموں میں ایسے مضامین اور موضوعات بیان کئے، جو فلسفہ کے بنیادی مسائل کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی شاعری خارجی رویوں کی عکاس بھی ہے اور داخلی جذبوں کی ترجمان بھی۔ خارجیت کے حوالے سے ترقی پسند رجحانات اور معاشرتی مسائل ان کی شاعری کا اہم موضوع ہیں، جبکہ داخلیت کے حوالے سے ان کا گہرا فلسفیانہ تفکر، ان کی شاعری کے رنگ

وآہنگ کو دوسرے شعراء کی شاعری سے ممتاز کرتا ہے۔ فضل محمود مخفی کے مقابلے میں انہوں نے جدید پشتو نظم کو بے پناہ وسعت دی اور نظم گوئی میں موضوعاتی عالمگیریت پیدا کی۔ انہوں نے اسلامی دنیا میں آزادی کی تحریکات کی حمایت میں بہت کچھ لکھا اور اسلامی قومیت کو اجاگر کیا۔ وہ علامہ اقبال سے بھی بے حد متاثر تھے۔ ان کی شاعری میں فطرت (Nature) اور جمالیات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''اسویلی'' (آہیں) کے نام سے طبع ہوا۔ اس کے علاوہ سید جمال الدین افغانی کا تذکرہ لکھا ہے اور عائشہ ملک کی کتاب کا ترجمہ ''سُرخ'' کے نام سے پشتو میں کیا ہے۔ ان کی ایک نظم ''خلافت'' کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

جس کے اردگرد ہم جمع ہوتے تھے
جس آگ کی تپش سے ہم سب گرم ہوتے تھے، وہ بجھ گئی ہے
اگرچہ بدن میں ہزاروں رگیں ہیں
مگر خون کی ایک ہی حرکت ہے جو شدت سے جاری ہے
دیکھتے نہیں کہ ہم جس شاخ پر بیٹھے تھے
اسے ہم نے خود اپنی ہی درانتی سے کاٹ دیا ہے
ہم نے اپنے گھر کا ایک ہی بزرگ رکھا تھا
جب یہ بزرگی ہم سے گئی تو ہمارا گھر اب مانند گور ہے
آخر ہم کس تنے کی شاخیں ہیں
یہ فقط کمال کے لئے نہیں ہم سب کے لئے طعنہ ہے
جب تنا کاٹ دوگے تو شاخیں سوکھ جائیں گی
جب دل کو ٹھیس پہنچے تو تمام بدن میں شور ہوتا ہے
یہ درخت کہاں پر کھڑا تھا
جس کا سایہ سارے جہاں میں پھیلا ہوا ہے

(ترجمہ: پردل خٹک)

سید رسول رسا نے 1938ء میں محکمہ تعلیم صوبہ سرحد میں بطور معلم اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ''خیبر میگزین'' اور ''نن

پرون" جیسے معروف ادبی مجلوں کے مدیر بھی رہے۔ وہ ایک رومانی شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے رومانی اندازِ فکر کی ترسیل اور ابلاغ کے لئے نظم کو ذریعہ اظہار بنایا اور غزل کے نازک اور لطیف مضامین کو بھی نظم میں سمویا۔ "خکلے فقیرہ" اور "ڈے تہ" ان کی شاہکار نظمیں ہیں۔ وہ زیادہ تر تفصیل پسندی اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہیں۔ پشتو شاعری کو عالمی اقدار سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی شاعری اعلی اور ارفع جذبوں کی ترجمان ہے۔ رومانیت اور جمالیاتی کیف وکم سے بھرپور شاعری ان کی بہترین شاعرانہ صلاحیتوں کی عکاس ہے۔ وہ علامہ اقبال کے فکر وفن کے شیدائی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری پر فکرِ اقبال کا رنگ غالب ہے۔ انھوں نے علامہ کے تتبع میں منظوم مکالمے بھی لکھے، عالمی ادب کا گہرا مطالعہ کیا، جدید ادبی رجحانات کو پشتو ادب میں منتقل کیا اور پشتو شاعری میں جدیدیت کے لئے راہ ہموار کی۔ وہ جدید پشتو شعری ادب کے حسین باغ کے بلبل ہزار داستان ہیں، جن کی مجموعی شاعری کا عمومی رنگ رومانی ہے۔

خوند پہ ژوند کے عشق پیدا کڑی کہ عشق نہ وی
ژوند بے نورہ، بے نمکہ، تور تور تم دے!
پہ ستم باندے نازانہ ستم او کڑہ
ستا ستم مگر معنیٰ کے لوئے کرم دے
د آسمان زڑہ ورنہ شین یواز ے نہ دے
دھر چا زڑہ ئے شین کڑے پہ ستم دے

ترجمہ: "زندگی کا لطف تو عشق کے ساتھ ہی ہے اگر عشق نہ ہو تو زندگی بے نمک، بے نور اور ظلمات سے بھی بدتر ہے۔ اپنے ستم پر ناز کرنے والے ستم پہ ستم کئے جا، تیرا ستم ہی اصل میں تیرا کرم ہے۔ اس کے ظلموں کے ساتھ صرف آسمان کا دل ہی نیلا نہیں ہے بلکہ ہر ایک دل اس کے ظلم وستم سے نیلا ہو گیا ہے۔"

فطرت کی تصویر کشی اور منظر کشی ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ وہ الفاظ کے ذریعے فطرت کے کسی منظر کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں، جس طرح ایک زندہ تصویر قاری کی نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ ان کے شعری مجموعے "دبیدیا گلونہ" (صحرائی پھول)، "نوے ترنگ" (نیا نغمہ)، "دقرآن پیغام" (قرآن کا پیغام) اور "باغ اوراغ" (باغ اور چمن) کے ناموں سے چھپ چکے ہیں۔

جدید پشتو شاعری میں آزاد نظم (Free Verse) بھی ان دو جدید شعراء کے ہاتھوں متعارف ہوئی۔ انہوں نے اس میں نت نئے تجربے کر کے ایک تحریک کی شکل میں اسے آگے بڑھایا، جس کے بعد دوسرے شعراء نے ان کی پیروی میں آزاد نظمیں لکھیں۔ سید رسول رسا کی ایک آزاد نظم "محبت عجیب چیز ہے" کا اردو ترجمہ دیکھئے:

"سجدہ وہ ہے
جو زندگی کو حرارت بخشے
سجدہ وہ ہے
جو محبت کی دہلیز پر کیا جائے
دل کے سکون کے ساتھ محبت کے سرور کی تمنا
جب آشکار ہو
تو سجدہ وہ ہوتا ہے"

پشتو ادب میں ان دونوں کی مثال ان مشعل برداروں (Torch Bearers) کی ہے، جن کی روشنی میں دیگر لوگ آتے رہے اور قافلہ بنتا گیا۔

2.4- عبدالغنی خان

غنی خان (1914ء-1996ء) صرف معروف اور منفرد شاعر ہی نہ تھے بلکہ مصوری اور مجسمہ سازی میں بھی ان کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے پشتو شاعری میں ایک نئے اور منفرد اسلوب کی طرح ڈالی۔ بحیثیت مجموعی ان کی شاعری حسن و جمال، فلسفہ وتفکر اور داخلی ووجدانی کیفیات کی شاعری ہے، جس سے ان کے رومانی مزاج کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان کی شاعری میں فکر کی رومانی وفلسفیانہ بوقلمونی، موضوع اور ہیئت کا تنوع اور جدیدیت کی رنگارنگی پوری طرح جلوہ گر ہے۔ کیف ومستی، شوخی ورندی، خمار وسرور، حسن وعشق کی رعنائیاں اور سچے جذبات کی درست ترجمانی ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ ان کی شاعری قدامت پرستی کے خلاف بغاوت ہی نہیں، ایک نئے انداز فکر کی نوید بھی ہے۔ ان کے رنگ سخن کے بارے میں ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک یوں رقم طراز ہیں:

" اپنے فن اور انداز کے لحاظ سے غنی خاں پشتو کا ایک ایسا شاعر ہے، جس نے خیال وفکر کا اپنا الگ مکتب قائم کیا۔ غنی خاں کے انداز میں خاص بات طنز کی شوخی ہے، مگر اس کا کلام ایک ایسی سنجیدگی کا حامل ہے، جس میں احساس اور درد

کی شدت ہے۔غنی خاں نے ہر چند کہ انگریزی ادب سے استفادہ کیا ہے، پھر
بھی اس نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ پشتو شعرا اپنے مزاج کے مطابق
اپنے ہی آہنگوں پر استوار ہو۔غنی خاں نے کلاسیکی رستہ یکسر بدل دیا اور لوک
آہنگوں یا عوامی شاعری کے ان میٹروں کو اپنایا جو چستی اور تیزی کے لحاظ سے
ساز کے لئے زورداری اور تندی رکھتے ہیں۔''

کلاسیکی رستہ بدلتے ہی وہ رومانوی فضا تخلیق کرنے میں بھی بڑے ماہر ہیں۔اپنے محبوب کے حسن وادا کو منعکس کرتے وقت اپنی داخلیت کا انکشاف بھی بڑے دلکش پیرائے میں کرتے ہیں اور ایک نئی دُنیا بسا لیتے ہیں۔اس ضمن میں اُن کے تین اشعار کا اردو منظوم ترجمہ دیکھئے:

خواب ہے وہ اک شاعر کا، ہر جامہ اس کا انسانی
ساز ہے دور دراز کا، لیکن سُر ہیں اس کے لافانی
پھول ہے وہ فردوس بریں کا، اس پر سایہ رحمانی
جسم ہے اس کا ناری، لیکن دل ہے اس کا نورانی
دل میں غنی کے رہتی ہے، اور خوابوں میں تخلیق ہوئی
غیرت میں ہے خاص پٹھانی، صورت اس کی ایرانی

(ترجمہ: خاطر غزنوی)

غنی خان بھی تحریک آزادی میں عملی طور پر شریک رہے اور قومی آزادی کی تحریکوں کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئے۔ان کی ولولہ انگیز اور شعلہ نوا نظموں نے محکوم قوم میں آزادی کی ایک نئی روح پھونک دی۔اس سلسلے میں ان کی ایک نظم ''وصیت'' کے یہ اشعار دیکھئے:

کہ خازے شنے مے پہ قبر وی ولاڑے — اگر میری قبر پر سبز خازے (مرقد کے پتھر) ایستادہ ہوں
کہ غلام مڑوم رازئ تو کڑئ پرے لاڑے — اور اگر میں غلام مر گیا ہوں، تو ان پر تھوکو
کہ پہ خپلو وینونہ وُم لمبید لے — اگر میں اپنے خون میں نہ نہاؤں
پہ مامہ پلیتوئ دَجمات غاڑے — تو میری لاش کی وجہ سے مسجد کے کنارے گندے نہ کر
چے قطرے قطرے مے فوج دَدشمن نہ کا — جب تک دشمن کی فوج کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤں

مورے ماپسے پہ کوم منخ بہ تہ ژاڑے   میری ماں! تم کس منہ سے میری موت پر آہ وفغاں کروگی؟

غنی خان نے زندگی کو قریب سے دیکھا اور اپنے گہرے مشاہدے سے جو تجربات اخذ کئے، انہیں اپنی شاعری میں انسانیت کی بھلائی کے لئے محفوظ کیا۔ ان کے پانچ شعری مجموعے "دپنجرے چغار" (1956ء)، "پلوشے" (1960ء)، "پانوس" (1978ء)، "دغنی کلیات" (1985ء) اور "دغنی لٹون" (1995ء) شائع ہوئے، جو ان کے مخصوص اسلوب کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ جدید فکر کے بھی آئینہ دار ہیں۔ غنی خان کا شمار بلاشبہ ان صاحبِ اسلوب شعراء میں ہوتا ہے جن کی تقلید ممکن نہیں۔

2.5- ایوب صابر

ایوب صابر (1922ء-1989ء) بھی جدید پشتو شاعری کے حوالے سے ایک معروف نام ہے۔ انہوں نے 1954ء تک اردو شاعری کو اظہار کا وسیلہ بنایا، لیکن اس کے بعد پشتو ہی میں شاعری کی۔ ذہنی اور فکری لحاظ سے ترقی پسند شاعر تھے، چنانچہ ان کی شاعری میں معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقے کے جذبات کی بہترین بازگشت اور انعکاس موجود ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں زندگی کے مسائل بیان کئے ہیں اور انسانی زندگی کو پورے نشیب وفراز کے ساتھ اپنی شاعری میں سمودیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں انسانی قدریں پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں اور انہی انسانی قدروں نے ان کی شاعری کو آفاقی حیثیت دے رکھی ہے۔ ان کے کلام میں جدت بھی ہے اور صداقت وروایت بھی اور روایت سے بغاوت بھی۔ اُن کا کلام پشتون ثقافت اور صاف گوئی کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے آزاد نظم کو بھی فروغ دیا اور ساتھ ہی اس میں نت نئے تجربے بھی کئے۔ ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ قومی اور وطنی شاعری پر مشتمل ہے۔ اپنی ایک آزاد نظم "نوے ساز نوے آواز" (نیا ساز، نئی آواز) میں اپنی وطن دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ملگرو! سہ غواڑئی لہ مانہ ؟

افسانہ کہ افسون؟

یارانو! سہ خوخوئی

غگ وکڑئی

غزل کہ تکل؟

خواخوگوسہ مودی پکارنن

حقیقت کہ تمثیل؟
ملگرو! ھرسہ ءلرم
ھرسہ! اوروے شمہ
یارانو! زہ دخپل قلم نیغے تیرے سوکے نہ
ھرسہ ویستلے شمہ
خواخوگو! ھرسہ درکولے شمہ
لیکلے شمہ
خوبس یو شرط دے یکے
اوھغہ دادے چہ ترسو د پاکستان دشمنان
خدائے شرمولی نہ وی
او دَ وطن دَپاک سرحدنہ لرے
مونگ تختولی نہ وی
یامونگ کے ھرسڑی پہ خپلے گرمے گرمے وینے
زان لمبولے نہ وی
زہ بہ ترھغہ وختہ پورے پہ خپل ھرغزل کے
ملگرو! مینہ دَ وطن زا یوم

ترجمہ: ''ساتھیو! مجھ سے کیا مانگ رہے ہو؟ افسانہ یا افسون۔ دوستو کیا چیز تمہیں پسند ہے؟ بولو! غزل یا نکل۔ دردمندو! آج تمہیں کیا چاہئے؟ حقیقت یا تمثیل۔ ساتھیو! میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔ ہر چیز بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہوں۔ یارو! میں اپنے قلم کی تیز نوک سے ہر چیز لکھ سکتا ہوں؟ دردمندو! ہر چیز دے سکتا ہوں، لکھ سکتا ہوں۔ بس اس میں صرف ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ جب تک پاکستان کے دشمنوں کو اللہ تعالی رسوانہ کردے اور ہم انہیں وطن کی پاک سرحدوں سے دور نہ بھگا دیں یا ہماری قوم کا ہر فرد اپنے گرم لہو سے غسل نہ کرے۔ دوستو! میں اس وقت تک اپنی غزل

میں وطن کی محبت بیان کرتا رہوں گا۔"

ایوب صابر کی غزلیں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ موضوعاتی اور فکری لحاظ سے بھی وسعت اور گہرائی کی آئینہ دار ہیں۔ سادگی اور منفرد لب و لہجے کے حوالے سے وہ ایک جداگانہ اسلوب کے مالک ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "زیگر خون" (جگر خون) کے نام سے دوبار طبع ہو چکا ہے۔

2.6- یونس خلیل

منفرد لب و لہجے کے شاعر میجر یونس خلیل (1927ء-2000ء) بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ وہ حسن و محبت کے پرستار ہیں اور یہی جھلک ان کی ساری شاعری میں جلوہ گر ہے۔ اس شیریں زباں شاعر کی شاعری رنگینی اور دلکشی کے ساتھ ساتھ معنی خیز بھی ہے اور مقصدی بھی۔ ان کے لفظوں سے رنگ ٹپکتے ہیں اور ان کے کلام میں خوشبو رقص کرتی ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب، الفاظ کی ترکیب و ترتیب اور تقدیم و تاخیر میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ ایک ماہر مرصع ساز کی طرح جواہرات کی بجائے ہاروں میں الفاظ پروتے ہیں۔ ان کا تخیل رنگین ہے۔ اس لئے ان کے مضامین دلنشین ہیں۔ خوابوں اور خیالوں کے جزیروں کے اس شاعر کی شاعری کا موضوعاتی اور فکری دائرہ وسیع ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ پاکستان بننے سے پہلے 1946ء میں "لالہ زار" کے نام سے شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "ساسکی" (قطرے) کے نام سے 1986ء میں اور تیسرا مجموعہ 2002ء میں "پس لہ ساسکو لالہ زار" (قطروں کے بعد لالہ زار) کے نام سے شائع ہوا۔ کلام کا کچھ حصہ 1971ء کے، ان دردناک اور سنگین حالات کی داستاں ہے، جو پاکستانی قوم کی زندگی میں ایک المیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود بھی سقوط ڈھاکہ کے موقع پر دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور بریلی شہر کے ایک جنگی کیمپ میں پابند سلاسل رہے۔ قید کے دوران میں انہیں جن ناہموار حالات کا سامنا کرنا پڑا، انہی کی وجہ سے ان کی حساس طبیعت پر دور رس اثرات مرتب ہوئے، جن کی وجہ سے ان کے کلام میں بعض جگہوں پر جارحانہ اور مزاحمتی رنگ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ مگر مجموعی طور پر ان کا کلام خوشبو، روشنی اور نغموں کا ایک حسین امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ نمونہ کلام مع اردو ترجمہ دیکھیے۔

صحیفہ دَ خوشحالئ ورتہ ژوندون شی — چے پوئے شوے سوک پہ ژبہ ستا دَغم وی
پہ کے پرخہ دَشفق درنگ الفاظ شی — تذکرہ چے ستا دمخ دصحدم وی
اوس نظر د مسیحا پہ مصلحت وی — طلبگارہ ئ زخمونہ د مرھم وی
اوس چے ویشہ ددربار پہ خوخہ کیگی — سئہ بہ برخہ دکتاب او دقلم وی
زندگی چے ورلہ تا خپلہ عطا کڑہ — سہ بہ فکر د یونس دزیات وکم وی

ترجمہ: ''ان کے لئے زندگی خوشی کا صحیفہ بن جاتا ہے، جو تیرے غم کی زبان جان لیتے ہیں۔ شبنم شفق کے رنگ کے الفاظ بن جاتے ہیں، جب تیرے چہرے کی صبح کا تذکرہ ہونے لگتا ہے۔اب مسیحا کی نظریں بھی مصلحت پر لگی رہتی ہیں، چنانچہ زخم مرہم کے طلبگار پڑے رہیں۔اب جبکہ حصوں کی تقسیم دربار کی مرضی سے ہوتی ہو، ظاہر ہے کہ اس تقسیم سے قلم و کتاب کو کیا حصہ ملے گا؟ جب تو نے اپنی زندگی اسے عطا کی، پھر یونس، کم وبیش کی کیا فکر کرے گا۔''

2.7- اشرف مفتون

اشرف مفتون (پ1922ء) پشتو کے جدید شعری ادب میں رومانیت پسند دبستان میں صف اول کے شاعر ہیں۔اسلامیہ کالج پشاور سے بی۔اے کرنے کے بعد تقریباً بائیس سال تک ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے۔ان کا پہلا مجموعہ کلام زمانہ طالب علمی ہی میں ''دشاعر دنیا'' (شاعر کی دنیا، مطبوعہ 1947ء) کے نام سے منظر عام پر آیا۔وہ حسن و جمال کے شاعر ہیں۔وہ اپنے تخیل کے بلند پروازی اور اپنے جذبات کا اظہار مخصوص پیرائے میں بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔یہ خاص انداز اور اسلوب ان کی شاعری میں جدت کا باعث ہے۔نہ صرف جمالیاتی تصور ان کے رومانوی احساس کا ایک واضح جز ہے بلکہ ان کے ہاں جمالیات کے بارے میں واضح تصور بھی ملتا ہے۔ان کے کلام میں رومانویت اپنے تمام تقاضوں سمیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔اس لئے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ رومانیت اس سے پہلے پشتو شاعری میں، اس صورت وشکل میں موجود نہیں تھی۔اُنھوں نے فلسفے کا بھی بھرپور اور عمیق مطالعہ کیا اور اس کی روشنی میں بقول سید رسول رسا:

> ''مفتون نے زندگی کا رومانی فلسفہ جس انداز میں پیش کیا ہے، یہ ایک بڑا شاعر ہی کر سکتا ہے۔وہ بڑا شاعر جس کا تخیل اپنا ہو، احساس اپنا ہو، مضمون اپنا ہو اور اظہار بھی اپنا ہو۔مستعار مضمون، مستعار تخیل اور مستعار احساس کا حاجت مند نہ ہو''

فن کے حوالے سے مفتون کا اپنا ایک نقطہ نظر ہے۔ان کے خیال میں فن آزاد، زندگی کا عکاس اور انسانیت کا علم بردار ہونا چاہیے، تا کہ یہ انسان کے دل میں محبت کی شمع جلا سکے، اس کی حس جمال کو بیدار کر سکے، اس کی خیالی دنیا کو رنگین اور حسین بنا سکے، اس میں حسن کی روح پھونک سکے، اس کی عقل وفکر کے اندھیروں میں دلیل کی شمع روشن کر سکے اور اس کی

زندگی کے رویوں کو فروغ دے سکے۔ اس لئے وہ اپنے جذبات کے اظہار اور الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں بڑے حقیقت پسند واقع ہوئے ہیں اور اپنے فن کے اظہار کے سلسلے میں کسی قسم کی منافقت برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کی شاعری میں شوخیوں عشوؤں، غمزوں، سر مستیوں، مے خانوں اور سحر انگیز اداؤں کی حکمرانی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوئے ہیں، جن میں ''د شاعر دنیا'' (شاعر کی دنیا) ''د ژوند سندرہ'' (زندگی کا گیت) ''سڑیکے'' (ٹھیسیں) ''کاواکے'' (کھوکھلا پن) ''لوخړے'' (دھوئیں) ''وگے'' (بادِنسیم) اور ''سکونڈارے'' (چٹکے) شامل ہیں۔ سکونڈارے (چٹکے) کے نام سے یہ تمام مجموعے کلیات کی شکل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ نمونہ کلام مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

زہ پہ دے دنیا کے ساقی، رنگین رومان غواړمہ ستا د شائست پہ شراب مخمور چشمان غواړمہ

زلفے پریشانے پہ دوش، مغرور جانان غواړمہ دا رنگ ژوندون غواړمہ، دَ ژوند سامان غواړمہ

محفل دَ عیش وعشرت، شائستہ جھان غواړمہ دا مے ارمان دے پہ زړہ دغہ ارمان غواړمہ

شہ مہربانہ ساقی، شہ مہربانہ ساقی

ترجمہ: ''اے ساقی میں اس دنیا میں رنگین رومان مانگتا ہوں۔ تیرے حسن کی شراب سے مخمور آنکھیں مانگتا ہوں۔ میں دوش پر زلفیں پریشان کرنے والا مغرور محبوب مانگتا ہوں۔ میں اس قسم کی زندگی چاہتا ہوں۔ میں اس زندگی کا سامان چاہتا ہوں۔ میں عیش وعشرت کی محفل مانگتا ہوں اور خوبصورت جہاں مانگتا ہوں۔ میرے دل میں یہی ارمان ہے اور اسی ارمان کو پورا ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، اے ساقی مجھ پر ذرا مہربان ہو جا، اے ساقی مجھ پر ذرا مہربان ہو جا۔''

2.8- اجمل خٹک

جدید پشتو شاعری کا ایک اور اہم نام اجمل خٹک (پ 1926ء) ہے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بطور معلم اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے بعد بطور اسکرپٹ رائٹر ریڈیو پاکستان پشاور سے وابستہ ہوئے۔ 1947-48ء کے دوران میں متعدد ادبی جریدوں کے مدیر رہے اور کالم نویسی بھی کی۔ انھوں نے جدید پشتو شعری ادب میں ایک نیا انداز اور معنوی اعتبار سے نظم کا ایک منفرد اسلوب بھی متعارف کرایا۔ گو کہ ان کی شاعری کی ابتداء غزل سے ہوئی تھی، مگر ان کی نظم بھی

اپنے اندر زندہ رہنے کا بھرپور احساس رکھتی ہے۔ بنیادی طور پر ترقی پسند اور حقیقت پسند شاعر ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب اور میر گل خان نصیر کے ہم سفر ہے۔ ان کی شاعری ترقی پسندانہ افکار کی غماز ضرور ہے لیکن اِنہوں نے اسے محض پروپیگنڈے کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ جمالیاتی اقدار اور فنی محاسن کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ عمومی طور پر ان کی شاعری میں انسانیت کی بھلائی کا پیغام بھی ہے اور روشن مستقبل کی نوید بھی اور اپنی تلخ زندگی کی واردات کی بازگشت بھی۔ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جدید پشتو شاعری میں ان کی شاعری اور بالخصوص ان کی نظموں کو ہمہ گیر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے کلام کا پہلا شعری مجموعہ ''دغیرت چغہ'' (غیرت کی پکار) 1958ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے دو اور شعری مجموعے ''گل پرہر'' اور ''گلونہ تکلونہ'' کے نام سے سامنے آئے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ تحقیق اور تنقید میں بھی نام کمایا۔ اسی طرح اردو شاعری بھی ان کی فکر کی رعنائی اور توانائی سے محروم نہیں رہی اور انہوں نے اردو شاعری کو بھی وسیلہ اظہار بنایا۔ اردو شعری مجموعہ ''جلاوطن کی شاعری'' کے نام سے زیورِ طبع سے آراستہ ہوا ہے۔ ان کی ایک نظم ''ملگرو'' (ساتھیوں) کا کچھ حصہ مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

ملگرو تاسو لہ شاعر خوگے غزلے . غواړئ — زما زړهٔ خوگ دے زهٔ تراخهٔ نظمونہ لیکم

تاسو دَ حسن دَ نخرو مستے بدلے غواړئ — زهٔ دَ جوندون دَ زړهٔ چاوَدون درانهٔ بارونہ لیکم

تاسو سندرو کے دَ سرو شونډو جامونہ غواړئ — زهٔ پہ شعرونو کے دَ خوگ زړگی زخمونہ چیړم

تاسو جوندون دَ چا بتانو دَ غمزو تابع کړو — زهٔ قربا نیگم دَ انسان دَ خوشحالئ پہ خاطر

تاسو خپلۀ روح دَ سپینے خاورے دَ ''پتلو'' تابع کړو — زه برباد خوځ یم دَ وطن د سو کالئ پہ خاطر

ترجمہ ''دوستو تم لوگ شاعر سے سریلی غزلوں کا تقاضا کرتے ہو، جب کہ میرا دل زخمی ہے۔ میں تلخی سے بھری ہوئی نظمیں لکھتا ہوں تم حسن وعشووں وغمزوں سے بھرے ہوئے گیت چاہتے ہو۔ میں زندگی کو دکھ دینے والے بھاری بوجھ کا تذکرہ چھیڑتا ہوں۔ تم گیتوں میں سرخ لبوں کے جام مانگتے ہو۔ میں اپنے اشعار میں دردمند دل کے زخموں کا ذکر کرتا ہوں۔ تم لوگوں نے زندگی کو بتوں کے غمزوں کے تابع کیا، مگر میں حضرتِ انسان کی خوشیوں کے لئے خود کو قربان کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگوں نے اپنی روح کو ''خاک سفید'' کے پتلوں کے تابع

کیا۔ میں خود برباد سہی، مگر میں اپنے وطن کی آبادی کے لئے خود کو وقف کرنا چاہتا ہوں۔''

2.9۔ قلندر مومند

قلندر مومند (1930ء-2003ء) بھی صف اول کے جدید پشتو شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر، ان کی لکھی ہوئی نظمیں معاشی عدم مساوات، معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کے دکھ درد اور مشکلات کی ترجمان ہیں۔ نظموں کے علاوہ ان کی غزلیں بھی اعلیٰ پائے کی ہیں۔ وہ غزل کے مزاج شناس تھے۔ اسلئے انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی اس کے صوری اور معنوی تقاضوں کا اہتمام کیا اور فنی لحاظ سے معیاری غزلیں لکھیں۔ ناقدین کے نزدیک ان کی اصل شاعری ان کی غزل میں ہے۔ موزوں تراکیب اور مناسب الفاظ کا انتخاب، صحیح مقام پر ان کا استعمال، فصاحت و بلاغت اور جذبات کی موثر اور فطری انداز میں ترجمانی ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ان کی شاعری میں زور بیان کی شدت بھی نمایاں ہے اور مزاحمتی رنگ بھی اور ساتھ ہی اس میں قوم پرستی، سیاست اور اشتراکی خیالات کا رجحان بھی ملتا ہے۔ ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پشتو ادب میں ترقی پسند شعراء کے ضمن میں اجمل خٹک کے بعد دوسرا نام قلندر مومند کا ہے۔ 1976ء میں پہلی بار ان کا شعری مجموعہ ''سباؤن'' منصۂ شہود پر آیا۔ نمونہ کلام مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

ے ریبار نیمہ قصہ وکڑی نیمہ خواخے لہ راشی ۔ ذارمان پہ سترو لارو وار خطا مخے لہ راشی

اوس خو ویمہ کہ راشی نوزڑ گے بہ ورتہ سپڑم ۔ اندیخنو! سئہ بہ کومہ کہ رشتیا مخے لہ راشی

لا دَمینے لہ اظھارہ وڑاندے نہ یم تلے شوے ۔ ستا پہ مخ چے حیا راشی نو حیا مخے لہ راشی

دپر کار پہ شانے گرزم سرگشتہ یم منزل نشتہ ۔ انتھا تہ چے رسیگم ابتدا مخے لہ راشی

ورکے مینے پسے گرزم دَ شپو ورزو تسلسل کے ۔ نن خورانغلہ کیدے شی چے سبا مخے لہ راشی

خپل نیمگڑے تشخص مے قلندرہ پہ ژڑا کڑی ۔ چے کامل پہ تصور کے پہ خندا مخے لہ راشی

ترجمہ: '' قاصد آدھی بات کہہ دیتا ہے اور مجھے راستے میں نامراد ملتا ہے اور حسرتوں کے تھکے ماندے راستوں پر اوسان خطا مجھے مل جاتا ہے۔ کہتا ہوں کہ اگر اب کی بار وہ آئے، تو میں اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھوں گا، مگر اے میری پریشانی اگر وہ واقعی آ جائے، تو میں کیا کہوں گا۔ ابھی تک تو میں محبت کے اظہار کے مرحلے سے آگے نہیں بڑھا۔ جب

تیرے گالوں پر حیا مچلنے لگتی ہے، تو مجھے حیا آجاتی ہے۔ میں پرکار کی مانند گردش میں رہتا ہوں، میں سرگرداں ہوں، مگر منزل نہیں ملتی، جب میں انتہا تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں، تو ابتدا سامنے آجاتی ہے۔ میں شب و روز کے تسلسل میں اپنی گم شدہ محبت کے پیچھے پھرتا ہوں، اگر آج وہ نہیں آئی تو شاید کل ہی آجائے گی۔ اے قلندر! مجھے اپنا ادھورا تشخص رلا دیتا ہے، جب خواب میں ہنستے ہوئے کامل آجاتے ہیں۔"

2.10- پریشان خٹک

پریشان خٹک (پ 1932ء) جدید پشتو شعری ادب کی ایک ہمہ گیر شخصیت ہیں۔ بنیادی طور پر نظم گو شاعر ہیں۔ جذبات نگاری اور جزئیات نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں واقعات نگاری اور منظر کشی کے حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ واقعاتی یا بیانیہ انداز ان کی نظموں کا خاصہ ہے۔ ایک واقعے سے متاثر ہوتے ہیں یا ایک تاریخی سانحہ ان کے دل کو ٹھیس پہنچاتا ہے اور پھر اس تاثر کو نظم کا جامہ پہناتے ہیں۔ ان کی نظموں کی سب سے بڑی خوبی وحدتِ تاثر کا قائم رکھنا ہے۔ وہ ایک قاری کو مزے مزے سے اپنے ساتھ لے لیتا ہے اور ایک خاص نقطے پر اسے پہنچا دیتا ہے، پھر اس عقدے کا حل اور اس کے نتائج قارئین پر چھوڑ جاتا ہے اور یہ نظم کے ایک شاعر کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں متعدد معاشرتی برائیوں اور خامیوں پر بڑی بے باکی سے طنز کی ہے۔ کلام میں عشق و محبت کے مضامین اور ہجر و وصال کی کیفیات بھی ملتی ہیں اور اپنے پیارے وطن سے بے پناہ اور والہانہ عقیدت کے گیت اور ترانے بھی۔ مجموعی طور پر ان کی شاعری اور بالخصوص نظمیں تاریخی، تنقیدی، اصلاحی اور رومانی رنگوں کے حسین امتزاج ہیں۔ ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت پاکستان کی طرف سے انہیں تمغہ امتیاز بھی مل چکا ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے "تنڑاکے" (آبلے) اور "ھغہ دوہ ملالے سترگے" (وہ دو نشیلی آنکھیں) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی نظم "سفر" کا ایک بند مع اردو ترجمہ ملاحظہ ہو:

ماتہ معلومہ دہ سہ ورزے چے پہ ما تیرے شوے
شیرینے تہ اوواپہ سہ رنگے پہ تا تیرے شوے
زہ درتہ سہ اووایم سومرہ پہ کڑان تیرے شورے
پہ سرو لمبو کے زما ورزے دھجران تیرے شوے
دَ اور سختے چے تیرگی زما پہ زان تیرے شوے

تا نہ بغیر پہ مالمحے د کربلا تیر ے شوے

شیر یئے تہ اووایہ سئہ رنگے پہ ما تیرے شوے

ترجمہ:- ''میں جانتاہوں کہ میرے دن کس مصیبت میں گزر گئے۔میرے پیارے محبوب! تو بتا! کہ تیرے دن کیسے گزر گئے؟ میں تجھے کیا بتاؤں کہ یہ دن مجھ پر کتنے گراں گزرے گویا کہ میرے دن ہجر کی آگ میں گزر گئے۔آگ کی سختیاں جس طرح بھی گزریں میرے جان پر گزر گئیں۔تیرے بغیر میرے لمحے گویا کربلا میں گزر گئے۔اے میرے محبوب! تو بتا! کہ تیرے بغیر میرے لمحے کیسے گزر گئے؟''

2.11- عبدالرحیم مجذوب

عبدالرحیم مجذوب (پ 1935ء) بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں اور اپنے کلام میں رومانی فلسفہ حیات کو دلکش اور لطیف پیرائے میں پیش کرنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔وہ ایک قادرالکلام شاعر،ایک ماہر فنکار، گہرے مطالعے کے مالک اور ایک صاحب دانش فرد ہیں۔وہ اپنے روشن تخیل اور منتخب کلام کی بدولت جدید پشتو شاعری میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے ذکر کے بغیر بیسویں صدی کے پشتو شعروادب کی تاریخ نامکمل تصور کی جائے گی۔شاعری کی ابتداءغزل سے کی،بعد میں نظم کی طرف مائل ہو گئے اور جلد ہی نظم گوئی میں مہارت حاصل کر کے صف اول کے نظم گوشعراء میں شامل ہو گئے۔تصویر کشی اور منظر نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔نظم کو جدید رجحانات اور اقدار سے روشناس کرانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔انہوں نے شیکسپئر کے ایک ڈرامے کا منظوم ترجمہ'' دمینے تندہ'' (محبت کی پیاس) کے نام سے کیا۔ان کے تین شعری مجموعے'' زیڑگلونہ'' (زرد پھول)، ''لعل اوکتی لعل'' (لعل اور کتی لعل) 1975ء میں اور'' دارالاوھام'' 1980ء میں شائع ہوئے۔ان کے علاوہ 1999ء میں کلیاتِ مجذوب چھپ کر منظر عام پر آیا۔ان کی ایک آزاد نظم'' دجدائی ورځ'' (جدائی کا دن) مع اردو ترجمہ دیکھئے:

زہ چے تانہ بیلیدلم ماجڑاکڑہ خوتاسئہ رنگہ بدلہ پہ خنداکڑہ

گوڈ کئی غوندے دناٹے شان سیزونہ رنگارنگ خکلی لعلونہ

تابے شمیرہ راتہ راوڑہ زماطبع دے خطاکڑہ،لاڑے پٹ شوے

اوبیارو رو ھیریدلے،ورزے شپے وے تیریدلے

اوس ھم کلہ پلو شے دنمر سحر دے پیغام راوڑی

یادگلو خواوشا کے چے نسیم دے وگمہ راوڑی

لکہ نمر نہ پلوشہ وی چے جلاشی

لکہ گل نہ چے وگمہ وی چے جلاشی

پہ مخ زی پہ فضا گانو کے تحلیل شی

زما ستا پہ جدائی باندے دلیل شی

ترجمہ:۔ ''میں جب تم سے جدا ہو رہا تھا تو میں رو رہا تھا مگر تم نے میرا رونا ہنسی میں بدل دیا۔تم نے میرے سامنے گڑیا کی طرح قسم قسم کے کھلونے رکھے،تم نے مجھے بے شمار چیزیں دے دیں،تم نے مجھے ورغلایا اور چھپ کر چلی گئی اور پھر میں تجھے آہستہ آہستہ بھولتا گیا اور شب و روز گزرتے گئے۔اب بھی جب کبھی سورج صبح کے وقت تیری یاد کی کرنیں لاتا ہے یا پھولوں کے آس پاس سے نسیم تیری خوشبو لے آتی ہے۔سورج نہیں بلکہ کرن سورج سے جدا ہو جاتی ہے، پھول نہیں بلکہ خوشبو کا جھونکا جدا ہو جاتا ہے، پھر آگے بڑھتی ہے اور فضاؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے اور میری تیری جدائی کی دلیل بن کر رہ جاتی ہے۔''

2.12- قمر راہی

قمر راہی (پ 1924ء) مردان کے محلّہ سدی خیل میں پیدا ہوئے۔وہ پشتو کے ایک بلند پایہ ادیب اور صاحب طرز شاعر تو ہیں ہی،لیکن ان کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے پشتو کی ادبی صحافت کے میدان میں ماہنامہ ''قند'' مردان کے مدیر کی حیثیت سے بھی خوب نام کمایا۔انھوں نے کم و بیش تمام شعری اور نثری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے،مگر ان کی شہرت اور شناخت کا بنیادی حوالہ شاعری ہے۔وہ نظم اور غزل دونوں پر یکساں دسترس رکھتے ہیں۔ہر دو شعری اصناف میں ان کی مخصوص طرز فکر کے ساتھ احساس کی نزاکت اور مترقی خیالات کی دلکش ترجمانی نمایاں ہوتی ہے۔زندگی کے ایک مثالی نظریئے کی تبلیغ ان کی شاعری کا مرکز و محور ہے۔حالات کی جبریت میں انسان کی کم مائیگی اور ناقدری کا احساس ان کے لہجے کو ایک حزینہ رنگ دیتا ہے، جب وہ اس نظریئے اور المیے کے پس منظر میں استعاراتی اسلوب کو اپناتے ہوئے احساس تنہائی کا اظہار

کرتے ہیں۔ ماضی کی بازیافت کی کاوش میں رومانیت کی حسین وادیوں کی طرف نکل پڑتے ہیں، تو ان کی شاعری کے ان رنگوں سے جدید پشتو ادب کا پورا منظر نامہ دمک اٹھتا ہے۔ بلاشبہ ان کی فکر انگیز شاعری ہم عصر شعراء کے لئے Source of Inspiration کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ ہر بڑے شاعر کی طرح نئی ترکیبیں وضع کرنے کے علاوہ انہوں نے لفظیات کے کچھ ایسے تجربے بھی کئے ہیں، جن کا تتبع اور استعمال پشتو کی جدید شاعری میں عام ہو گیا ہے۔ وہ اپنے موثر اسلوب کے ذریعے قاری کو بھی تخلیقی کرب میں شامل کر دیتے ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں ''سیرہ'' اور ''خلا'' کی معروضی حقائق سے مملو اور شاعرانہ صداقت کی حامل شاعری اس دعوے کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہے کہ یہ جدید پشتو شاعری کی ایک ایسی توانا آواز ہے، جس کے اسلوب، طرزِ فکر اور فنی تجربوں کی بازگشت ہم عصر شاعری میں نمایاں طور پر سنائی دیتی ہے۔ ان کی ایک معروف نظم'' پوہ شپہ، یو تاثر'' (ایک رات، ایک تاثر) مع اردو ترجمہ دیکھئے:

زما د ذهن په ورشو کے چه را و ټو کیګی	میرے ذہن کے چمن زار میں کسی کی یادیں
د چا یادونه وی ګل ګل ، شی خوشبوئے رانولی	پھول بن کے خوشبو بکھیرنے لگتی ہیں
زما دَ خیال پر پر کی وی ترے چاپیره چورلی	(تو) میرے خیالوں کی تتلیاں جیسے رقص کرتی ہوئی
په هر چکر کے دَ هر ګل نه لکه خوله چه اخلی	ہر چکر میں ان پھولوں کے بوسے لیتی ہیں
چرته یو ګل ئے زڼه ته پریوزی پرے لحظے له کینی	کسی ایک پھول کی گود میں ان کا ایک لمحہ ہوتا ہے (صرف ایک لمحہ)
خوسمستی ترے را وچت شی په چکر کے پریوزی	اور پھر لہراتی ہوئی اٹھ کر چکر میں پڑ جاتی ہیں
ما دَ وریزو په تخت کینوی هوامے یوسی	میں ہواؤں کے دوش پر بادلوں میں اڑنے لگتا ہوں
زه دَ فطرت په رنګینو کے سَم ورننوځم	اور فطرت کی رنگینیوں میں (گویا) تحلیل ہو جاتا ہوں
چه دنخترو په لوئے بنړ کے رانه لار خطا شی	جب چناروں کے گھنے جنگلوں میں بھٹک جاتا ہوں
د غرهٔ چینے او! ابشاروته راته عطر نولی	تو پہاڑی چشمے اور جھرنے مجھ پر عطر پاشی کرتے ہیں
زما دَ زړهٔ نازک تارونه نرے شرنګ شروع کړی	خاموشی کی ایک ان سنی لے صرف میری سماعتوں میں
په خواوشا کے دَ وادئ نه ترنم راخیږی	رس گھولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
د خاموشئ ځپل اوازونه وی یو زه ئے اورم	تنہائی کا احساس خوابوں میں کھو جاتا ہے
دَ تنهائی احساس اودهٔ شی دَ نغمو حصه شم	اور میں ہمہ تن نغمہ بن جاتا ہوں

چه دَ سمولو یو ټکار وی ټنگ ټکور غوندے شی	سموں کی ٹاپ سر اور تال میں نغمہ ریز ہوتی ہے
بورڑی بے غمه شان زلموټی په اَسونو گرزی	غم والم سے بے پروا نوخیز جوانیاں شہ سواری کے مزے لوٹتی ہیں
خپلے کمرے ته همه حسن ستا جمال یوسمه	میرا کمرہ اور تیرے حسن و جمال کی جلوہ سامانیوں کا تصور
لکه جنت چرته زما دَیوے شپے مسکن شی	ایسا لگتا ہے جیسے ایک رات میں نے جنت میں گزار دی
په دریچو کے پټه نیولے شی رانوزی	خوشبو کی لہر دریچوں میں سے جھجکتی ہوئی اندر آ کر
دَ زنگلی گلو و گے رانه طواف شروع کڑی	میرے گرد طواف کرنے لگتی ہے
د غه خکلا وی چه قطره قطره ئے زه وَ سکمه	اور میں ان تمام حسن کاریوں کا قطرہ قطرہ اپنے جسم میں اتار لیتا ہوں
داغم زپلے شانے روح مے پرے نشه نشه شی	میری غم زدہ روح نشے میں جھومنے لگتی ہے
دے چا پیر چل ته ور تر غاڑه وزم غلے شمه	اور میں گرد و پیش کی آغوش میں
زه دَ خوبونو جزیره کے تر سحره ورک یم	صبح تک خوابوں کے جزیرے میں گم ہو جاتا ہوں

(ترجمہ: ڈاکٹر محمد ہمایون ہما)

دیگر جدید شعراء میں مراد شنواری، لطیف وہمی، ہمیش خلیل، ناظر شنواری، رہنواز مائل، صاحبزادہ فیضی، سیف الرحمٰن سلیم اور ولی محمد طوفان نے جدید پشتو شاعری کو بہت کچھ دیا۔ اس کے بعد آنے والی پود کے شعراء میں ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، ڈاکٹر اسرار، شمس القمر اندیش اور سعد اللہ جان برق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

3- خود آزمائی

1- بیسویں صدی کی پشتو شاعری کے بدلتے ہوئے رجحانات پر بحث کیجئے!

2- سمندر خان سمندر کو جدید شاعر کہنا کہاں تک درست ہے؟ وضاحت کیجئے!

3- حمزہ شنواری کی شاعری کو قدیم وجدید رنگ کے درمیان ایک پُل کی حیثیت حاصل ہے۔ بحث کریں۔

4- حمزہ شنواری کی شاعری میں صوفیانہ پہلو خاصا نمایاں ہے۔ آپ اس قول سے کہاں تک متفق ہیں؟

5- غنی خان کے فن میں لہجے کی بڑی رنگارنگی اور بوقلمونی ملتی ہے۔ اس قول کی صداقت پر روشنی ڈالئے۔

6- فضل حق شیدا اور سید رسول رسا نے پشتو شاعری کو جن رجحانات سے آشنا کیا ہے۔ ان پر روشنی ڈالئے۔

7- پشتو شاعری میں ایوب صابر اور قلندر مومند کے مقام ومرتبے کا تعین کیجئے۔

8- ایک نظم گو کی حیثیت سے اجمل خٹک کا مقام متعین کیجئے۔

9- جدید پشتو شاعری کے حوالے سے اشرف مفتون، یونس خلیل، پریشان خٹک اور قمر راہی کی شاعری کا تجزیہ کیجئے۔
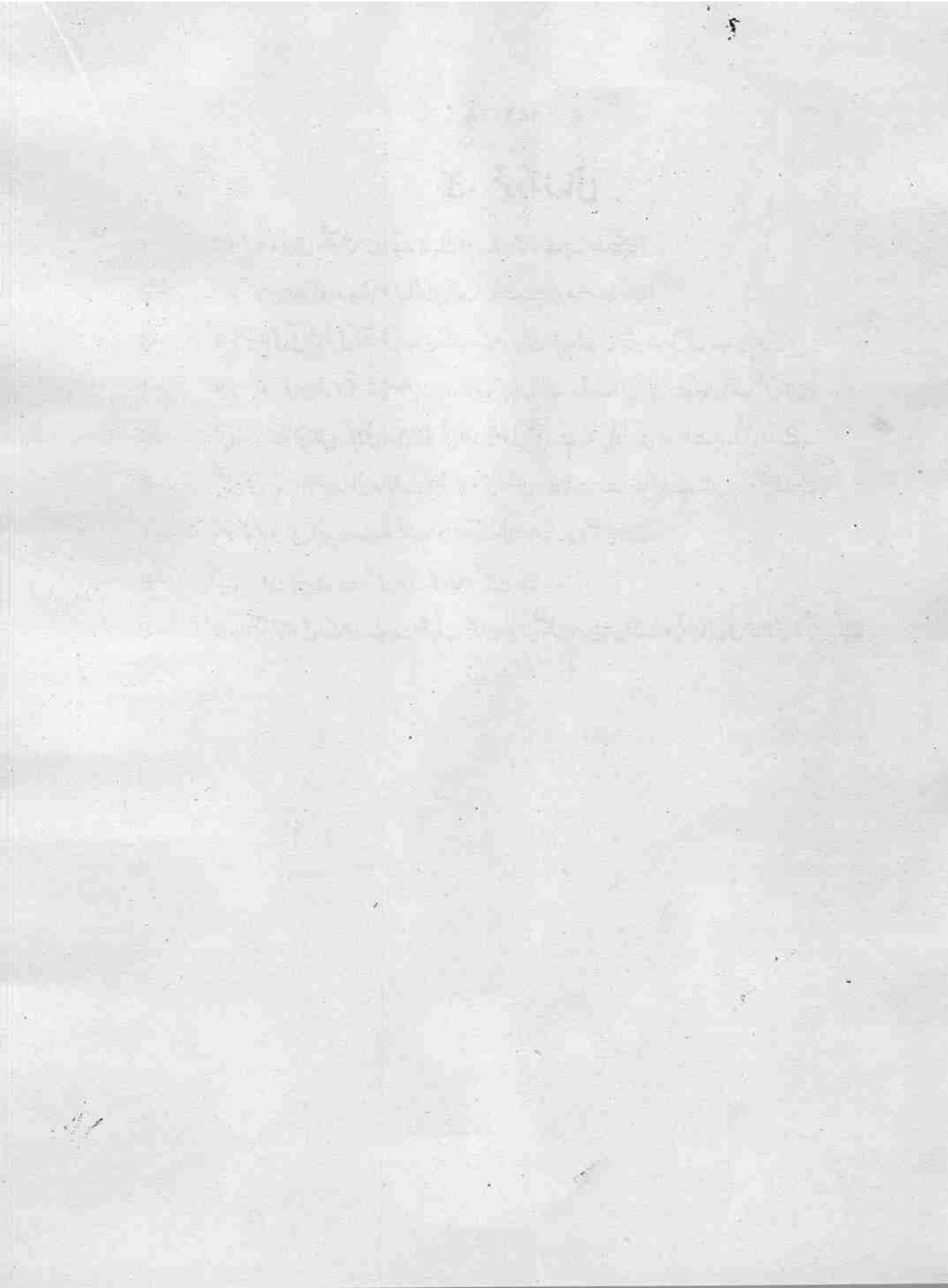
یونٹ نمبر 5

جدید نثری ادب
(پشتو)

تحریر : عبداللہ جان عابد
نظرثانی : ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات

اس یونٹ میں آپ جدید پشتو نثر کا مطالعہ کریں گے۔ جدید پشتو نثر کی ابتداء اس دور سے ہوتی ہے، جب انگریز افسروں نے پشتو سیکھنے کی کوششیں شروع کیں۔ ان انگریز افسروں کو جن اساتذہ نے پشتو پڑھائی اور سکھائی انہیں "منشی" کہا جاتا تھا، وہ پشتو کی جدید نثر کے بانی شمار کئے جاتے ہیں۔ اس یونٹ میں پشتو کی نثری اصناف ناول، افسانہ اور ڈرامہ کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں سفرنامہ، رپورتاژ، خاکہ نگاری، انشائیہ اور تحقیق و تنقید کا مطالعہ بھی اس یونٹ میں شامل ہے۔ آپ ان اصناف کے تاریخی ارتقاء، پشتو ادب میں ان کی اہمیت اور چند دیگر مباحث کا مطالعہ کریں گے۔ پاکستانی زبانوں کے ادب کا طالب علم ہونے کے ناتے آپ اس یونٹ اور آخر میں درج شدہ کتب کا بھرپور مطالعہ کیجئے۔

مقاصد

یونٹ اور مجوزہ کتابوں کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- جدید پشتو نثر کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔

2- جدید پشتو نثر کے ارتقاء میں مولوی احمد، منشی احمد جان اور میر احمد شاہ رضوانی کے کردار کے بارے میں جان سکیں۔

3- پشتو ناول، افسانے اور ڈرامے کے فنی ارتقاء پر اظہار خیال کر سکیں۔

4- ان اصناف کے اسلوب اور موضوعات پر بحث کر سکیں۔

5- جدید پشتو نثری ادب میں سفرنامہ، رپورتاژ، خاکہ نگاری، انشائیہ اور تحقیق و تنقید کی صورتحال پر روشنی ڈال سکیں۔
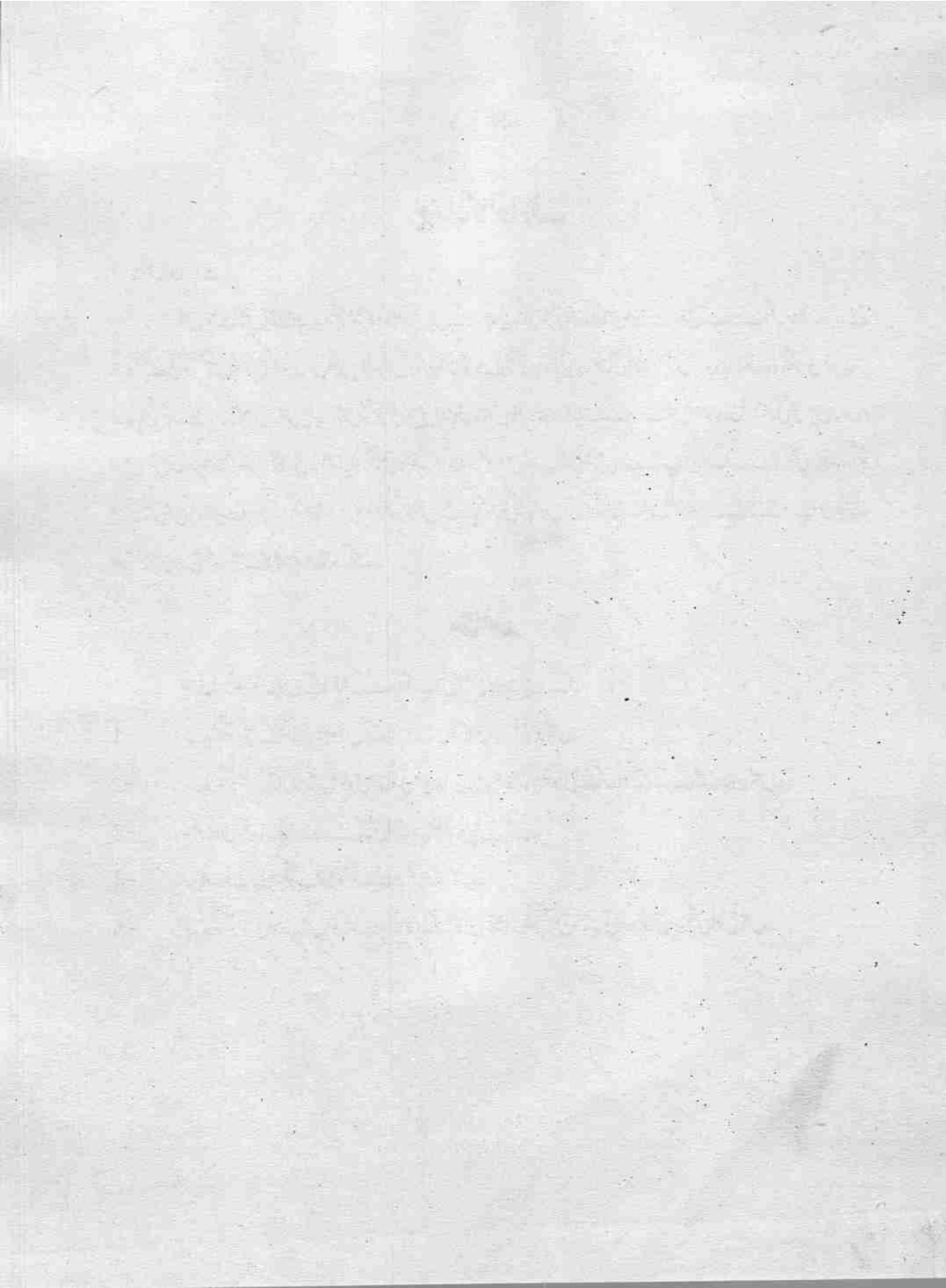
1- جدید پشتو نثر کا آغاز

جدید پشتو نثری ادب کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے، جب انگریز افسروں نے پشتو سیکھنے کی کوششیں کیں۔ان انگریز افسروں کو جن اساتذہ نے پشتو پڑھائی اور سکھائی، وہ پشتو کی جدید نثر کے بانی شمار کیے جاتے ہیں اور انہیں پشتو میں "منشی" کہا جاتا ہے۔اس سلسلے میں پہلے منشی مولوی احمد تنگی (1845ء - 1883ء) ہیں، جن کی کتاب "گنج پشتو" (جو 49 حکایات پر مشتمل ہے)، مشہور ہوئی۔ان کی باقی کتابیں "تاریخ سلطان محمود" اور "آدم درخانئ" بھی کافی شہرت رکھتی ہیں۔مولوی احمد کے بعد دوسری اہم شخصیت، جن کا شمار جدید پشتو نثر کے بانیوں میں ہوتا ہے، میر احمد شاہ رضوانی (1840ء - 1934ء) ہیں۔وہ پشتو، عربی، فارسی اور اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان سے بھی واقف تھے۔ان کی جو پشتو کتابیں جدید نثر کے سلسلے میں زیادہ مشہور ہوئیں، ان میں "بہارستانِ افغانی" (مطبوعہ 1898ء) اور "شکرستان افغانی" (مطبوعہ 1905ء) شامل ہیں۔یہ کتابیں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے پشتو کے تدریسی مقاصد کے لئے لکھی تھیں۔اس زمانے میں پشتو زبان وادب بحیثیت مضمون کے پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھی۔

اس سلسلے کی تیسری اور آخری اہم شخصیت کا نام منشی احمد جان (1882ء - 1951ء) ہیں۔یہ بھی انگریزوں کے استاد تھے۔انھوں نے انگریزی میں دو کتابیں "How to speak Pushto" اور Glossary of the "Ganj-i-Pushto" لکھیں۔پشتو نثر کے سلسلے میں ان کی جو کتابیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ان میں "هغه دغه" (اِدھر اُدھر کی باتیں) اور "دقیصه خوانئ گپ" (قصہ خوانی کی گپ شپ) شامل ہیں۔"دقیصه خوانئ گپ" میں مختلف مضامین شامل ہیں، جو زیادہ تر فولکلوری داستانوں سے ماخوذ ہیں۔ان مضامین میں دو مضامین "ریشتونے مینه" (سچی محبت) اور "دپشتون بدل" (پشتون کا انتقام) ایسے ہیں جنہیں پشتو افسانے کی ابتدائی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔

مولوی احمد تنگی اور مولوی میر احمد شاہ رضوانی کی نثر عام بول چال اور دیہاتی محاورے کے بالکل قریب ہے، مگر منشی احمد جان کی نثر محاورے اور ضرب الامثال کی چاشنی کے باعث پرکشش اور دلچسپ ہے۔علاوہ ازیں اس میں افسانوی تخیل کا رنگ بھی موجود ہے۔ان تین اکابرین کے علاوہ اس دور میں اور بھی کئی سادہ، عام فہم اور رواں نثر لکھنے والے ہمیں نظر آتے ہیں، ان میں راحت زاخیلی، ماسٹر عبدالکریم (1908ء - 1961ء)، دوست محمد کامل (1915ء - 1981ء)، عبدالحئ حبیبی اور قیام الدین خادم نے ادب لطیف میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، جب کہ میاں حسیب گل کاکاخیل اور میاں محمد یوسف کاکاخیل نے تراجم کے میدان میں کام کیا ہے۔جدید نثر نگاروں کے ان چند ابتدائی نثر پاروں کے بعد پشتو نثر میں مختلف اصناف سخن مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، سفرنامہ اور انشائیہ وغیرہ

شامل ہوئیں۔ ذیل میں پشتو نثر کی ان جدید اصناف کی الگ الگ تفصیل پیش کی جارہی ہے، تاکہ ان اصناف کے ارتقائی سفر کی وضاحت ہو سکے۔

2- ناول

سب سے پہلے میاں حبیب گل کاکاخیل (1825ء تا 1888ء) نے جدید پشتو ناول کے لئے زمین ہموار کی۔ انہوں نے 1876ء میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "مراۃ العروس" کا "نقش نگین" کے نام سے ترجمہ کیا۔ یہ رواں، سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے، جس پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ اس آزاد ترجمے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس ناول کا پلاٹ اور اس کے کردار خالص پشتون ماحول کی پیداوار محسوس ہوتے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ایک اور ناول "توبتہ النصوح" کو میاں محمد یوسف کاکاخیل نے پشتو میں ڈھالا اور یہ 1903ء میں شائع ہوا لیکن اس ترجمے کا معیار وہ نہیں ہے، جو "نقش نگین" کے ترجمے کا ہے، تاہم پشتو زبان وادب کا پہلا طبع زاد ناول سید راحت زاخیلی کا "قصہ ماہ رخ" یا "نتیجہ عشق" ہے، جو 1912ء میں لکھا گیا۔ اس کے بعد پشتو کا دوسرا ناول "بے تربیتہ زوئے" 1939ء میں لکھا گیا۔ یہ ناول افغانستان کے سابق صدر نور محمد ترکی مرحوم نے لکھا تھا، جو مجلّہ کابل میں قسط وار شائع ہوا۔ یہ ایک نظریاتی اور سیاسی ناول ہے، جو ناول کے فنی معیار پر پورا نہیں اترتا۔

فنی اور تکنیکی اعتبار سے پہلا مکمل ناول پروفیسر صاحبزادہ محمد ادریس نے "پیغلہ" (دوشیزہ) کے نام سے لکھا، جو 1950ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول بعد میں لکھے گئے پشتو ناولوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا۔ اس ناول میں فاضل مصنف نے پشتون معاشرے کی نوجوان نسل کا ایک خاکہ پیش کیا ہے، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید تعلیم سے آراستہ ایک نوجوان پٹھان اور پٹھانی (دوشیزہ) کا ثقافتی اور تہذیبی لحاظ سے کیا کردار ہونا چاہئے۔ (اس ناول کا اردو ترجمہ 1994ء میں "دوشیزہ" کے نام سے حیران خٹک نے کیا، جسے اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے شائع کیا)

"پیغلہ" (دوشیزہ) کے بعد غلام غوث خیبری نے، جن کا تعلق افغانستان سے ہے، 1956ء میں ایک ناول "د اور لمبے" (آگ کے شعلے) لکھا۔ یہ ایک نیم تاریخی ناول ہے، جس کا تعلق ان واقعات سے ہے، جو 42-1841ء میں صوبہ سرحد میں وقوع پذیر ہوئے۔

1957ء میں اشرف درانی نے "زرکے سترگے" (چکوری آنکھیں) کے نام سے ایک ناول لکھا، جس کا اردو ترجمہ "بنت الہوس" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ ایک رومانی ناول ہے، جو تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کے رومانی اور جذباتی تصورات پر ایک خوب صورت

طنزیہ ہے، لیکن اس کا پلاٹ فنی اور تکنیکی اعتبار سے کمزور ہے، اس لئے اسے ایک معیاری ناول نہیں کہا جا سکتا۔

پشتو ناول کی ارتقائی زنجیر کی ایک اور اہم کڑی امیر حمزہ شنواری کا لکھا ہوا ناول ''نوے چپے'' (نئی لہریں) ہے، جو 1957ء میں لکھا گیا۔ موضوع کے اعتبار سے یہ ایک نظریاتی اور سیاسی ناول ہے، کیونکہ اس کا مرکزی خیال حصول آزادی سے پہلے کے ان مسائل سے متعلق ہے، جن سے آنے والے وقت میں پشتونوں کا سیاسی مستقبل وابستہ تھا۔ تکنیکی اعتبار سے اس کا پلاٹ مضبوط ہے، لیکن دوسرے فنی اجزاء قدرے غیر متوازن ہیں، تاہم ان فنی خامیوں کے باوجود پشتو کے ابتدائی ناولوں میں اس کا اپنا ایک مقام ہے۔

سلطان محمد خان عرف ماٹو خان نے تین ناول لکھے، جن میں ''چاودے شیشہ'' (1962ء)، ''انتظار'' (1966ء) اور ''هیرے اوا یرے'' شامل ہیں۔

جدید پشتو نثر میں فکشن کے حوالے سے جو نام زیادہ ابھر کر سامنے آیا۔ وہ میاں سید رسول رسا کا ہے، جنہوں نے پانچ ناول لکھے، جن میں مفرور، شمی، مامونئ، خودکشی اور میخانہ شامل ہیں۔ ''مفرور'' 1963ء میں شائع ہوا، جس میں مفروروں کی زندگی کا خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ فنی لحاظ سے یہ ایک کمزور ناول ہے، جس میں محض ایک قصہ سادگی اور روانی سے بیان کیا گیا ہے۔ ''شمی'' میں بازار حسن کی ایک حسین اور نیک سیرت رقاصہ کے کردار کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں شمی کا کردار مرزا محمد ہادی رسوا کے کلاسیکی ناول ''امراؤ جان ادا'' کے کردار سے مشابہ ہے۔ ''مامونئ'' بھی ایک رومانی ناول ہے، جس کا مرکزی کردار مامونئ ہے۔ اس ناول میں ایرانی طرز معاشرت اور طرز زندگی کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ان کا چوتھا ناول ''خودکشی'' 1972ء میں شائع ہوا۔ بنیادی طور پر یہ ایک رومانی اور عشقیہ ناول ہے اور ناقدین کے نزدیک رسا کے ناولوں میں سب سے معیاری ہے۔ ان کا پانچواں اور آخری ناول ''میخانہ'' 1985ء میں شائع ہوا، جس میں کابل شہر کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ بھی فنی اور تکنیکی اعتبار سے ایک معیاری ناول تصور کیا جاتا ہے۔ ''کچکول'' کے نام سے ان کا ایک غیر مطبوعہ ناول بھی ان کی اولاد کے پاس موجود ہے۔

پشتو ناول نگاری کے ضمن میں نور محمد ترکی کا نام بھی اہم ہے، جن کے ناولوں میں سڑہ، دبنگ مسافری، بیپین، سنگسار اور موچی (ناولٹ) شامل ہیں۔ یہ تمام ناول مارکسی نظریات پر مبنی ہیں اور ترقی پسند سوچ سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں زندگی کے مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ ان ناولوں میں بعض مقامات پر معاشی تنگدستی کی بنیاد پر انسانیت کی تذلیل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

پشتو ناول نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر شیر زمان طائزے کو خاص امتیاز حاصل ہے، جنہوں نے پانچ ناول لکھے، جن میں ''گل خان، امانت، رحمان کورونہ، غونڈے او رواده اونہ شو'' (شادی نہ ہوئی) شامل ہیں۔ ان ناولوں میں مصنف نے جن موضوعات کو بیان کیا ہے، ان میں قبائلی علاقوں کی جغرافیائی، ثقافتی، تاریخی حالات اور مخصوص قبائلی طرز زندگی کے مختلف پہلو شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پشتون

سوسائٹی میں خواتین کی زیادتیاں اور غریبوں کی مظلومیت بھی ان ناولوں کے خاص موضوع ہیں۔ ان کا آخری ناول "وادہ ونہ شو" (شادی نہ ہوئی) 1997ء میں شائع ہوا، جسے سراغ رسانی کے موضوع پر عمدہ ناول سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے موضوعاتی تنوع کے ساتھ ساتھ تکنیکی تجربے بھی کیے ہیں۔

پشتو ناول نگاری کا ایک اور اہم نام محمد حسن خلیل کا ہے، جن کے پانچ ناول سیاست مہ کوہ (سیاست نہ کرو) فکر مہ کوہ (فکر نہ کرو)، اسرہ مہ کوہ (آسرا نہ کرو)، غم مہ کوہ (غم نہ کرو) اور "عکس" کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ تمام ناول 1997ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئے، جن میں برصغیر کی سیاسی اور سماجی صورتحال اور پشتون قوم کے کردار کو اجاگر کیا گیا ہے۔

1972ء میں ساغر آفریدی نے "نوے کول" کے نام سے ایک ناول لکھا، جس میں مغرب زدہ نوجوان نسل کے تعلیم یافتہ طبقے کی عادات واطوار کا خاکہ کھینچا گیا ہے، یہ ناول فنی لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل نہیں۔ دیگر اہم ناولوں میں رحیم شاہ رحیم کا "راجکنڑہ"، (مطبوعہ 1989ء) اور "بی بی مبارکہ" (مطبوعہ 1991ء)، (یہ دونوں تاریخی ناول ہیں) میجر نواز کا "شوم" (مطبوعہ 1965ء)، ش۔م شیر کا "لوظ" (مطبوعہ 1966ء)، غلام حبیب افغانی کا "شاپیری" اور "مینہ او فرض" (مطبوعہ 1976ء)، عبدالناصر زخمی کا "وڑہ بی بی" (مطبوعہ 1977ء)، محمد ابراہیم عطائی کا "دآسیا پہ زڑہ کے طوفان" (مطبوعہ 1980ء)، میاں مکمل شاہ کا "ژوندیٔ مینہ" (مطبوعہ 1980ء)، اسیر منگل کا "ترلہ" (مطبوعہ 1986ء)، بشیر دودیال کا "دمینے ڈالئی، (مطبوعہ 1987ء) مصطفیٰ جہاد کا 'تخت غمے" (مطبوعہ 1950ء)، محمد ابراہیم شبنم کا "اجڑہ" (مطبوعہ 1994ء)، پائندہ محمد خان کا "دشت لوط مسافر" (مطبوعہ 1996ء)، سلمٰی شاہین کا "کہ رنڑا شوہ" (مطبوعہ 1998ء)، غازی سیال کا "بنڑے" اور محمد اعظم ملازئی کا "شاہین" شامل ہیں۔

3- افسانہ

پشتو افسانے کی فکری اور معنوی تفہیم کے ضمن میں، اسے دو ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک آزادی سے پہلے کا اور دوسرا آزادی کے بعد کا۔

3.1۔ آزادی سے پہلے کا دور

پہلا پشتو افسانہ مجلّہ "افغان" پشاور میں 1917ء میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا "کونڈہ جینئ" (بیوہ لڑکی) اور افسانہ نگار تھے سید راحت زاخیلی۔ ناقدین کے نزدیک اس کا مزاج اردو افسانے "بڑے گھرانے کی بیٹی" کے مزاج سے قریب تر ہے۔ ان کا دوسرا افسانہ "شلید لے پنڑہ" (پھٹا ہوا جوتا) 1918ء میں منظر عام پر آیا جو ماخوذ افسانہ تھا۔ سید راحت زاخیلی کو پشتو زبان وادب کا پہلا باقاعدہ افسانہ

نگار تسلیم کیا جاتا ہے اور پشتو افسانوی ادب میں ان کا وہی مقام ہے، جو معاصر اردو ادب میں راشد الخیری اور مولوی نذیر احمد کا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعی رنگ اصلاحی ہے۔ اس کے بعد تحریک آزادی کے زیر اثر پشتو میں کئی مجلّے شائع ہوئے، جن میں 1924ء میں مجلّہ ''سرحد'' پشاور، 1926ء میں مجلّہ ''افغان'' مردان اور 1928ء میں مجلّہ ''پختون'' پشاور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان رسائل کے ذریعے پشتو افسانے نے ارتقاء کے مختلف مراحل طے کئے۔

سید راحت زاخیلی کے بعد میاں آزاد گل نے ''دمڑی پیغام'' (مردے کا پیغام) کے نام سے ایک افسانہ لکھا، جو اگست 1926ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک اصلاحی افسانہ تھا، جس میں پشتونوں کی بعض غلط رسوم پر طنز کی گئی تھی۔ اس کے بعد سر بلند خان رئیس بدرشی نے ''دَ نواب صیب آشنائی'' (نواب صاحب کی دوستی) کے نام سے ایک افسانہ لکھا، جو دسمبر 1926ء میں شائع ہوا۔ یہ ایک مقصدی افسانہ تھا اور کردار نگاری کے حوالے سے بھی اسے ایک بہترین افسانہ قرار دیا جاتا ہے۔ یہ افسانہ پشتو کے دوسرے افسانوں کی طرح اردو افسانے کے زیر اثر لکھا گیا تھا، جو ایک مضبوط پلاٹ پر مبنی تھا۔ اس افسانے کو پشتو افسانے کی ارتقائی زنجیر کی ایک مضبوط کڑی کی حیثیت بھی حاصل ہے۔

پشتو افسانہ نگاری کے حوالے سے ایک اہم اور مستند نام ماسٹر عبدالکریم ہے، جنہوں نے 1930ء اور 1955ء کے درمیانی عرصہ میں متعدد افسانے لکھے، جن کے موضوعات کا تعلق زیادہ تر روزمرہ زندگی کے مسائل سے ہے۔ مجموعی طور پر یہ افسانے معیار کے اعتبار سے اپنے عہد کے افسانوں کے معیار سے اونچے درجے کے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''جولئی گلونہ'' (جھولی بھر پھول) کے نام سے 1955ء میں شائع ہوا۔ معنویت کے اعتبار سے اس مجموعے کے افسانوں کا شمار ماحولیاتی اور تاثراتی افسانوں میں ہوتا ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ان افسانوں پر انشائیے کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

اس کے بعد نادر خان بزمی نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا اور کئی بہترین افسانے تحریر کئے، جن میں ''عارفہ'' ''مفرور''، ''مہربانی'' اور ''دمور قاتل'' (ماں کا قاتل) نامی افسانے کردار نگاری کے حوالے سے بہترین افسانے شمار کئے جاتے ہیں۔ بالخصوص ''مہربانی'' ''ترقی پسند سوچ کا نمائندہ افسانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا بہترین نمونہ بھی ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''پلوشے'' (کرنیں) کے نام سے طبع ہوا، جو پشتو افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔

اس دور کے دیگر نمائندہ افسانوں میں عزیز الرحمٰن عزیز کا ''شیخ خلیل''، محترمہ سیدہ بشریٰ بیگم کا ''پہ قام مینہ جہاں آرا'' محمد اکرم فاروق شنواری کا ''زما ژوند'' (میری زندگی) میاں سید رسول رسا کا ''دما بنڑ شپو نکے'' امیر حمزہ خان شنواری کا ''میراثہ''، صاحب زادہ عبدالحمید کا ''بے غمہ''، مراد شنواری کا ''دا باسین پہ غاڑہ'' (اباسین کے کنارے) شمس الدین مفلس کے افسانے رقاصہ، ناپوھی اور ڈمہ اور بیگم فاروق

احمد کا افسانہ ''بہادرہ پشتنہ'' شامل ہیں۔

اس دور کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر تحریک آزادی، پشتون سوسائٹی کے خدوخال اور ترقی پسند تحریک کے زیراثر (بالخصوص منشی پریم چند اور ٹالسٹائی کے زیراثر) طبقاتی کشمکش اور مظلوم طبقے کے مسائل پر مبنی ہیں۔ مجموعی طور پر پشتو کے ان ابتدائی افسانوں کا رنگ خالص اصلاحی اور تعمیری ہے۔ ان میں ''تصویرِ حیات'' کے ساتھ ساتھ ''تنقیدِ حیات'' کا رنگ موجود ہے، بلکہ نمایاں بھی۔ اس دور کے آخر میں (یعنی 1946ء کے لگ بھگ) لکھے گئے اکثر افسانوں کے طرزِ تحریر اور لہجے میں جدیدیت کا عنصر غالب ہے اور پشتو افسانہ جدید دور کی جانب رواں نظر آتا ہے۔

یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نہ صرف پشتو افسانے کی ابتداء بلکہ مجموعی طور پر جدید پشتو ادب کی ابتداء، بیسویں صدی کے اوائل میں ان سیاسی تحریکوں کے ردِعمل کا نتیجہ ہے، جو مختلف سطحوں پر حصول آزادی کے لئے چل رہی تھیں۔

3.2- آزادی کے بعد کا دور

آزادی سے پہلے پشتو افسانہ اردو افسانے سے متاثر تھا، لیکن آزادی کے بعد پشتو افسانے نے براہِ راست انگریزی ادب سے استفادہ کیا۔ 1947ء کے بعد پشتو افسانے نے فنی شعور اور پختگی کے حوالے سے کافی ترقی کی اور کئی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے افسانوی ادب کی ہمسری کے قابل ہوگیا۔ اس دور کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر عوامی اور سماجی زندگی کے مسائل سے متعلق ہیں نیز ان میں سیاسی اور معاشی مسائل کو بھی موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس دور کو پشتو افسانے کا ''شعوری دور'' بھی کہتے ہیں۔ اس دور میں اولسی ادبی جرگہ (قیام 1951ء) کے تنقیدی اجلاسوں نے پشتو افسانے کو فنی پختگی عطا کی۔ اس جرگہ میں پشتو زبان وادب کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ادبی دانشور شریک ہوتے تھے، جو اپنے وقت کے بہترین ادبی سرخیل بھی تھے، جن میں امیر حمزہ خان شنواری، کاکا جی صنوبر حسین، دوست محمد کامل، قلندر مومند، ایاز داؤدزے اور ہمیش خلیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آزادی کے بعد سید میر مہدی شاہ مہدی باقاعدہ ایک افسانہ نگار کے روپ میں ابھر کر سامنے آئے اور 1956ء کے لگ بھگ ان کے افسانوں کے چار مجموعے ''نشان''، ''دبوڈی ٹال''، ''پت'' اور ''لالہ گلونہ'' شائع ہوئے، جن میں سماجی الجھاؤ، طبقاتی تفاوت اور معاشرتی ومعاشی ناہمواریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان افسانوں کے کردار ہموار اور لچکدار ہیں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان مجموعوں کے ہر افسانے کا انجام المیہ ہے، ان کے افسانوں میں پشتونوں کے سیاسی کارنامے اور خصوصی طور پر خدائی خدمتگار تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔

1958ء میں قلندر مومند کے افسانوں کا مجموعہ ''گجرے'' کے نام سے چھپا، جس کے تمام افسانے معنوی اعتبار سے

ماحولیاتی ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے کردار موثر ہیں اور پلاٹ بھی کافی مضبوط ہیں۔ ان افسانوں میں زندگی کے ایک معمولی سے واقعہ کو معاشرتی اور نفسیاتی الجھاؤ کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے اور ہر افسانہ کلائمیکس پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ ان کے افسانے معاشی وطبقاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ سیاسی پس منظر بھی رکھتے ہیں۔

1963ء میں اشراف حسین احمد کے افسانوں کے دو مجموعے ''شندی گل'' اور مورے ششتے'' کے نام سے چھپے۔ وہ افسانے کے فن پر خاصی دسترس رکھتے ہیں اور نئے دور کے افسانہ نگاروں کی صف اول میں شامل ہیں۔ مجموعی طور پر ان کے افسانے ترقی پسند سوچ کے زیر اثر واقعہ نگاری اور حقیقت پسندی پر مبنی ہیں۔ ان کی فکر پر سعادت حسن منٹو، کرشن چندر اور ممتاز مفتی کی واقعہ نگاری اور حقیقت پسندی کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر جنسی مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔

اشراف حسین احمد کے بعد گل افضل خان کے افسانوں کے دو مجموعے'' کگے لارے'' (ٹیڑھے راستے) اور'' داغونہ'' (دھبے) کے ناموں سے چھپے، جن میں پشتون سوسائٹی کا دیہاتی ماحول اور ان لوگوں کا مخصوص کردار اور طرز عمل جلوہ گر ہے۔ ان افسانوں کا عمومی رنگ عوامی اور اصلاحی ہے۔ فاضل افسانہ نگار نے زندگی کے معمولات کا تذکرہ نہایت ہی سادہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ''ڈولئی'' اور ''خدائے دے اوبخہ'' طبقاتی مسائل پر مبنی افسانے ہیں۔

1973ء میں ہمیش خلیل کے افسانوں کا مجموعہ'' چارگل'' طبع ہو کر سامنے آیا، جن کے افسانے معنویت کے اعتبار سے نظریاتی وسیاسی ہیں، ان پر مقصدیت اور جذباتیت کا رنگ غالب ہے۔ اس لئے ان میں جگہ جگہ وحدت تاثر ٹوٹتا نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے ان کے کردار نقطۂ عروج تک پہنچنے سے پہلے ہی کمزور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے، جو تقریباً سارے مقصدی اور نظریاتی لکھاریوں کے افسانوں میں موجود ہے، تاہم اس مجموعے میں کردار نگاری کے حوالے سے چند بہترین افسانے بھی شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کو ہم ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔

زیتون بانو خواتین لکھاریوں میں ایک باشعور اور باقاعدہ قلمکار ہیں، جن کے افسانوں کے چار مجموعے ہنداره (آئینہ)، مات بنگڑی (ٹوٹی ہوئی چوڑیاں)، ژوندی غمونہ (زندہ دکھ) اور خوبونہ (نیندیں) شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں عورتوں کے حقوق کے لئے معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف مردانہ وار لڑتی نظر آتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار دیہی زندگی کی بجائے جدید دور کے شہری، تعلیم یافتہ اور سوشل ہیں۔ یہ افسانے معنویت کے اعتبار سے اصلاحی ہیں، لیکن کہیں کہیں ان پر رومانیت کا دھندلا سا عکس بھی موجود ہے۔ ''لاس'' (ہاتھ) کے نام سے لکھا گیا افسانہ ان کے رومانی تصورات کی ایک واضح مثال ہے جبکہ ''ماہتابہ'' مقصدیت، حقیقت پسندی، فنی باریکیوں اور زبان وبیان کی شیرینی کے حوالے سے ایک نادر نمونہ ہے۔ وہ پشتو کی خواتین افسانہ نگاروں میں جرات اظہار کے

حوالے سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہے اور نفسیاتی مسائل کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں بھی یکتا ہے۔

حسن خان سوز بھی پشتو فکشن کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے "لوگے او رنڑا" (دھواں اور روشنی) اور "کہ آباسین راغلے نہ وے" (اگر اباسین آیا نہ ہوتا) طبع ہو کر سامنے آچکے ہیں، جن کے پلاٹ بالعموم معاشرتی اور سوشل واقعات سے اخذ کئے گئے ہیں اور ان میں روایتی انداز سے ہٹ کر جدت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کے تمام افسانے ترقی پسند سوچ کے غماز ہیں۔

ارباب رشید احمد خان کے افسانوی مجموعے "انگازے" (بازگشت) کے سارے افسانوں کو ہم مختصر افسانے کہہ سکتے ہیں، جو کہ معنویت کے اعتبار سے تاثری ہیں اور ایک مخصوص کیفیت میں زندگی کے بعض واقعات اور کرداروں کے بارے میں ایک خاص تاثر کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں "ملاگے"، "درے کانڑی" (تین پتھر) اور "شیرینئی" ابہام کی حد تک الجھے ہوئے اور سسپنس (Suspense) کے شکار ہیں۔ ان کے افسانے نہایت مختصر ہونے کے باوجود فنی لحاظ سے بہت پختہ، تاثر کے لحاظ سے بہت اعلیٰ اور کردار نگاری کے حوالے سے بہت معیاری ہیں۔

طاہر اثر آفریدی کے افسانوں کے پانچ مجموعے "دمکلونو خواکے"، "پانڑے پانڑے"، "لارہ کے ماشام" اور "بیاهغہ ماشام دے" بالترتیب چھپ کر سامنے آئے۔ 2002ء میں ان کا آخری مجموعہ "نور خوبونہ نہ وینم" (اور خواب نہیں دیکھتا) کے نام سے شائع ہوا، جو تیرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں میں پشتو افسانہ پہلی مرتبہ دیہاتی ماحول سے نکل کر شہری ماحول اور مشینی فضا سے ہمکنار ہوتا نظر آتا ہے اور اس میں پہلی بار زندگی کے بارے میں ایک تنقیدی شعور بیدار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے پشتو افسانے میں علامت نگاری اور تجریدیت کے کامیاب تجربے بھی کئے ہیں۔

آزادی کے بعد پشتو کے دیگر اہم افسانہ نگاروں میں مبارک سلطانہ شمیم، شیر زمان طائزے، سحر یوسف زئی، پروفیسر ہدایت اللہ خٹک، قمر زمان قمر، سید رسول رسا، رضا مہمندی، ولی محمد طوفان، عبدالغفور خان، عبدالمغفر ان بیکس، عمر ناصر، افضل رضا، سعد اللہ جان برق، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، لطیف وہمی، جان محمد زلمے، پروفیسر محمد نواز طائر، اکمل اسد آبادی، فدا سرحدی، رب نواز مائل، سلطان محمد صابر، خالق داد امید، تاج خٹک، سیدہ یاسمین، کبریٰ مظہری، صفیہ حلیم، سلمیٰ شاہین، عصمت بی بی، عظمت ہما مجاز، صاحب شاہ صابر، قیوم مروت، بادشاہ شیرین وصال اور زبیر حسرت وغیرہ شامل ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو موجودہ دور میں پشتو افسانے میں موضوعات کے اعتبار سے کافی تنوع پایا جاتا ہے نیز ساخت اور اسلوب میں ایک واضح تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔

4- ڈرامہ

پشتو ڈرامہ کے آغاز سے قبل اردو کی تھیٹر کمپنیاں یہاں اردو کے ڈراموں کو اسٹیج کر کے اس صنف کو صوبہ سرحد کے عوام سے متعارف کرا چکی تھیں۔ اس سلسلے میں الفریڈ کمپنی نے پہل کی اور 1902ء میں یہاں ڈرامے کو اسٹیج کرنے کی ابتداء کی۔ پشتو کے مشہور ڈرامہ نگار اور شاعر امیر حمزہ خان شنواری کہتے ہیں:

> ''یہ میرا اپنا مشاہدہ ہے کہ جب میں نے پہلی بار اردو ڈرامہ ''یہودی کی لڑکی'' اسٹیج ہوتے ہوئے دیکھا تو اس نے مجھ پر کافی اثر کیا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال تھی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس ڈرامے نے میری ادبی استعداد کو ابھارا''

اب تک کی تحقیق کے مطابق پشتو ادب میں پہلا طبع زاد ڈرامہ عبدالاکبر خان اکبر نے 1927ء میں ''درے یتیمان''، (تین یتیم) کے نام سے لکھا، جو آزاد سکول اتمانزئی (چارسدہ) میں اسٹیج کیا گیا۔ اس ڈرامے کا رنگ اصلاحی تھا اور اس میں پشتون خوانین کی زیادتیوں اور اس وقت کے نام نہاد مذہبی علماء کی ریاکاریوں اور دوغلے پن پر کڑی نقطہ چینی کی گئی تھی۔

عبدالاکبر خان اکبر کے بعد امیر نواز خان جلیا نے 1930ء میں ''درد'' کے نام سے پشتو کا دوسرا ڈرامہ لکھا، جو اسی سال اسٹیج ہوا۔ اس ڈرامے کا مقصد انگریزی استعمار کے ظلم کے خلاف عوام کے جذبات کو ابھارنا تھا۔ یہ پشتو ادب میں پہلا سیاسی ڈرامہ تھا۔ اس ڈرامے کے اداکاروں کو سزا بھی بھگتنی پڑی۔ اسی دور میں ایک اور ڈرامہ عبدالخالق خلیق نے 1936ء میں ''شہیدہ سکینہ'' کے نام سے لکھا۔ یہ پشتو کا پہلا اصلاحی اور نیم سیاسی ڈرامہ تھا، جو کتابی شکل میں بھی شائع ہوا اور بعد میں اسٹیج بھی ہوا۔ اس کے بعد قاضی رحیم اللہ نے ''نوے روشنی'' (نئی روشنی) کے نام سے 1937ء میں ایک ڈرامہ لکھا اور یہ ڈرامہ اسی سال کتابچے کی شکل میں شائع بھی ہوا۔ اس میں دولت مند گھرانوں کے جدید تعلیم یافتہ لڑکوں کے زندگی کی سطحی رنگینیوں میں کھو جانے پر طنز کی گئی تھی۔ اس کے بعد عبدالخالق خلیق نے 1939ء میں ایک اور ڈرامہ ''خوگ ژوندون'' (پیاری زندگی) لکھا۔ یہ اپنی دھرتی کے عوام کی آئندہ زندگی کے بارے میں ایک تصوری اور تمثیلی انداز میں لکھا گیا ڈرامہ تھا اور معنوی اعتبار سے پشتو ڈرامے کی تاریخ میں ایک نیا تجربہ بھی تھا۔

1935ء میں محمد اسلم خان خٹک نے، جو ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر تھے ''دوینو جام'' (کٹورا بھر خون) لکھا، جو پشتو ڈرامے کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ڈرامہ لکھا تو ریڈیو کے لئے گیا تھا، لیکن بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا اور اسے بے پناہ عوامی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ تکنیکی لحاظ سے یہ ڈرامہ ایک مکمل ڈرامہ تصور کیا جاتا ہے۔

1945ء میں عبدالاکبر خان اکبر نے "جونگڑہ (جھونپڑی) کے نام سے ایک اور ڈرامہ لکھا، جو اسٹیج بھی ہوا اور کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ اس ڈرامہ میں غلامانہ زندگی اور غلامانہ ذہنیت کے نتائج پر ایک تلخ طنز کی گئی تھی۔ اس کا مرکزی خیال معاشرتی زبون حالی اور طبقاتی کشمکش پر مبنی تھا۔ درحقیقت اکبر کے ڈراموں میں ڈرامائی حسن سے زیادہ سماجی شعور اصلاحی سوچ اور انقلابی فکر پائی جاتی ہے۔

پشتو ڈرامے کی ارتقائی زنجیر کی ایک اور مضبوط کڑی عبدالکریم مظلوم کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ "سہرے" (چہرے) ہے، جو 1945ء میں شائع ہوا۔ یہ چھ ڈراموں پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر ان ڈراموں کا رنگ مزاحیہ اور تفریحی ہے، لیکن ان میں تعمیری اور مقصدی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اپنے عہد کے اعتبار سے ان ڈراموں کے موضوعات متنوع، جدید اور دلچسپ ہیں۔ پشتو ادب میں مظلوم کو پہلا ریڈیائی ڈرامہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسی دور کا ایک اور ڈرامہ عبداللہ جان اسیر کا "درس عبرت" ہے، جس کا پہلا حصہ اسی دور میں اور دوسرا حصہ 1956ء میں لکھا گیا۔ موضوع کے اعتبار سے اس کا پہلا حصہ "کٹورا بھر خون" کے موضوع سے مماثل ہے، جب کہ دوسرے حصے میں جدید زمانے کی فریب کاریوں اور چالاکیوں کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی غرض و غایت خالص اصلاحی تھی۔

1962ء میں ایس اے رحمان کا کاخیل کا ڈرامائی مجموعہ "نیمگڑے خوب" (اُدھورا خواب) شائع ہوا، جو تین ڈراموں پر مشتمل تھا۔ ان ڈراموں میں "نیمگڑے خوب" اپنی معنویت کے اعتبار سے ایسا ڈرامہ تھا، جس میں پہلی مرتبہ معاشرتی اصلاح کے جذبے کو عشق و محبت کی رومان پرور فضا سے منسلک کر کے پیش کیا گیا تھا۔

دیگر اہم کتابی ڈراموں میں رشید علی دھقان کا "دسر و تعویذ" (مطبوعہ 1958ء)، جس کو بعض ناقدین نے ڈرامائی ناول کہا ہے۔ اشرف مفتون کا "حیدر"، (مطبوعہ 1958ء) جو چند ڈراموں کا مجموعہ ہے، مبارک سلطانہ شمیم کا "نوے سحر" (نئی صبح، مطبوعہ 1958ء)، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم کا "لشے" (مطبوعہ 1964ء)، جس کے ساتھ چند انشائیے بھی شامل ہیں، افضل رضا کا "دے ارزئ کچکول" (مطبوعہ 1971ء) اور ڈاکٹر بہاء الدین مجروح کا "زان زانی خامار" شامل ہیں۔

1935ء میں پشاور میں آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے بعد وہاں سے پشتو ڈرامے نشر ہونا شروع ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی لکھاریوں کی ذمہ داریاں اور پابندیاں اسٹیج اور کتابی ڈراموں کی نسبت اور بھی بڑھ گئیں۔ ریڈیائی ڈراموں کی ابتداء میں متعدد ذہین اور باشعور ڈرامہ نگار سامنے آئے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت جلد ہی ڈرامہ کی اس نئی فنی اور تکنیکی باریکیوں پر عبور حاصل کر لیا۔

ریڈیائی ڈراموں کے اس ابتدائی دور میں طبع زاد ڈراموں کے علاوہ دیگر زبانوں کے چند معروف ڈرامے بھی پشتو میں منتقل کئے گئے اور نشر کئے گئے، جن میں اردو کے اسیر ہوس، خوبصورت بلا، صلاح الدین ایوبی، خواب ہستی، انارکلی، قرطبہ کا قاضی، چاند کا مسافر، شکنتلا

اور انگریزی کے میکبتھ، ہملٹ اور اوتھیلو شامل ہیں۔

1969ء میں پہلی بار چکلالہ، راولپنڈی ٹیلی وژن سنٹر سے پشتو ڈرامے (آغوش کوہستان پروگرام میں) نشر ہونا شروع ہوئے اور اسی سال پشتو کا پہلا ڈرامہ "خپل پردی" (اپنے پرائے) ٹیلی کاسٹ ہوا۔ یہ اردو کے ایک ڈرامے "کانچ کا گلاس" کا ترجمہ تھا، جو ہدایت خان ایڈووکیٹ نے کیا تھا۔ بعد میں جب پشاور اور کوئٹہ میں ٹیلی وژن سنٹرز قائم ہوئے تو وہاں سے بھی باقاعدہ طور پر پشتو ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوگئے اور یہ سلسلہ تاحال جاری وساری ہے۔ جن اہم ڈرامہ نگاروں نے ٹیلی وژن کے لئے ڈرامے لکھے، ان میں گل افضل خان، ڈاکٹر محمد ہمایوں ہما، سعد اللہ جان برق، نثار محمد خان، خالق داد امید، پروفیسر پریشان خٹک، حمد اللہ جان بسمل، رشید علی دہقان، شیر زمان طائزے، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، پروفیسر افضل رضا، عبد اللہ جان اسیر، عبد اللہ جان مغموم، زیتون بانو، ارباب عبد الوکیل، نور البشر نوید اور ھمایوں ہمدرد شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں پشتو ڈرامے، افسانے اور ناول نے ایک ساتھ ہی جنم لیا اور ایک ساتھ ہی ارتقائی سفر طے کیا۔ ان تینوں کے موضوعات قریب قریب ایک ہی ہیں۔ پشتون قلم کاروں نے ان اصناف سخن کے ذریعے پشتون سوسائٹی کے خدوخال اجاگر کئے۔ تحریک آزادی کے دوران میں ان اصناف سے سماجی بیداری اور معاشرتی اصلاح کا کام بھی لیا گیا۔

5- سفر نامہ اور رپورتاژ

سفرنامہ کسی بھی سفر کی ایک ایسی تحریری روداد ہوتی ہے، جو ادبی تقاضوں اور فنی لوازمات کے پیش نظر بیان کی جاتی ہے۔ پشتو ادب میں پہلا سفرنامہ خوشحال خان خٹک نے "سوات نامہ" کے نام سے لکھا۔ یہ ایک منظوم سفرنامہ ہے، جو چار سو اشعار پر مشتمل ہے اور مثنوی کی شکل میں موزوں کیا گیا ہے۔ اس میں سوات کے جغرافیائی خدوخال، یوسفزئی قبیلہ کی تہذیب وتمدن، معاشرت اور ان کی تاریخی اور قومی جدوجہد کے واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ 2001ء میں ان کا ایک اور نثری سفرنامہ "هند و کوهنامه" کے نام سے حبیب اللہ رفیع نے زیور طبع سے آراستہ کیا، جو خوشحال خان خٹک کے جنگی سفر کی یاداشتوں پر مشتمل ہے۔ یہ پشتو کا اولین نثری سفرنامہ ہے۔

جدید پشتو ادب میں سفرنامے کی پہلی کڑی میاں اکبر شاہ بدرشی کا "د آزادئ تلاش" (آزادی کی تلاش) ہے، جس میں روسی ترکستان کے مختلف علاقوں کے سفر کے حالات درج ہیں۔ یہ سفرنامہ 1919ء کے دوران میں لکھا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ عبدالاکبر خان اکبر بھی انہی دنوں افغانستان کے راستے روسی ترکستان گئے تھے۔ انہوں نے انتہائی صعوبتوں کے باوجود ان علاقوں کی سیاحت کی اور "افغانستان اور روسی ترکستان کا سفرنامہ" لکھا، جس کو پردل خٹک نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ انہوں نے اس سفرنامہ میں روسی

ترکستان کے تہذیبی اور معاشرتی حالات دلچسپ انداز میں بیان کیے۔ یہ دونوں سفرنامے چھپ چکے ہیں اور یہ دونوں سفرنامے ہجرت افغانستان کے پرتو ہیں۔

سیدہ قانتہ بیگم نے ''زما سفرنامہ'' (میرا سفرنامہ) کے عنوان سے جو سفرنامہ لکھا، اس میں 1928ء تا 1948ء کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ انہوں نے لاہور، ہندوستان، مصر، افغانستان، حجازِ مقدس، انگلستان اور نیویارک کی سیاحت کی۔ دراصل ان کے بھائی احیاء الدین (باچہ گل) محکمہ خارجہ میں اہم عہدہ پر فائز تھے اور وہ اکثر اپنے بھائی کے ہمراہ رہا کرتی تھیں۔ یہ سفرنامہ بھی چھپ چکا ہے۔

امیر حمزہ شنواری نے تین سفرنامے لکھے، ان کا پہلا سفرنامہ ''دکابل سفرنامہ'' (سفرنامۂ کابل) منظوم ہے، جو 1998ء میں چھپ چکا ہے۔ ان کا دوسرا سفرنامہ بھی سفر افغانستان سے متعلق ہے، جس کا نام ''نوے پختون'' (جدید پشتون) ہے۔ یہ سفر انہوں نے 1957ء میں کیا تھا۔ اس سفرنامہ میں کابل کے اہل قلم کے ساتھ ملاقاتوں اور بحث مباحثوں کا تذکرہ ہے۔ سفرنامے کا مقدمہ فاروق شنواری نے لکھا ہے۔ انہوں نے اپنا تیسرا سفرنامہ پیدل حج کے دوران لکھا، جس کا نام ''دحجاز پہ لور'' (سوئے حجاز) ہے۔ اس سفر میں وہ 1949ء میں کابل اور ایران کے راستے حجاز مقدس گئے اور فریضہ حج ادا کیا۔ ان کے اس سفرنامے میں اس پورے سفر کی روداد اور احوال نہایت عمدگی سے بیان کیے گئے ہیں۔

میاں عنوان الدین کاکاخیل کا سفرنامہ ''ابنِ بطوطہ''، امیر علی خٹک کا سفرنامہ ''مقامات امیر''، طاہر آفریدی کے دو سفرنامے ''سفر پہ خیر'' (سفر بخیر) اور ''سفر مدام سفر'' (سفر ناتمام) بھی پشتو کے اچھے سفرنامے شمار کیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں صدیق اللہ رشتین اور قیام الدین خادم نے بھی سفرنامے لکھے۔ ان میں سے اول الذکر کا نام ''سفر ہند'' اور موخر الذکر کا نام ''سفر قطغن'' ہے۔

پشتو ادب میں رپورتاژ کے ابتدائی آثار خوشحال خان خٹک کے نثر پاروں اور منظوم کلام میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ تاریخ مرصّع کے بعض واقعات، جنہیں خوشحال خان خٹک نے اپنے دستخط کے ساتھ بیان کیا ہے، ان میں واقعے کی نوعیت کے مطابق خوشحال کے لب و لہجہ میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ ان واقعات میں رپورتاژ کا رنگ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ جس ترکیب بند میں خوشحال نے اپنی گرفتاری، پشاور سے براستہ اٹک، حسن ابدال، راولپنڈی، لاہور، پابہ زنجیر دہلی پہنچنے کا حال بیان کیا ہے، یہ بھی رپورتاژ کی ایک اچھی مثال ہے۔ سوات نامہ، لاہور میں آصف جاہ اور شاہجہان کے لگائے ہوئے شاندار باغ اور دہلی کے متعلق لکھی ہوئی نظم میں بھی رپورتاژ کا رنگ جھلکتا ہے۔

پشتو کے جدید ادب میں خان عبدالغفار خان کا رپورتاژ، بیسویں صدی کی تہذیب اور جیل خانہ جات، اجمل خٹک کے قید و بند کی روداد ''دازۂ پاگل وم'' (آیا میں پاگل تھا؟)، نصر اللہ خان نصر کا رپورتاژ ''سفرِ امب''، پروفیسر محمد نواز طائر کا ''نالید لے سوات'' (نادیدہ

سوات)، ہمیش خلیل کے قید و بند کا حال ''قید و بند'' میر مہدی شاہ کا ''تر اصحاب بابا'' (اصحاب بابا تک)، رشید علی خان دہقان کا ''میں نے یہ سب کچھ اپنی گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے''، حسن خان سوز کا ''ملکہ''، ''لطیف وہمی کے ''تیراہ کا سفر''، ''پشاور سے تخت بائی تک'' اور ''ازاخیل کی جانب''، ایوب صابر کا ''کوہاٹ سے لورالائی تک'' رپورتاژ کی اچھی مثالیں ہیں۔ علاوہ ازیں جعفر اچکزئی کے زندانی حالات ''دیکھا ہوا خواب''، حنیف خلیل کا '' دپیین بولدک پہ لور'' (سپین بولدک کی جانب) اور سلیم راز کا ''لہ باڑے ترباڑہ گلئی'' (باڑے سے باڑہ گلی تک) بھی اس صنف کے اچھے نمونوں میں شامل ہیں۔

6۔ خاکہ نگاری

اگر چہ پشتو ادب میں جدید خاکہ نگاری کی تاریخ آزادی کے بعد شروع ہوتی ہے، مگر اس کے نقوش ہمارے قدیم ادب میں بھی ملتے ہیں۔ اخون درویزہ نے بایزید انصاری کا جو خاکہ لوگوں کے سامنے پیش کیا، اگر چہ اس میں تنقیص ہی تنقیص ہے، مگر اس میں خاکہ نگاری کے نقوش موجود ہیں۔ اسی طرح خوشحال خان خٹک نے اپنے کلام میں مرد مومن، مرد ِ چھکارہ، اورنگزیب عالمگیر، اپنے بیٹے بہرام اور بحیثیت مجموعی افغانوں کے کردار کا جو خاکہ کھینچا ہے، اس میں خاکہ نگاری کے نقوش پوری طرح عیاں ہیں، تاہم بیسویں صدی میں ہمیں خاکہ نگاری کے چند مکمل نمونے نظر آتے ہیں۔

پشتو میں فنی لحاظ سے مکمل خاکہ عبدالحلیم اثر نے ''خلیق صاحب'' کے عنوان سے لکھا، جو 1949ء میں ہفت روزہ ''انصاف'' میں چھپا۔ یہ معروف ادبی شخصیت عبدالخالق خلیق کا خاکہ تھا۔ اس کے بعد پشتو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا اور چند سینئر لکھنے والے اس جانب متوجہ ہوئے اور چند معیاری خاکے لکھے گئے، جن میں میاں احمد شاہ کا خاکہ ''سمندر زما پہ نظر کے'' (سمندر میری نظر میں) اور قمر راہی کا ''ڈاکٹر عبدالغفار زما پہ نظر کے'' (ڈاکٹر عبدالغفار میری نظر میں) شامل ہیں۔ اس دوران قمر راہی اپنے ماہنامہ مجلّے ''قند'' مردان کے ہر شمارے میں ایک شخصیت پر چند سطریں ''کرنے'' کے عنوان سے لکھتے تھے۔ یہ سطریں اگر چہ مکمل خاکے نہیں تھے، لیکن اپنے اسلوب بیان اور زبان کی شائستگی کی وجہ سے بہت دلکش تھے، جن کو ہم مکمل فنی خاکوں کے نقش اولین کے زمرے میں ضرور شمار کر سکتے ہیں۔

پشتو میں خاکہ نگاری کے سلسلے میں ایک اہم کتاب اصغر لالہ کی ''ژوند او ادب'' (زندگی اور ادب، مطبوعہ 1968ء) ہے، جس میں مضامین اور انشائیوں کے علاوہ چند خاکے شامل ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد ہمایوں ہما کی کتاب ''ختکلی ختکلی خلق'' (حسین حسین لوگ، مطبوعہ 2000ء) میں شخصیات پر، جو تحریریں سامنے آئی ہیں، ان میں خاکہ نگاری کے ساتھ ساتھ شخصیت نگاری کا عکس بھی نمایاں ہے۔ یہی صورت حال سلیم راز کی کتاب ''تنقیدی کرنے'' (تنقیدی سطریں، مطبوعہ 1999ء) کی بھی ہے، جس میں ایک تنقیدی مضمون

کے علاوہ چند ہمعصر شخصیات کے خاکے شامل ہیں، لیکن ان خاکوں میں بھی فکری ونظری تنقید کا عنصر غالب ہے۔

نقشونہ (نقوش) محمد زبیر حسرت کے لکھے ہوئے خاکوں کا مجموعہ ہے، جو 1999ء میں منظر عام پر آیا۔ چند ایک خامیوں کے باوجود، وہ بحیثیت مجموعی ایک کامیاب خاکہ نگار ہیں۔ اس مجموعے میں شامل چند خاکے فنی لحاظ سے مکمل نہیں، تاہم اکثر خاکے فنی وتکنیکی لحاظ سے بھرپور ہیں۔ مشتاق مجروح اور ڈاکٹر امین کا خاکہ فنی لحاظ سے مکمل خاکے ہیں۔

رسائل وجرائد میں بھی انفرادی طور پر فنی وتکنیکی حوالے سے مکمل اور معیاری خاکے لکھے گئے ہیں۔ بالخصوص روزنامہ "الفلاح" میں "قلمی سھرے۔ لیدلے کتلے" (قلمی چہرے) کے عنوان سے مختلف لکھنے والوں نے کئی خاکے لکھے، اس ضمن میں قلندر مومند نے امیر حمزہ شنواری، لطیف وہمی نے حسین بخش کوثر، طالب تاجک نے عبدالرحیم مجذوب، ولی محمد طوفان نے محمود قلندر اور ہمیش خلیل نے سمندر خان سمندر کے جو خاکے لکھے ہیں، وہ پشتو خاکہ نگاری کے میدان میں بلند پایہ مقام رکھتے ہیں۔

خاکہ نگاری کے حوالے سے گورنمنٹ کالج مردان کے سالانہ مجلّہ "شفق" کا خصوصی شمارہ "حافظ ادریس نمبر" بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شمارے میں مکمل اور بھرپور خاکے سامنے آئے، جن میں حافظ ادریس ہی کے دو خاکے قمر راہی اور سید تقویم الحق کا کاخیل نے الگ الگ لکھے۔ دونوں کا سٹائل بہت منفرد اور دلکش ہے، خصوصاً سید تقویم الحق کا کاخیل کے مختصر جملے اور لفظوں کا انتخاب قابل داد ہے۔ پشتو اکیڈمی کے مجلّہ "پشتو" نے چند خصوصی شمارے شائع کیے، جن میں "اعتراف نمبر" میں کئی شخصیات کے معیاری خاکے شائع ہوئے۔ مردان سے شائع ہونے والے مجلّہ "مرکہ" (جرگہ) کا "خاکہ نمبر" بھی اس سلسلے میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ ربنواز مائل کا خاکہ "تیراہ وال"، پیر گوہر کا "ژوندے انسان" (زندہ انسان) بھی بہت دلچسپ خاکے ہیں۔ ان خاکوں میں سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کی جانب بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

خاکہ نگاری کی صنف میں صاحبزادہ فیضی، رشید علی دھقان، سلطان محمد صابر، صاحبزادہ حمید اللہ، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، عبدالحق نسیم، عبدالکریم بریالے، ڈاکٹر چراغ حسین شاہ اور سعید گوہر ایسے نام ہیں، جو اپنا منفرد اسلوب اور تعارف رکھتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں حیران خٹک، ڈاکٹر درویش، نور البشر نوید، ہمایون ہمدرد، سید خیر محمد عارف ایسے نام ہیں، جو تا حال فنِ خاکہ نگاری سے وابستہ ہیں۔

7۔ تراجم

ادب میں تراجم کا مقام مسلم ہے اور کسی زبان کے ارتقاء کا تعلق بھی بڑی حد تک ترجموں سے ہوتا ہے۔ اب تک پشتو زبان میں عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور دیگر زبانوں سے کئی منثور اور منظوم تراجم ہو چکے ہیں۔ پشتو میں ہاشم سروانی نے عربی کے ایک شاعر ابن خلاد

کے اشعار کا سب سے پہلا منظوم ترجمہ تیسری صدی ہجری میں کیا۔ اس کے بعد دوسرا پشتو ترجمہ "بوستان سعدی" کا ہے جو کہ 903ھ/ 1497ء میں ایک پشتون عالمہ زرغونہ کاکڑہ نے کیا۔ دسویں صدی ہجری میں اخون درویزہ کی مرتبہ کتاب "مخزن الاسلام" بھی کئی دینی رسائل اور کتب کا منثور پشتو ترجمہ ہے۔

گیارھویں صدی ہجری میں خوشحال خان خٹک کے زرین دور میں دینی تراجم کے ساتھ ادبی تراجم کا بھی آغاز ہوا۔ پشتو ادبیات کی تاریخ میں اس دور کو ترجمے کے "شعوری دور" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور کے مشہور تراجم میں سکندر خان خٹک کی مترجمہ مولانا جامی کی مثنوی "داستان لیلیٰ ومجنوں"، عبدالقادر خان خٹک کی مترجمہ مولانا جامی کی "یوسف وزلیخا" اور شیخ سعدی کی "گلستان"، صدر خان خٹک کی مترجمہ نظامی کی "خسرواور شیریں"، افضل خٹک کی مترجمہ "انوار سہیلی"، عبدالحمید بابا کی مترجمہ فارسی کی دو مثنویاں "نیرنگ عشق" اور "قصہ شاہ وگدا"، فیاض کی مترجمہ "بہرام اور گل اندامہ" اور محمد رفیق کا مترجمہ "شاہنامہ فردوسی" قابل ذکر ہیں۔ خان شاد محمد خان نے بھی انوار سہیلی کو دبیر دانش کے نام سے ترجمہ کیا، جسے پشتو اکیڈمی نے شائع کیا۔

خوشحال خان خٹک کے زرین دور کے بعد تیرہویں صدی ہجری میں پشتو تراجم کا ایک اور دور شروع ہوتا ہے، جس کے چند اہم تراجم میں مرز خان کی مترجمہ "سیف الملوک اوبدری جمالے" اور ملا نعمت اللہ کی مترجمہ پنجابی داستان "سوہنی مہینوال" شامل ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اردو سے پشتو زبان میں تراجم کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسری زبانوں سے تراجم کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس دور کے چند معروف تراجم میں میاں محمد یوسف کی مترجمہ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "توبۃ النصوح"، میاں حسیب گل کاکاخیل کی مترجمہ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب "مراۃ العروس" اور میاں نعمان الدین کاکاخیل کا مترجمہ "ابن بطوطہ کا سفرنامہ" شامل ہیں۔ میاں غفورالدین نے "اخلاق محسنی" کا ترجمہ "عنوان النصائح" کے نام سے کیا. اسی طرح پشتو میں علامہ اقبال کی ساری تصانیف کے تراجم، مثنوی مولانا روم، شیکسپئر کے مختلف ڈراموں، دیوان غالب، عمر خیام کی رباعیات اور ہمایون ہمدرد کی مترجمہ فیض احمد فیض کی کتاب "نقش فریادی" کے علاوہ اور بھی بے شمار نامور اہل قلم کے تراجم ہو چکے ہیں. یہ بھی پشتو زبان وادب کا امتیاز ہے کہ ہماری اکثر دینی کتابیں مثلاً خلاصہ کیدانی، منیۃ المصلیٰ، رشید البیان، فتاویٰ عالمگیری، قرآن مجید اور احادیث کے تراجم، پشتو میں ہوئے ہیں۔ پشتو زبان سے دیگر زبانوں میں اور دیگر زبانوں سے پشتو میں اتنے تراجم ہوئے ہیں کہ شعبہ پشتو، پشاور یونیورسٹی کے پروفیسر شاہجہان خان نے 2000ء میں مطبوعہ تراجم پر تھیسز لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

8- انشائیہ (تکل)

انگریزی ادب کا لائٹ پرسنل ایسے (Light personal essay)، اردو کا انشائیہ اور پشتو کا ''تکل'' ایک ہی صنف کے مختلف نام ہیں، جو کہ بنیادی طور پر فرانسیسی ادب کی پیداوار ہے۔

پشتو ادب میں انشائیہ کو تکل کا نام، اولسی ادبی جرگہ کے ایک اجلاس میں دیا گیا۔ اسے یہ نام معروف محقق دوست محمد کامل مہمند نے دیا، پھر سید راحت زاخیلی اور صنوبر حسین کاکاجی نے اس روایت کو آگے بڑھایا، تاہم دوست محمد کامل نے باقاعدگی سے انشائیہ کو وسیلہ اظہار بنایا اور فنی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھ کر انشائیے لکھے۔ اس کے بعد ماسٹر عبدالکریم، حمزہ شنواری، عبدالخالق خلیق، مولانا عبدالقادر، میاں احمد شاہ، میر مہدی شاہ، مراد شنواری، ایوب صابر، رب نواز مائل، سلیم راز، سعداللہ جان برق اور ڈاکٹر اسرار نے انشائیہ (تکل) کو خوب ترقی دی۔ پشتو ادب میں تکل کے چند نمونوں میں مولانا عبدالقادر کا ''ڈنگوپیا'' (پروپیگنڈچی) اور ''ماشوم'' (معصوم)، میاں احمد شاہ کا ''جرگہ اور جمہوریت''، دوست محمد کامل مہمند کا ''کاکاجی زمونگ جلسو کے (کاکاجی ہمارے جلسوں میں) اور گنبد رحمان کی تعمیر، حمزہ شنواری کا ''کہ چرے زہ وزیر وے'' (اگر میں وزیر ہوتا) اور ''بو'' وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر اسرار کے انشائیوں کا مجموعہ ''د تکل پہ تکل'' چھپ چکا ہے۔

اگرچہ پشتو ادب میں تکل کا سفر بہت مختصر ہے، مگر اپنی جاذبیت، بے تکلفی، شاندار اسلوب اور شیریں زبان و بیان کی بدولت تکل روز بروز شہرت حاصل کرتا رہا ہے۔ پشتو کے نامور نقاد سلیم راز نے پشتو انشائیے پر ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب بھی لکھی ہے، جو اشاعت کے مراحل میں ہے۔

9- تحقیق اور تنقید

پشتو ادب میں تحقیق اور تنقید دونوں کی ابتداء ادبی تذکروں سے ہوئی۔ پشتو کا اولین تذکرہ ''تذکرۃ الاولیا'' ہے، جسے سلیمان ماکو نے 612ھ میں لکھا اور 1931ء میں علامہ عبدالحی حبیبی نے اس کی ترتیب و تہذیب کی۔ اس تذکرے میں ان اولیاء کا ذکر ہے، جو پشتو کے اولین دور کے شاعر بھی تھے۔ اس کے بعد دوسرا اہم تذکرہ ''پٹہ خزانہ'' (گنج مخفی) ہے، جسے محمد ھوتک ابن داؤد نے 1142ھ میں مرتب کیا اور 1944ء میں علامہ عبدالحی حبیبی نے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ اس ادبی تذکرے میں پشتو کے پچاس سے زیادہ قدیم شعراء کی سوانح اور کلام پر ایک مختصر سا تبصرہ بھی ملتا ہے۔ ان تذکروں کے بعد باقاعدہ تحقیقی روایت ہمیں مستشرقین کے کام میں نظر آتی ہے، جن میں میجر راہرٹی، پادری ٹی پی ھیوز، جیمز ڈارمسٹیٹر، گولڈن سٹنٹ، کلاپرٹ، والٹر بیلیو، ارنسٹ ٹرمپ، مارگنسٹرن، سر جارج گریرسن، انولڈسن، سر

اولف کیرو، جے ڈبلیوسپین وغیرہ کے نام زیادہ مشہور ہیں۔ میجر راورٹی نے پشتو گرامر اور لغت لکھ کر گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ پادری ھیوز کی کتاب کلید افغانی (پشتون شعراء کا تذکرہ)، گریرسن کے لسانی مطالعہ "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں پشتو کا حصہ، جے ڈبلیوسپین کی کتاب "دی وے آف دی پٹھانز" اور اولف کیرو کی کتاب "دی پٹھانز" پشتو تحقیق میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

جدید دور کا اولین تذکرہ "پختانہ شعراء" (پشتون شعراء) ہے، جسے عبدالحیٔ حبیبی نے مرتب کر کے پہلی بار 1942ء میں زیور طبع سے آراستہ کیا، جس کے بعد ازاں مزید چار ایڈیشن مختلف محققین کے ہاتھوں مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ اسی طرح "دپختو ادبیاتو تاریخ" (پشتو ادبیات کی تاریخ) کو بھی سب سے پہلے عبدالحیٔ حبیبی نے لکھا، جس کا پہلا ایڈیشن 1942ء میں شائع ہوا۔ ان مذکورہ تذکروں اور تاریخ ادبیات پشتو میں تحقیقی اور تنقیدی پہلو ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ افغانستان میں عبدالحیٔ حبیبی کے علاوہ دیگر اہم محققین میں صدیق اللہ رشتین، عبدالرؤف بے نوا، عبدالشکور رشاد اور قیام الدین خادم نے وزیر محمد گل خان مہمند کے ایما پر ایک تحریک کی شکل میں پشتو تحقیق خصوصاً قدیم ادب، لغت اور تاریخ کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ دوسری جانب صوبہ سرحد میں بہادر شاہ ظفر کاکا خیل، دوست محمد کامل مومند، عقاب خٹک اور ہمیش خلیل تحقیق کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ اس دور میں متعدد تذکرے لکھے گئے، جن میں ہمیش خلیل کا مرتبہ کردہ تذکرہ "پختانہ لیکوال" (پشتون لکھاری) بھی شامل ہے، جس کا پہلا ایڈیشن 1958ء اور دوسرا ایڈیشن 1961ء میں شائع ہوا۔ یہ سب سے عمدہ ادبی تذکرہ ہے جس پر جدید مغربی تنقید کا اثر نمایاں ہے۔ علاوہ ازیں "ورکہ خزانہ" (دو جلدوں میں، مطبوعہ 1960ء) بھی ان کا ایک عمدہ تذکرہ ہے جس میں پشتو کے پچاس گمنام قدیم شعراء کی سوانح اور کلام کے نمونے شامل ہیں۔ اس کے بعد 1974ء میں حبیب اللہ رفیع کا تذکرہ "ادبی ستوری" (ادبی ستارے) منظر عام پر آیا، جس میں پچاس قدیم شعراء کی سوانح اور ان کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں دس معروف شعراء کا گمشدہ کلام بھی پہلی مرتبہ اس میں شامل کیا گیا ہے، جن میں حمید بابا، بیدل، اشرف خلیل، فاضل ورک، حسین ورک، شیر محمد ورک، یونس ورک، صدیق ورک، فتح علی ورک اور قلندر شامل ہیں۔ ان کی دیگر چند اہم تحقیقی و تنقیدی کتب میں "دپختو پخوانی تذکرے" (پشتو کے قدیم تذکرے)، "پختو خپرونے" (پشتو جرائد)، "کتابونہ دریابونہ" (کتابیں سمندر ہیں) اور "آوارہ شیدا" شامل ہیں۔

ان تذکروں اور ادبی تاریخوں کے علاوہ پشتو تنقید و تحقیق میں جس رجحان نے فروغ پایا، وہ پشتو کے کلاسیکل شعراء کے دواوین اور تصانیف کی ترتیب و تدوین ہے، چنانچہ جدید تنقید کی پہلی جھلک ہم دیوان رحمان بابا اور دیوان خوشحال خان خٹک کے مقدموں میں پاتے ہیں جو ایڈورڈز کالج پشاور کے علوم شرقیہ کے پروفیسر عبدالمجید افغانی نے 1929ء میں لکھے۔ پشتو تحقیق کے ضمن میں دوست محمد خان کامل، اس زبان کے پہلے سائنٹیفک محقق ہیں، جو پشتو تحقیق کی دنیا میں ایک معتبر حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تحقیقی اور تنقیدی کاوشوں میں

''خوشحال خان خٹک'' (اردو مطبوعہ 1951ء)، ''رحمان بابا'' (مطبوعہ 1958ء)، ''تاریخ مرصّع'' (ضخیم مقدمہ، حواشی وتعلیقات کے ساتھ) اور ''1630ء'' نامی کتاب (مطبوعہ 1985) کے علاوہ ''کلیات خوشحال خان خٹک'' (مطبوعہ 1952ء)، ''دیوان سکندر خان خٹک'' (مطبوعہ 1953ء) اور ''کلیات رحمان بابا'' (بہ اشتراک، مطبوعہ 1984ء) کی ترتیب وتہذیب شامل ہیں۔ اسی تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے سید محمد تقویم الحق کاکاخیل نے اخون درویزہ کی کتاب ''مخزن'' کی تدوین اور اس پر ایک جامع مقدمہ کے علاوہ دیوان علی خان اور دیوان کامگار خان خٹک کو مقدمہ اور مفید حواشی کے ساتھ مرتب کیا۔

پشتو ادب میں یوں تو تحقیق وتنقید کے بے شمار نمونے ملتے ہیں، مگر ''خیر البیان'' پر مولانا عبدالقدوس، ''بی بی نورہ''، ''مخزن'' پر پروفیسر سید تقویم الحق کاکاخیل، ''تاریخ مرصع'' پر دوست محمد کامل مہمند اور ''ارمغانِ خوشحال'' پر میاں سید رسول رسا کے مقدمے تحقیق وتنقید کے اعلیٰ نمونوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس دور میں عبدالحلیم اثر افغانی، نواز خٹک اور عقاب خٹک بھی تحقیقی کاوشوں میں لگے رہے۔

پشتو تحقیق وتنقید کے ضمن میں ہمیش خلیل نے خصوصی نام پیدا کیا اور اپنی محنت وکاوش سے پشتو تحقیق وتنقید کے دائرہ کو وسیع کیا۔ انھوں نے پشتو کے گیارہ قدیم شعراء کے دواوین کی ترتیب وتہذیب کی اور ان پر تفصیلی مقدمے لکھے، جن میں ''دیوان بیدل'' (مطبوعہ 1957ء)، ''دیوان معز اللہ خان مومند'' (مطبوعہ 1957ء)، ''دیوان فدا'' (مطبوعہ 1957ء)، ''دیوان سعید'' (مطبوعہ 1958ء)، ''دیوان اشرف خان ہجری'' (مطبوعہ 1958ء)، ''دیوان حسین'' (مطبوعہ 1958ء)، ''دیوان مرزا خان انصاری'' (مطبوعہ 1959ء)، ''دیوان قنبر علی خان (مطبوعہ 1960ء)، ''دیوان کاظم خان شیدا'' (مطبوعہ 1965ء)، ''دیوان عبدالقادر خان خٹک'' (مطبوعہ 1967ء)، ''دیوان رحمت داوی'' (مطبوعہ 1980ء) اور دیوان اشرف خان ہجری (فارسی، مطبوعہ 1994ء) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے خوشحال خان خٹک کی پانچ کتابیں ''اخلاق نامہ'' (مطبوعہ 1981ء)، ''فراق نامہ'' (مطبوعہ 1982ء)، ''طب نامہ'' (مطبوعہ 1984ء)، ''باز نامہ'' (مطبوعہ 1985ء) اور ''سوات نامہ'' (مطبوعہ 1986ء)، ایڈٹ کر کے بہت خوبصورت انداز میں چھپوائیں۔ عبدالحمید مومند کی مترجمہ منظوم داستان ''قصہ شاہ وگدا'' (مطبوعہ 1957ء) اور افضل خان خٹک کی نثری کتاب ''باز نامہ'' (مطبوعہ 1994ء) بھی اُنھی کی ایڈٹ کردہ ہیں۔ اس کے بعد معروف محقق قلندر مومند نے ''دیوان محمدی صاحبزادہ'' (مطبوعہ 1985ء) اور ''دیوان ابوالقاسم'' (مطبوعہ 1986ء) کی ترتیب وتہذیب کی اور ان پر مقدمے لکھے۔

خیال بخاری، صاحبزادہ حمید اللہ، سیال کاکڑ، سعید گوہر، عبدالکریم بریالے، قیام الدین خادم، عبدالشکور رشاد اور عبدالرؤف بے نوا نے بھی دیوانوں، کلیات اور دوسرے کلاسیکل خطی نسخوں کی تدوین وتحقیق کے علاوہ کئی ادبی موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی کتابیں لکھیں۔ دیگر اہم تحقیقی وتنقیدی کتب میں ڈاکٹر محمد اعظم اعظم کی ''دپختو افسانہ'' (پشتو افسانہ، مطبوعہ 1976ء)، پروفیسر افضل رضا کی ''دپختو نثر تاریخ''

(پشتو نثر کی تاریخ)، "ڈرامہ۔ فن و تحقیق"، "دپختو غزل" (پشتو غزل)، "پٹ ستوری" اور پروفیسر داور خان داؤد کی "درحمان بابا ژوند او تعلیمات" (رحمان بابا کی زندگی اور تعلیمات) "پختو ٹپہ" (پشتو ٹپہ)، پختو ادب کے متل (پشتو ادب میں ضرب المثل) اور "پختو فولکلور کے اڑ" (پشتو فولکلور میں پہیلی)، قلندر مومند کی "دخیر البیان تنقیدی مطالعہ" (خیر البیان کا تنقیدی مطالعہ، مطبوعہ 1988ء)، "پٹہ خزانہ فی المیز ان" (مطبوعہ 1994ء)، ہمیش خلیل کی "تول پارسنگ" (مطبوعہ 1992ء) اور "حقیقت دادے" (حقیقت یہ ہے، مطبوعہ 1998ء)، صاحبزادہ حمیداللہ کی "پختو غزل: تنقید او تحقیق (پشتو غزل: تنقید اور تحقیق، مطبوعہ 1993ء)، پروفیسر محمد نواز طائر کی "روہی ادب" (مطبوعہ 1977ء)، "ٹپہ او ژوند" (ٹپہ اور زندگی، مطبوعہ 1980ء)، "آدم خان درخانئ یوہ سپڑنہ" (آدم خان درخانی: ایک تحقیق، مطبوعہ 1981ء) اور "پہ پختو کے دماشومانو سندرے او صوتونہ" (پشتو میں بچوں کے گیت اور اصوات، مطبوعہ 1988ء)، شیر افضل بریکوٹی کی "دبدبہ خوشحال"، "زمزمہ رحمان"، "سخن طراز عبدالحمید"، عندلیب سوات حافظ الپوری" اور "دپختو شعر وادب" (ان کی یہ ساری کتابیں 1995ء میں شائع ہوئیں)، عبدالکریم بریالے کی "دپختو لیک دود" (پشتو رسم الخط، مطبوعہ 2000ء) ایاز داودزیؔ کی "ادبی ھشے" (ادبی کاوشیں، مطبوعہ 2002ء)، ڈاکٹر محمد ہمایون ہما کی "دتحقیق فن" (تحقیق کا فن، مطبوعہ 1992ء) اور "پہ سرحدی صوبہ کے دصحافتی او ادبی مجلو روایت" (صوبہ سرحد میں صحافتی اور ادبی مجلوں کی روایت، مطبوعہ 2002ء) اور سید وقار علی شاہ کاکاخیل کی "خوشحال خان خٹک او تاریخ نویسی" (خوشحال خان خٹک اور تاریخ نویسی، مطبوعہ 1992ء) قابل ذکر ہیں۔ زلمے ھیوادمل نے بھی اس میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں "دَ پختو نثر اتہ سوہ کالہ" (پشتو نثر کے آٹھ سو سال) "پہ ھند کے دَ پشتو ژبے او ایجاد پڑاوونہ" (ہند میں پشتو زبان وادب کا سفر)، "دپختو ادبیاتو تاریخ" (پشتو ادبیات کی تاریخ) اور "اولسی ادب" (عوامی ادب) زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی تحقیق کو پشتو ادب میں استناد کی حیثیت حاصل ہے۔ درج بالا کتب میں تحقیق وتنقید کے ہر شعبے کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً متون کی جانچ پرکھ اور تدوین، زبان وادب کی تاریخ، دواوین کی تدوین، تذکرہ نگاری، عوامی ادب پر تحقیق، اصولِ تحقیق، تقابلی مطالعہ اور تنقید کے مختلف دبستانوں مثلاً تاثراتی، جمالیاتی، تشریحی، تقابلی اور عمرانی تنقید جیسے شعبوں کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اصناف ادب پر تنقیدی تبصرے کئے گئے ہیں اور شخصیات کے احوال وآثار پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی۔

پشتو ادب میں نظری تنقید پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں اور عملی تنقید پر بھی۔ ان میں سید رسول رسا کی ادبی تنقید، پروفیسر افضل رضا کی تخلیق او تنقید، پروفیسر صاحب شاہ صابر کی "پشتو ادب کے تحقیق او تنقید" (پشتو ادب میں تحقیق وتنقید) سلیم راز کی "تنقیدی کرخے" (تنقیدی سطریں)، صدیق اللہ ریشتین کی "دَ پختو ادبی مکتبونہ" (پشتو کے ادبی مکاتب) زرین انخور کی نقدِ شعر، پرفیسر داور خان داؤد کی "تحقیق او تنقید" اور سحر یوسفزئی کی "ادب سہ دے؟" (ادب کیا ہے؟) نظری تنقید کی اچھی مثالیں ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ پشتو ادب میں دیگر زبانوں سے جو تنقیدی کتابوں کے تراجم ہوئے ہیں ان میں ارسطو کی پوئٹکس کا "کتاب الشعر" کے نام سے پشتو اکیڈمی کا ترجمہ، اسی کتاب کا نظمیات کے نام سے پروفیسر قلندر مومند کا ترجمہ، "مقدمہ شعر وشاعری" کا ترجمہ اور پروفیسر قلندر مومند کے ہنری ہڈسن کے انٹروڈکشن ٹو دی سٹڈی آف لٹریچر کے "تنقید" کے ایک باب کا ترجمہ شامل ہیں۔

جدید پشتو ادب میں تاثراتی تنقید کا پہلا نمونہ پروفیسر ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک کا "دردانے" (موتی) ہے، جو سات جدید شعراء پران کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح تحقیق کا ایک اور منفرد نمونہ بھی اسی محقق کے ہاں "درنگ وبو قافلہ" (قافلۂ رنگ وبو) کی شکل میں ملتا ہے، جو پشتو کے چار کلاسیکل نازک خیال شعراء پران کے لکھے گئے مبسوط مقالے ہیں۔ علاوہ ازیں حنیف خلیل کی کتاب "آئینے" (جو دس جدید شعراکی شاعری کے فنی تجزیئے پر مشتمل ہے) بھی تاثراتی تنقید کا ایک منفرد نمونہ ہے۔ ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک کی مناقب فقیر جمیل بیگ اور "د رحمان بابا په شعر..." (رحمن بابا کے شعر پر... مطبوعہ 2003ء) بھی پشتو تحقیق وتنقید میں گرانقدر اضافے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر چراغ حسین شاہ کی "دود چراغ" اور "انوار چراغ" بھی اہم تحقیقی کاوشیں ہیں۔

پشتو ادب میں اصناف پر بھی تحقیق ہوئی، جن میں پشتو نثر کا تاریخی اور تنقیدی جائزہ، پشتو شاعری کی تاریخ، پشتو میں جدید شاعری کی روایت، پشتو لوک شاعری، پشتو غزل اور پشتو میں تنقید کا ارتقاء قابل ذکر ہیں۔

پشتونوں کی نسلی تاریخ کی تحقیق کے سلسلے میں سید بہادر شاہ ظفر کا کاخیل، قاضی عطاء اللہ، پروفیسر پریشان خٹک، اللہ بخش یوسفی، روشن خان، حبیب اللہ تگے اور ڈاکٹر زیار کے نام نمایاں ہیں، اسی طرح پشتو زبان وادب کی تاریخ کے سلسلے میں پروفیسر عبدالحیٔ حبیبی، پروفیسر محمد نواز طائر اور شیر افضل بریکوٹی کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ جن شخصیات کی زندگی اور ادبی خدمات پر تحقیق ہوئی ہے، ان میں بایزید انصاری، ملا ارزانی خویشکی، خوشحال خان خٹک، علی خان، کاظم خان شیدا، عبدالحمید ماشو وال، رحمان بابا، دوست محمد کامل مہمند، میاں سید رسول رسا، امیر حمزہ شنواری، عبدالاکبر خان اکبر، عبدالغنی خان، عبدالخالق خلیق اور سید بہادر شاہ ظفر شامل ہیں۔

لغات کے حوالے سے دیکھا جائے تو پشتو میں لغات نویسی کا کام بھی خاصی مقدار میں ہو چکا ہے اور گذشتہ دو صدیوں میں پشتو سے فارسی، انگریزی، روسی، اردو اور پشتو سے پشتو لغات کی ترتیب وتدوین پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی 1791ء میں سینٹ پیٹرز برگ سے شائع ہونے والی گولڈن شیٹ کی لغت ہے، جو روسی علوم شرقیہ کے مرکز کے لئے تیار کی گئی تھی۔ اس کے بعد انیسویں صدی میں چند پشتو لغات لکھی گئیں جن میں روہیل کھنڈ کے نواب محبت خان کی "ریاض المحبت"، نواب اللہ یار خان کی "عجائب اللغات" (یہ دونوں لغات پشتو سے فارسی ہیں) محمد اسماعیل کی پشتو اردو لغت "آئینۂ الفاظ ومعانی"، محمد ارتضیٰ خان عمر خیل کی "فرہنگِ ارتضائی"، راورٹی اور بیلیو کی الگ الگ پشتو انگریزی لغات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

بیسویں صدی میں لکھی گئی پشتو لغات میں پادری خیر اللہ کی "خیر اللغات"، سید راحت زاخیلی کی "لغاتِ افغانی"، میجر جارج والٹر گلبرٹس کی "Pashto Idioms" (مطبوعہ 1932ء)، محمد گل خان مہمند کی "پشتو سیند"، پشتو ٹولنہ کابل کی "پشتو قاموس"، بہادر شاہ ظفر کاکاخیل کی "ظفر اللغات" (مطبوعہ 1959ء)، ترقی اردو بورڈ کی "اردو پشتو لغت" (دو جلدوں میں، مطبوعہ 1970ء) اور "پشتو نامہ"، پروفیسر دوریانکوف اور پروفیسر اسلانوف کی "پشتو روسی قاموس"، پروفیسر پردل خٹک کی "پشتو اردو لغت" (مطبوعہ 1990ء)، قلندر مومند اور فرید صحرائی کی "دریاب" (مطبوعہ 1994ء) اور سعد الدین شپون اور عبد الرسول امین کی "انگریزی پشتو قاموس" شامل ہیں۔ علاوہ ازیں پشتو اکیڈمی، پشاور یونیورسٹی کی پشتو لغت "پشتو ژبہ" (پشتو زبان) کی متعدد جلدیں چھپ چکی ہیں اور تا حال اس پر کام جاری ہے۔

شعبۂ پشتو پشاور یونیورسٹی میں سال 1976ء میں ایم فل اور 1978ء میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سطح پر تعلیم کی سہولت سے تحقیقی کام اور بھی مربوط ہو گیا، جس کی بدولت چند اچھے اور کارآمد تحقیقی مقالات قلم بند ہوئے جن میں ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک کی کتاب "خوشحال او جمالیات"، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم کی "پختو ادب کے کردار نگاری" (پشتو ادب میں کردار نگاری) اور ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک کی "دَ پختو ادبی تحریکونہ" (پشتو کی ادبی تحریکیں) زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔

دیگر تحقیقی و تنقیدی کاوشوں میں خواجہ محمد سائل کی "گوری ایسپی"، "عبد الحمید بابا"، "رومانیت اور حمید بابا"، "ھند کوا و ھند کی"، "پنجاب او پختانہ"، ڈاکٹر پرویز مہجور کے دیوان شاد محمد خان اور دیوان علی محمد مخلص کی ترتیب و تدوین شامل ہیں۔ علاوہ ازیں مختلف ادبی تنظیمیں بھی وقتاً فوقتاً تحقیق و تنقید کے میدان میں کام کرتی رہتی ہیں۔

پشتو کے نوجوان محققین اور نقادوں میں محمد زبیر حسرت اور حنیف خلیل کے نام زیادہ نمایاں ہیں۔ "اولسی ادبی جرگہ" کی تاریخ کو نہایت اہتمام کے ساتھ زبیر حسرت نے مرتب کیا اور 1998ء میں زیورِ طبع سے آراستہ کیا۔ "دَ خوشحال بابا تاریخ گوئی" (خوشحال بابا کی تاریخ گوئی، مطبوعہ 1999ء) بھی ان کی تحقیقی کاوش ہے، جو خوشحال خان خٹک کی فنِ تاریخ گوئی پر لکھی گئی ہے۔ پشتو ادب میں یہ اس موضوع پر اولین کتاب بھی ہے اور منفرد بھی۔ علاوہ ازیں "دَ قلب الّسیر شاعری" (قلب الّسیر کی شاعری، مطبوعہ 2002ء) بھی انہی کی ایڈٹ کردہ ہے، جس میں انھوں نے خوشحال خان خٹک کے بیٹے گوہر خان خٹک کی مترجمہ کتاب "قلب الّسیر" کے خطی نسخے میں موجود، کلام کو یکجا کیا اور مفصل حواشی و مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ حنیف خلیل کی تحقیقی و تنقیدی کتب میں "ھمیش خلیل ژوند او فن" (ھمیش خلیل فن اور زندگی، مطبوعہ 1997ء)، "دَ رحمان بابا اعجاز" (اعجاز رحمان بابا، مطبوعہ 1997ء) اور "پختو ناول" (پشتو ناول، مطبوعہ 2000ء) زیادہ مشہور ہیں۔ موخر الذکر کتاب میں پشتو ناول کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی کتابوں میں تحقیق سے زیادہ تنقید اور بالخصوص تاثراتی تنقید اور جمالیاتی تنقید کی چاشنی نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں سعد اللہ جان برق، ڈاکٹر یار محمد مغموم، محمد پرویش شاہین، محمد آصف

صمیم اور ڈاکٹر سہیل انشاوغیرہ بھی تحقیق وتنقید کے میدان میں کام کرر ہے ہیں۔

10۔ خود آزمائی

1- پشتوناول کے ارتقائی سفر پر مفصل روشنی ڈالیں۔

2- قیام پاکستان کے بعد پشتو افسانوں کے موضوعات زیادہ تر عوامی اور سماجی زندگی سے متعلق ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ مفصل لکھیں۔

3- پشتو ڈرامہ کے فروغ میں کن ڈرامہ نگاروں نے اہم کردار ادا کیا؟ مفصل مقالہ قلم بند کیجئے۔

4۔ پشتو میں خاکہ نگاری پر بحث کیجیے۔

5- پشتو تراجم، انشائیہ اور سفر نامہ کا مختصر جائزہ پیش کریں۔

6- پشتو میں تحقیق وتنقید کی صورتحال کی وضاحت کریں۔

☆ مجوزہ کتب برائے مطالعہ

1. Linguistic survey of Pakistan (vol. ii) by G. A. Grierson, Lahore, Accuratic Printers.

2۔سید فیاض محمود (مدیر خصوصی)، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (جلد اول)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، 1971ء، (صفحات 1 تا 159)

3۔بہادر شاہ ظفر کاکاخیل، سید، پشتون اپنی نسل کے آئینے میں، پشاور، یونیورسٹی بک ایجنسی، 1994ء

4۔پروفیسر محمد نواز طائر، مرتب، صوبہ سرحد پر پہلی لسانی اور ثقافتی کانفرنس کے مقالات کا مجموعہ، پشاور، پشتو اکیڈمی، 1986ء

5۔پریشان خٹک و دیگر (مؤلفین)، اٹوٹ لسانی رابطہ، پشاور، پشتو اکیڈمی، 1977ء

6۔محمد نواز طائر، پروفیسر، روہی ادب (تاریخ ادبیاتِ پشتو)، پشاور، پشتو اکیڈمی، 1987ء

7۔پریشان خٹک، پروفیسر، پشتو شاعری کی تاریخ، اسلام آباد، اکادمی ادبیات، 1988ء

8۔عبدالرؤف نوشہروی، پروفیسر، پشتو ادب ایک تعارف، پشاور، 1985ء

9۔دوست محمد خان کامل، خوشحال خان خٹک، پشاور، ادارۂ اشاعت سرحد، 1951ء

10۔سید انوار الحق، ڈاکٹر، منتخبات خوشحال خان خٹک مع اردو ترجمہ، پشاور، پشتو اکیڈمی، بار دوم، 1989ء

11۔محسن احسان، جاوید خلیل (مؤلفین)، پشتون لسان الغیب، پشاور، پشتو اکیڈمی، 2000ء

12۔فارغ بخاری، سرحد کے لوک گیت، اسلام آباد، لوک ورثہ اشاعت گھر، بار دوم، 1987ء

13۔ایوب صابر، جدید پشتو ادب، بنوں، پشتو ادبی مرکز، س ن

14۔اسیر منگل، پشتو افسانے کے سو سال، پشاور، دانش کتب خانہ، 2002ء
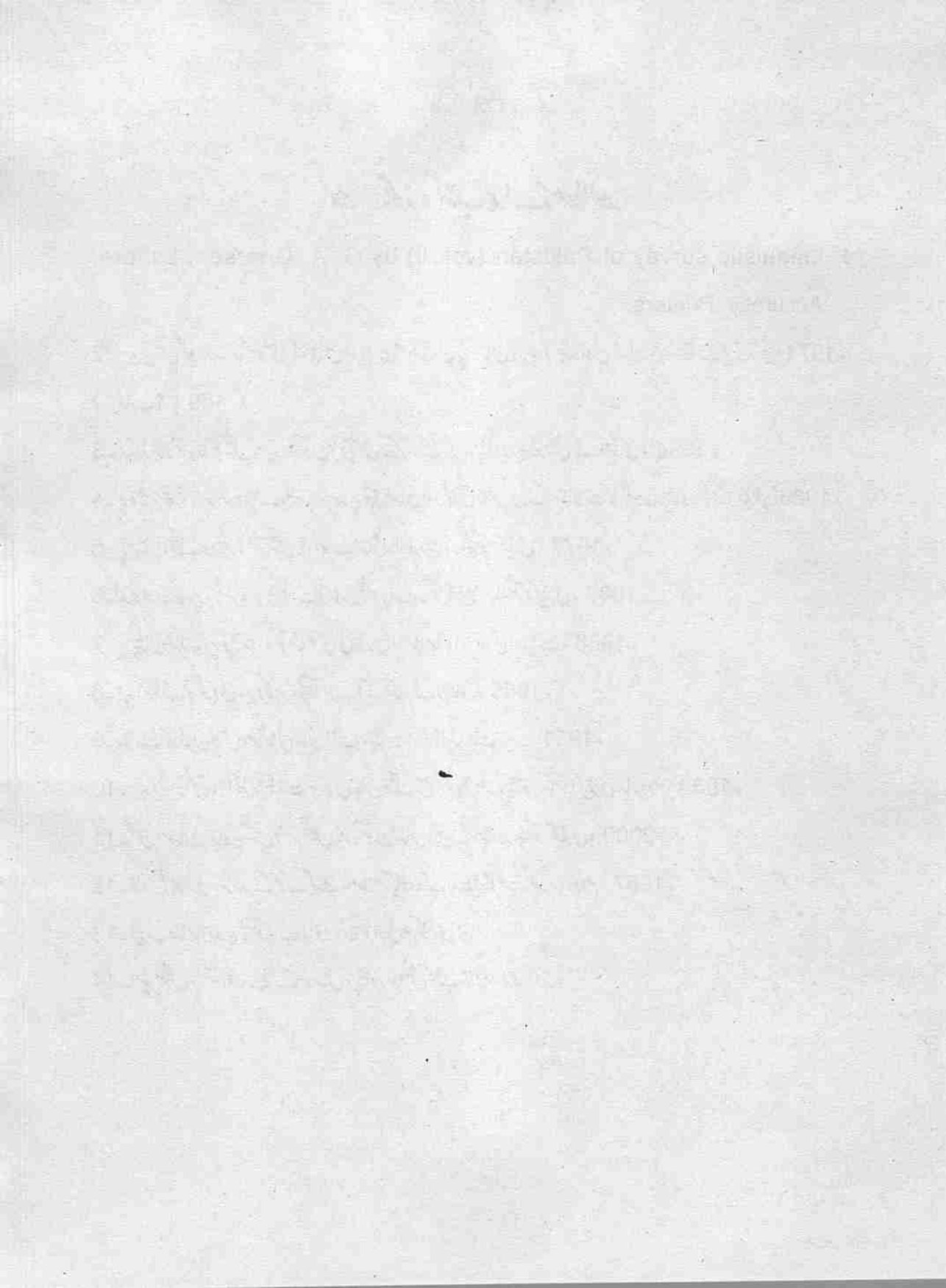
یونٹ نمبر 6

ہندکو زبان کا آغاز وارتقاء

تحریر : پروفیسر خاطر غزنوی
ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان

نظر ثانی : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات

مطالعاتی رہنما کے اس یونٹ کا تعلق ہندکو زبان کے آغاز و ارتقاء سے ہے۔ یہ زبان، زبانوں کے ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے تاہم ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ یہ قدیم وادیٔ سندھ کی زبان ہے۔ اس یونٹ میں اس زبان کے لسانی گروہ کے علاوہ، اس کے پس منظر، وجہ تسمیہ اور لسانی جغرافیہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہندکو الفبائی نظام، ابتدائی تحریریں، لوک ادب اور بول چال کے فقرے اور ان کا ترجمہ بھی اس یونٹ کا حصہ ہیں۔ پاکستانی زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناتے آپ اس کا بغور مطالعہ کیجئے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1۔ ہندکو زبان کا پس منظر اور لسانی خصوصیات بیان کر سکیں۔

2۔ ہندکو کے لسانی جغرافیے اور الفبائی نظام کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔

3۔ اس زبان کی ابتدائی تحریروں اور لوک ادب کے بارے میں جان سکیں۔

4۔ روزمرہ استعمال کے چند ابتدائی فقرے بول سکیں۔
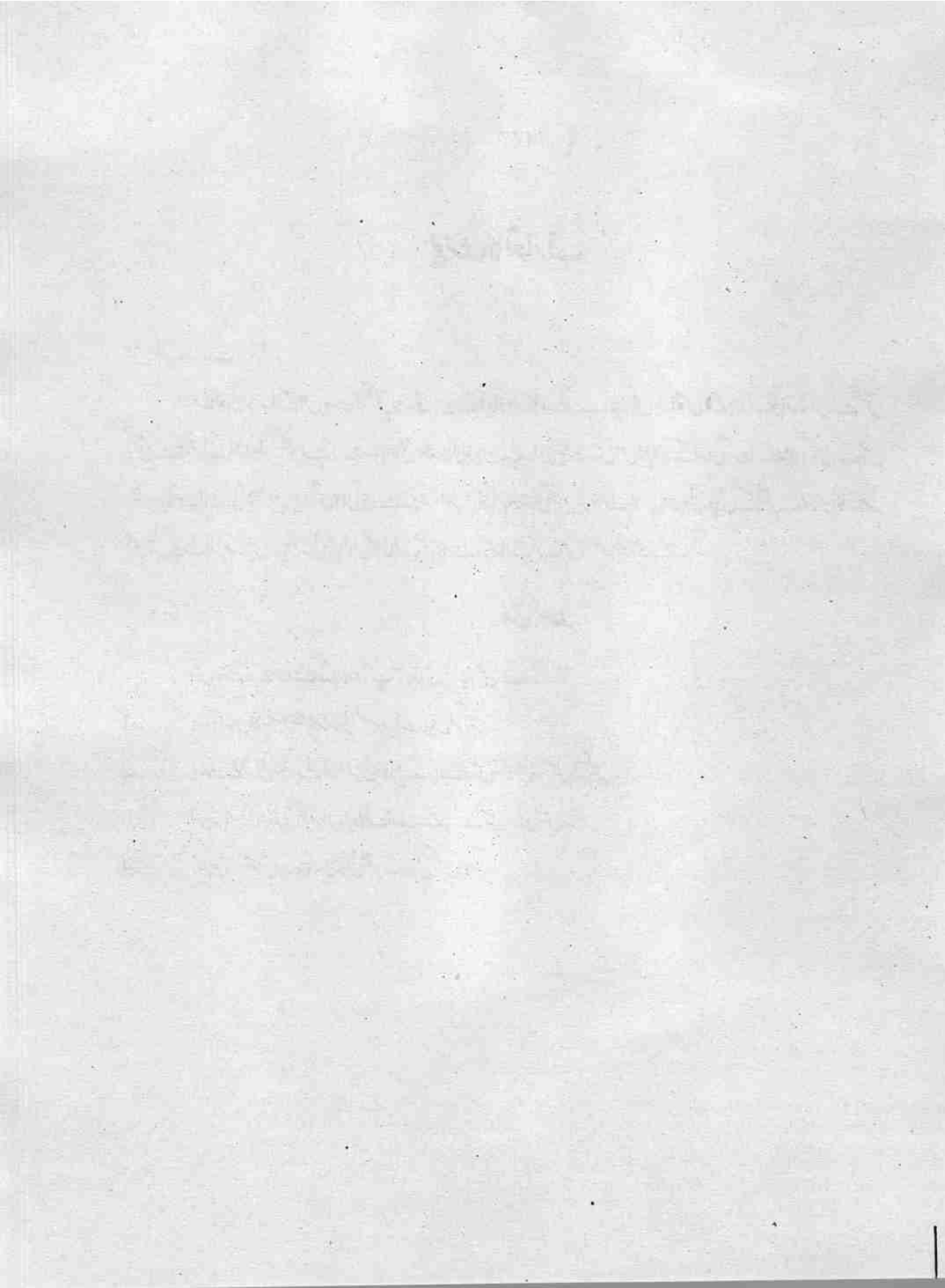
1۔ ہندکو زبان کا آغاز وارتقاء

1.1۔ پس منظر / وجہ تسمیہ

زبانوں کے سلسلے میں یہ یادرکھنا نہایت ضروری ہے کہ ان کی تخلیق کا عمل بھی حیوانات، جمادات اور نباتات کی طرح مختلف زبانوں، ثقافتوں اور تہذیبوں کے ارتباط سے ہوتا ہے۔ جب مختلف زبانیں بولنے والے کسی ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں تو اخذ واکتساب کا عمل نامحسوس طور پر شروع ہو کر ایک ایسی تیسری زبان کو جنم دیتا ہے جو موجود لوگوں کے درمیان رابطے کا کام انجام دے سکے۔ رابطے کی یہ زبان وقت گزرنے کے ساتھ بولی کا درجہ پا جاتی ہے اور جب تحریر وتقریر اور شعروادب کا آغاز ہوتا ہے تو رفتہ رفتہ ترقی کر کے مکمل زبان بن جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ دیگر اشیاء کی نمو مہینوں یا سالوں میں ہوتی ہے مگر زبان کو مکمل ہونے میں بسا اوقات صدیاں لگ جاتی ہیں۔ اسی لئے دو باتیں عام طور پر حتمی انداز سے نہیں کہی جا سکتیں:۔

ایک۔۔۔ یہ کہ زبان کی اصل جائے پیدائش کون سی ہے۔

دوسری۔۔۔ یہ کہ اس زبان کی تخلیق کس عہد سے وابستہ ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ زبان کی تہذیب وترقی کا عمل ہمیشہ جاری رہتا ہے اور اکثر پھیلتی ہوئی لسانی سرحدیں بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ سرحدیں لامحدود ہو جاتی ہیں اور کبھی سمٹتی ہوئی مٹ جاتی ہیں۔ اسی باعث کسی زبان کی جائے پیدائش اور عہد کا تعین قدرے مشکل سمجھا جاتا ہے۔ ہندکو کی وجہ تسمیہ کے بارے میں بھی اکثر قیاس آرائیوں سے ہی کام لیا گیا ہے۔ آیئے ایک نظر ان آراء پر ڈالتے ہیں جو ہندکو زبان کی اس اصطلاح پر تحقیق کرنے والوں نے قائم کی ہیں۔

1۔ ''ایک روایت یہ ہے کہ کوہ ہندوکش کے قریب جو لوگ شہروں میں آباد تھے۔ انہیں دیہات میں رہنے والے آزاد اور جنگجو قبائل ''ہندکی'' کہتے تھے۔''

2۔ ''ہخامنشی شہنشاہوں نے دریائے سندھ کے قریب کے علاقے کا نام ''ہندکو'' رکھا تھا، جو دراصل سنسکرت کے لفظ سندھکو سے ماخوذ ہے۔''

3۔ ''یونانی مورخ اور فلسفی آرین نے برصغیر کے حالات پر مشتمل جو کتاب لکھی ہے اس کا نام ''انڈیکا'' یا ''ہندیکا'' ہے۔ یہ تاریخی حقائق ہندکو زبان کی وجہ تسمیہ سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ یعنی محض دریائے سندھ (انڈس) کے

کنارے کے ساتھ ساتھ بولے جانے کی وجہ سے اس زبان کو ہندکو کہا گیا''۔

4."More than one interpretation has been offered for the term HINDKO. Some associate it with India, other with Hindu people, and still others with the Indus River Sindh, which is, of course, the etymological source of all these terms. Long before partition, Grierson understands it to mean "the language of Hindus" (VIII. I.234).....However, the language use patterns since his day shown the language to be firm established among the non-Hindu people."

5۔ ''یہ ہندکو دراصل سندھکو ہے لیکن صوبہ سرحد کے تمام علاقوں یعنی ہزارہ، پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان میں اسے ہندکو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔''

اگرچہ اکثر زبانوں کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کوئی بات حتمی نہیں کہی جا سکتی، پھر بھی اس نام کے پیچھے مضبوط جواز ضرور ہوتا ہے۔ یہاں گریرسن کی اس بات کی نفی (کہ ہندکو ہندوؤں سے منسلک زبان ہے) خود ان کی اپنی تحقیق سے ہو جاتی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ پشاور ضلع میں 79 ہزار اور پشاور شہر میں 50 ہزار ہندکو بولنے والے لوگ 1901ء میں موجود تھے۔ ہندوؤں کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ وہ ہندکو سے قدرے مختلف زبان یعنی شمال مغربی لہندا بولتے تھے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ہندکو کے ممتاز سکالر اور ہندکو علم اللسان کے ماہر ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان لہندا زبان کے وجود سے ہی منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''لہندا۔۔۔ مغربی پنجاب کی زبانوں کا ایک غلط العام فرضی نام ہے جو علاقے کے لوگوں کو معلوم بھی نہیں ہے۔''

اگرچہ گریرسن کہتے ہیں کہ لہندا اور ہندکو کی حد بندی لسانی جغرافیے سے ممکن نہیں تاہم قومیت کی بنیاد پر دونوں الگ ہوتی ہیں۔ قومیت سے غالباً گریرسن کی مراد مذہب تھی، مگر مذہب زبانوں کو تقسیم نہیں کرتا، شاید ان ہی وجوہ کی بنیاد پر ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل نے گریرسن کی اس تحقیق کو غیر معیاری قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

''لنگوسٹک سروے آف انڈیا (مصنف گریرسن) میں ہندکو کے بارے میں سرسری اور غیر معیاری تذکرہ ہے۔ اس میں اس زبان کو شمال مغربی لہندا سے منسوب کیا گیا ہے۔ پشاوری ہندکو میں دراصل منفرد خصوصیات ہیں اور اسے ایک الگ گروپ کے طور پر ممیّز کیا جا سکتا ہے۔''

اگرچہ ہندکو کو ہند آریائی خاندان کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے تاہم ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ یہ قدیم وادیِ سندھ کی زبان ہے،

جس کے سلسلے یہاں کی قدیم زبان منڈا اور پھر دراوڑی سے جا ملتے ہیں تاہم یہ مختلف زمانوں میں مختلف زبانوں کے اثرات قبول کرتی رہی ہے۔ جن میں دیگر قدیم زبانوں کے علاوہ عربی و فارسی کے الفاظ کی آمیزش ارزانی ہے۔

اس ضمن میں کہ اس کا تخلیقی عہد کون سا قرار دیا جائے، حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب شمال مغربی خطے کے مختلف علاقوں میں اس زبان کے مکمل خدوخال واضح ہوئے، تو اس زبان کو ہندکو کا نام مل گیا۔ اب تک ہونے والی بحث کو لسانی و تاریخی پس منظر کے حوالے سے سمیٹا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ زبان وادیِ سندھ کی تہذیب کی زبان ہے اور اس کے ڈانڈے منڈا اور دراوڑی سے ملتے ہیں۔ اس کا ثبوت اصولی طور پر دو ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک تو اس کی صرفی اور نحوی تراکیب و ترتیب کہ دراوڑی زبانوں میں جملوں کی ترکیب وہی ہے جو آج کی سندھی، پنجابی، براہوئی، بلوچی، پشتو میں رائج ہے یعنی فاعل، مفعول اور فعل۔ دوسری مشترک قدروں کی تفصیل کے لیے جو دراوڑی اور موجودہ ہندکو میں موجود ہیں ڈاکٹر عین الحق فرید کوٹی کی تحقیق ''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' اور راقم الحروف کی کتاب ''اردو کا ماخذ ہندکو'' مطبوعہ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد (2003ء) دیکھی جا سکتی ہیں جن میں سینکڑوں مشترک الفاظ کی فہرستیں بھی درج ہیں۔

1.2۔ لسانی جغرافیہ

ہندکو کسی مخصوص علاقے یا شہر کی زبان نہیں ہے۔ یہ دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر دور و نزدیک آباد لوگوں کی زبان ہے جو علاقائی یا جغرافیائی تغیر و تبدل اور بین الاقوامی لسانی فاصلوں یا بعض تاریخی اثرات کی بناء پر لہجے میں بعض جگہوں پر ذرا مختلف ہو جاتی ہے لیکن لسانی لحاظ سے اور بنیادی طور پر ایک ہے۔ اس زبان کا نام ''ہندکو'' دریائے سندھ کے نام سے مشتق ہے۔

سندھی ''سندھکو'' یا ''ہندکو'' کے الفاظ کی یکسانیت اس فرق و امتیاز کو واضح کرتی ہے جو برصغیر اور ایران میں ''س'' اور ''ہ'' کے آپس میں تبدیل ہونے کے عمومی عمل سے وجود میں آیا۔ دریائے سندھ کے حوالے سے یہ زبان لداخ کے بعد پاکستان کے شمال میں سکردو میں بلتستانی اور پھر کوہستانی علاقے کی گوجر، گوجرِ، یا گوجری قوم کی خانہ بدوشی کے محرم راستوں سے شروع ہوتی ہے اور کوہستان سندھ کے زیریں علاقے مانسہرہ، ایبٹ آباد (پکھلی اور تناول)، ہری پور، تربیلہ، غازی، کوہاٹ اور ان کے نواحی علاقوں میں کلی طور پر اور نوشہرہ، پشاور اور دیگر علاقوں میں جزوی طور پر بولی جاتی ہے۔

اس جغرافیائی و لسانی تخصیص و تقسیم کو ذیل کی تفصیل کے مطابق دریائے سندھ کے مغربی اور مشرقی کناروں کے علاقوں سے واضح کیا جاتا ہے۔

(الف) دریائے سندھ کے مغربی علاقے

پشاور و مضافات پشاور	پشاوری ہندکو
تپہ خالصہ	خالصہ کی ہندکو
نوشہرہ	ہندکو
اکوڑہ	پشتو، ہندکو
نوشہرہ تا کنڈ (دریائے کابل)	
کے کنارے کنارے	ہندکو
نظام پور	ہندکو
کوہاٹ	کوہاٹی ہندکو
بنوں شہر	ہندکو

(ب) دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کے علاقے

مانسہرہ	ہندکو، تناولی، ڈھونڈی، کرالی
	جو ولایت پکھلی کی زبان ہے۔
ایبٹ آباد	ہندکو
ہری پور	ہندکو
تربیلہ، غازی	ہندکو

اس جغرافیائی، لسانی تقسیم کو پیش نظر رکھا جائے تو ہندکو کا نام ہزارہ، کوہاٹ، بنوں، پشاور اور نوشہرہ وغیرہ میں رائج نظر آتا ہے۔ جہاں تک دریائے سندھ کے مغربی کناروں کا تعلق ہے ان میں سب سے زیادہ اہم پشاور کی ہندکو ہے اور اس کا بنیادی سبب یہ بھی ہے کہ یہ شہر ہر زمانے میں مرکز کی حیثیت لیے رہا اور اسے ہر بیرونی آنے والے کے راستے میں درہ خیبر پار کرنے کے بعد پہلا پڑاؤ بننے کا شرف حاصل رہا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر کرسٹوفر شیکل (پروفیسر ساؤتھ ایشین لینگو یجز، سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز لندن) پشاوری اور کوہاٹی ہندکو پر اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:۔

''پشاوری ہندکو کی سماجی لسانیاتی تصویر بہت حد تک کوہاٹی سے ملتی ہے لیکن پشاوری ہندکو کا

دائرہ وسیع تر ہے۔ پشاور میں صوبہ کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے ہندکو بولنے والوں کی
تعداد کافی زیادہ ہے۔ یہ ہندکو بولنے والے لوگ ان دیہاتوں میں بھی آباد ہیں جو مشرق کی
سمت جانے والی شاہراہِ شیر شاہ یا "جرنیلی سڑک" The Grand Trunk
Road پر نوشہرہ اور اٹک تک واقع ہے۔"

1.3۔ الفبائی نظام

پاکستان کی سب زبانوں کی طرح ہندکو کا الفبائی نظام بھی عربی نظام پر مبنی ہے البتہ ہندکو کے ۶ مصمتے ایسے ہیں جن کے لئے اس نظام میں کوئی علامت موجود نہیں ہے۔ ان کے لئے مختلف لکھنے والے مختلف علامات استعمال کرتے ہیں لیکن متفقہ معیاری علامات کا ابھی تک تعین نہیں ہوسکا ہے۔ ان میں سے ایک مصمتہ (consonant) وہ ہے جسے بین الاقوامی صوتیاتی انجمن International Phonetic Association(IPA) کی جدول میں ɽ̃ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

اس امر کا فیصلہ کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ ہم اس مصمتے کا تجزیہ کرلیں۔ یہ تجزیہ دو سطحوں پر ہوسکتا ہے۔ ایک صوتیاتی سطح (Phonetics Level) پر اور دوسرا علم الصوتی سطح (Phonological Level) پر۔

صوتیاتی سطح پر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مصمتہ کوزی۔ مصیت۔ انفی دستکہ ہے یعنی اس کی تخلیق کے وقت نوک زبان پیچھے کو مڑ کر اوپرے مسوڑے کے عقبی حصہ سے ٹکرا کر فوراً الگ ہوجاتی ہے اور اس عمل کے دوران صوتی اوتار مرتعش رہتے ہیں جبکہ ہوا ناک کے راستہ سے خارج ہو رہی ہوتی ہے۔ اگر اس کا موازنہ کوزی۔ مصیت۔ غیر انفی۔ دستکہ سے کریں تو معلوم ہوگا کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی تخلیق کے دوران ہوا کا اخراج ناک کے ذریعہ ہو رہا ہوتا ہے اور ثانی الذکر کی صورت میں یہ اخراج منہ کے راستے سے ہو رہا ہوتا ہے اور ناک کا رستہ بند ہوتا ہے۔ ثانی الذکر کے لئے اردو میں ایک علامت پہلے ہی سے موجود ہے یعنی ڑ جسے IPA کی جدول میں ɽ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اول الذکر علامت پر انفی (یعنی نون غنہ کی) علامت ~ کا اضافہ کرکے ایک نئی علامت ɽ̃ بنائی گئی ہے۔ اب ہندکو میں بھی ایک ایسی نئی علامت ڑ پر نون غنہ کی علامت کا اضافہ کرکے نئی علامت بنائی جاسکتی ہے۔ یعنی ڑؕ۔

یہاں اس مصمتہ کا علم الصوتی سطح پر بھی تجزیہ کرلیں تو بہتر ہوگا۔ ایسا کرنے کے لئے ہمیں اس مصمتہ کا مختلف ماحول میں جائزہ لینا ہوگا۔

آیئے اسے مندرجہ ذیل ساختمانی تراکیب میں دیکھتے ہیں:

مادّہ+مصدری لاحقہ=مصدر

۱	کڈّ+مصدری لاحقہ=مصدر	کڈّڑا
۲	وَجّ+مصدری لاحقہ=مصدر	وجّڑا
۳	آ +مصدری لاحقہ=مصدر	آنڑا
۴	موڑ+مصدری لاحقہ=مصدر	موڑنا
۵	کر+مصدری لاحقہ=مصدر	کرنا
۶	تل+مصدری لاحقہ=مصدر	تلنا

اوپر کی مثالوں میں ۱،۲،۳ میں مصدری لاحقہ نڑا کی صورت میں ہے جبکہ ۴،۵،۶ میں نا کی صورت میں ہے۔ اگر ہم ہندکو کے تمام افعال کا جائزہ لیں تو ہمیں یہی دو صورتیں ملیں گی یعنی نڑ اور ن کا باہم تبادلہ۔ ان کا کہیں بھی ڑ سے تبادلہ نہیں ہوتا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اس بحث کا یہ مقام نہیں ہے۔ البتہ اس تجزیہ سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس لاحقہ کی ایک صورت انفی کوزی یعنی نڑ ہے اور دوسری انفی غیر کوزی یعنی ن ہے۔ اس تجزیہ کے پیش نظر اس علامت کو ن میں ترمیم کر کے لکھنا صحیح ہوگا۔ یعنی ݨ لکھنا چاہیے۔

ابھی تک جو علامات اس مصمتہ کے لئے استعمال ہورہی ہیں وہ یہ ہیں:

ڑ، ݨ، نڑ جیسے کوڑ، کوݨ، کونڑ۔ ان علامتوں میں دوسری علامت ہمارے ساختمانی تجزیہ سے مطابقت رکھتی ہے جبکہ آخری علامت ہمارے صوتیاتی تجزیہ کے زیادہ قریب ہے تاہم "ݨ" کی علامت منتخب کرنے میں یہ قباحت ہے کہ یہ اس وقت دستیاب سب ہی سوفٹ ویئرز میں نہیں پائی جاتی۔ اس لئے اس کی کمپیوٹر پر املا کاری (composin g) میں دشواریاں پیش آسکتی ہیں دوسری طرف "نڑ" کے انتخاب پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسے قاری غلط بھی پڑھ سکتا ہے یعنی کونڑ کی بجائے (ک و ن ٹ ر) یا (ک و ن ڑ) بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے اگر نون پر اُلٹی جزم ڈال کر غنہ کو اس علامت کا لازمی جز و قرار دیا جائے اور اسے ہمیشہ "نڑ" ہی لکھا جائے تو یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان کم ہوجائے گا۔

مندرجہ بالا کے علاوہ ہندکو میں پانچ اور ایسے مصمتے ہیں جن کے لئے موجودہ تختی میں کوئی علامات موجود نہیں ہیں۔ ان مصمتوں کی املا میں بھی اختلاف ہے۔ انہیں درج ذیل تین صورتوں میں لکھا جاتا ہے:

بھ، دھ، ڈھ، گھ، جھ جیسے بھولا، دھو، ڈھولا، گھول، جھول

یا

پہ، تہ، ٹہ، کہ، چہ جیسے پہولا، تہو، ٹہولا، کہول، چہول

یا

پ۔ہ، ت۔ہ، ٹ۔ہ، ک۔ہ، چ۔ہ جیسے پوہلا، توہ، ٹوہلا، کوہل، چوہل

مندرجہ بالا علامات میں سے کوئی بھی تسلی بخش نہیں۔ اس کے باوجود ہر لکھنے والا اپنی علامت کو صحیح کہتا ہے۔ اگر یہاں ان مصمتوں کا بھی صوتیاتی جائزہ لے لیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

IPA کی جدول میں ان میں سے کسی کے لئے کوئی علامت موجود نہیں ہے لہٰذا میں نے اپنے پی ایچ۔ڈی کے مقالہ میں موجودہ علامات میں ترمیم کر کے انہیں اس طرح لکھا ہے:

p̌ , ť , ṯ̌ , ǩ , č

یہ صورت اختیار کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان مصوتوں کی تخلیق کے دوران سُر تی (tone) درمیانی سطح سے نیچے کی طرف آتی ہے اور پھر بلند ہوتی ہوئی اسی سطح پر پہنچ جاتی ہے جس سطح سے شروع ہوئی تھی۔ اس لئے اسے ˇ کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ہم ہندکو میں بھی یہی علامت استعمال کر سکتے ہیں۔ مثلاً

پ̌، ت̌، ٹ̌، ک̌، چ̌ جیسے پ̌ولا، ت̌و، ٹ̌ولا، ک̌ول، چ̌ول

علامتوں کے بارے میں یاد رہے کہ انہیں ابتداً اٹکل سے چنا جاتا ہے بعد میں یہ ان آوازوں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے اور کثرت استعمال کے سبب اس قدر مانوس ہو جاتی ہیں کہ سب با آسانی سمجھ لیتے ہیں اور ان میں سے کسی علامت کو لکھی دوسری آواز سے منسوب کرتے ہوئے جھجھکتے ہیں چنانچہ نئی یا ترمیم شدہ علامتوں کو متعین کرتے وقت ایک تو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ وہ رائج علامات سے صورت میں قریب ترین ہوں اور دوسری لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انہیں لکھنا پڑھنا آسان ہو۔ اب چونکہ کمپیوٹر پر املا کاری ہوتی ہے اسلئے یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ رائج الوقت سوفٹ ویئرز میں ان کی املا کاری ممکن ہو ورنہ بیشمار مسائل پیش آسکتے ہیں۔

یہ تو تھی مصمتوں (consonants) کی بات اب مصوتوں (vowels) کی طرف آتے ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ اردو، پنجابی وغیرہ سے چنداں مختلف نہیں ہیں اسلئے ان کی علامات یا حروف تہجی کا مسئلہ نہیں ہے۔ البتہ ہندکو کی ایک خصوصیت پاکستان کی دوسری زبانوں سے مختلف ہے۔ وہ یہ کہ اس میں نیم وامدور مصوتہ جسے اردو میں وَ سے اور IPA کی جدول میں " ɔ " سے یا پھر au سے لکھا جاتا ہے، نہیں ہے۔ بلکہ صرف نیم بندمدور مصوتہ استعمال ہوتا ہے جسے اردو میں و سے اور IPA کی جدول میں [o] سے ظاہر

کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فَوج کو ہندکو میں فوج لکھا اور پڑھا جائے گا۔

1.4۔ چند بنیادی قواعد:

ہندکو زبان کے قواعد بنیادی طور پر ویسے ہی ہیں جیسے اردو اور پاکستان کی دیگر علاقائی زبانوں کے ہیں تاہم بعض جگہوں میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔

تذکیر و تانیث:

تذکیر و تانیث کے اصول اردو اور دوسری پاکستانی زبانوں سے بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ تفاوت چند اسماء کی تذکیر و تانیث میں ہے مثلاً ہندکو میں سُورُت (سورج)، دَرُّد (درد) اور اسکول مؤنث ہیں۔

واحد جمع:

ہندکو میں واحد کی جمع بنانے کے طریقے کم و بیش پنجابی جیسے ہی ہیں۔

مثلاً الف یا ہ پر ختم ہونے والے اسماء کی جمع ہ یا الف کو ے سے بدل کر بناتے ہیں جیسے بندہ سے بندے، ڈنڈا سے ڈنڈے جبکہ باقی مذکر الفاظ جمع کے صیغہ میں بھی اکثر مواقع پر واحد کی صورت میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً دن گزر گیا اور دن گزر گئے۔ ایسے مؤنث اسماء جن کے آخر میں "ی" ہو ان کی جمع "اں" کا لاحقہ لگا کر بناتے ہیں۔ مثلاً "کُڑی" سے "کُڑیاں"، اگر آخر میں مصمتہ ہو تو جمع کے صیغہ میں یہ مشدد ہو جاتا ہے۔ جیسے "رَن" سے "رَنّاں"۔

ضمائر:

ہندکو میں بعض ضمائر اردو اور پنجابی سے مختلف ہیں۔ مندرجہ ذیل گردانیں دیکھئے:

	متکلم		مخاطب		غائب	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر رمؤنث	میں	اسی	تو	تسی	او	او

اس حالت میں مذکر اور مؤنث کے لئے ایک سے صیغے استعمال ہوتے ہیں۔

حالت فاعلی:

حالتِ فاعلی میں ان کے آخر میں 'نے' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ فاعلی حالت میں تذکیر و تانیث کے صیغے ایک سے ہیں۔

	متکلم		مخاطب		غائب	
مذکر رمؤنث	مئے	سانئے	تئے	سُوانئے	اُنئے	اُناں نے

حالت مفعولی:

حالتِ مفعولی میں ان کے آخر میں ' نے ' کی جگہ 'نوں' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔اس حالت میں بھی تذکیر و تانیث کے صیغے ایک سے رہتے ہیں۔

	متکلم		مخاطب		غائب	
مذکر رمؤنث	منّوں	سانوں	تنّوں	سُوانوں	اُنوں	اُناں نوں

حالت اضافی:

حالتِ اضافی میں لاحقہ کی صورت صیغے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور مضاف اور مضاف الیہ میں مطابقت ہوتی ہے۔جیسا کہ درج ذیل گردان سے ظاہر ہے:

	متکلم		مخاطب		غائب	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
مذکر	میرا کُتا	ساڈّے کتے	تیرا کتا	سُواڈّے کتے	اُزّا کتا	اُناں دے کتے
مؤنث	میری کُتی	میریاں کُتیاں	تیری کُتی	تیریاں کُتیاں	اُزّی کُتی	اُناں دیاں کُتیاں

مثلاً

میرا کتا	میرا کتا	میری کتی	میری کتیا
میرے کتے	میرے کتے	میریاں کتیاں	میری کتیاں
ساڈا کتا	ہمارا کتا	ساڈی کتی	ہماری کتیا
ساڈے کتے	ہمارے کتے	ساڈیاں کتیاں	ہماری کتیاں
تیرا کتا	تیرا کتا	تیری کتی	تیری کتیا
تیرے کتے	تیرے کتے	تیریاں کتیاں	تیری کتیاں
سواڈا کتا	تمہارا (آپ کا) کتا	سواڈی کتی	تمہاری (آپ کی) کتیا

سواڈے کتے	تمہارے (آپ کے) کتے	سواڈیاں کتیاں	تمہاری (آپ کی) کتیاں
اُڑّا کتا	اس کا کتا	اُڑّی کتی	اس کی کتیا
اُڑّے کتے	اس کے کتے	اُڑّیاں کتیاں	اس کی کتیاں
اُناں دا کتا	ان کا کتا	اناں دی کتی	ان کی کتیا
اُناں دے کتے	ان کے کتے	اناں دیاں کتیاں	ان کی کتیاں

دیگر مرکبات میں بھی پنجابی کی طرح مرکب کے دونوں اجزاء میں تذکیر وتانیث اور واحد جمع میں مطابقت ہوتی ہے جیسے گورا بندہ، گورے بندے، گوری بندی، گوریاں بندیاں۔

جملہ کی ساخت:

جملہ چاہے اسمیہ ہو یا فعلیہ اس کی ساخت ویسی ہی ہے جیسی کہ اردو یا دوسری علاقائی زبانوں کی۔ فاعل، مفعول اور فعل کی ترتیب بھی وہی ہے۔

چند جملے دیکھئے:

اے میری کتاب اے (یہ میری کتاب ہے)

اے میریاں کتابن (یہ میری کتابیں ہیں)

منے کتاب لکھی ائی (میں نے کتاب لکھی تھی)

منے کتاباں لکھیاں ائیاں (میں نے کتابیں لکھی تھیں)

کُڑی نے کتاب لکھی ائی (لڑکی نے کتاب لکھی تھی)

کُڑیاں نے کتاب لکھی ائی (لڑکیوں نے کتاب لکھی تھی)

کُڑی نے کتاباں لکھیاں ائیاں (لڑکی نے کتابیں لکھی تھیں)

کُڑیاں نے کتاباں لکھیاں ائیاں (لڑکیوں نے کتابیں لکھی تھیں)

فعل:

فعل کے وہی تین بنیادی زمانے اور وہی صیغے ہیں جو پاکستان کی سب زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں لیکن ان کی علامات اور ان کے بنانے کے طریقے قدرے مختلف ہیں۔ افعال کو مختلف بنیادوں پر مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ہم انہیں پہلے دو گروہوں

میں تقسیم کرتے ہیں یعنی افعال ناقص اور افعال تام:

افعال ناقص

افعال ناقص وہ افعال ہیں جو جملہ اسمیہ میں آتے ہیں یا فعل کے مختلف صیغے بنانے کے کام آتے ہیں مثلاً ہیوے (ہے)، ایا (تھا) ہوسی (ہوگا)

الف) وہ جو جملہ اسمیہ کے آخر میں آتے ہیں۔

ہندکو میں بھی پاکستان کی دوسری زبانوں کی طرح ایسے تین افعال ناقص ہیں یعنی ایا (تھا)، ہیوے (ہے) اور ہوسی (ہوگا) جو بالترتیب ماضی، حال اور مستقبل کے معنی دیتے ہیں:

فعل ناقص ماضی مطلق

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	ایاں	ائیں	ایا	ائے	ایو	ائے
مؤنث	ائی	ائی یوں	ائی	ائے	ائی یو	ائیاں

جیسے:

میں اَیاں (میں تھا)۔ اسی اَئے (ہم تھے)۔

تو اَئیں (تو تھا)۔ تُسی اَیو (تم تھے)۔

او اَیا (وہ تھا)۔ او اَئے (وہ تھے)۔

فعل حال ناقص

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر رمؤنث	ہَیں واں	ہَیں ویں	ہے وے	ہَیں واں	ہے وو	ہے وُن

جیسے:

میں ہَیواں (میں ہوں)۔ اسی ہَیواں (ہم ہیں)۔
توہَیویں (تو ہے)۔ تُسی ہَیو (تم ہو)۔
اوہَیوے (وہ ہے)۔ اوہَیوُن (وہ ہیں)۔

فعل مستقبل ناقص

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر/مؤنث	ہوساں	ہوسیں	ہوسی	ہوسی ہیں	ہوسو	ہوسُن

فعل مستقبل ناقص میں تذکیروتانیث دونوں کے لئے ایک ہی صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

میں ہوساں (میں ہوں گا/ہوں گی)۔ اسی ہوسی ہیں (ہم ہوں گے)۔
توہوسیں (تو ہوگا/ہوگی)۔ تسی ہوسو (تم ہوگے)۔
اوہوسی (وہ ہوگا/ہوگی)۔ اوہوسُن (وہ ہوں گے)۔

افعال تام

افعالِ تام وہ افعال ہیں جو جملہ فعلیہ میں آتے ہیں اوران میں کام کا کرنا، ہونا یا سہنا پایا جاتا ہے۔ روایتی قواعد میں مصدر کو بنیادی اکائی قرار دے کر اس سے دوسرے صیغے اور مشتقات وضع کئے جاتے ہیں۔ مثلاً مصدر سے علامت مصدر ''نا'' ہٹادیا جائے تو فعلِ امر بن جاتا ہے جیسے پھرنا سے پھر۔ یا فعل ماضی بنانے کے لئے مصدر سے علامت مصدر ہٹا کر ''ا'' لگادیا جائے تو فعل ماضی بن جاتا ہے مثلاً پھرنا سے ''پھر'' حاصل ہوا، اس پر ''ا'' کا اضافہ کیا تو ''پھرا'' فعل ماضی بن گیا۔

بہتر طریقہ یہ ہے کہ فعل امر کو بنیادی اکائی یا مادّہ (root) مان کر اس سے دوسرے صیغے اور مشتقات حاصل کئے جائیں۔ ایسا کرنا ایک تو اصولاً درست ہے دوسرے یہ کہ کوئی مشتق حاصل کرنے کے لئے ہر بار ''نا'' ہٹانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

اب فعل کی بنیادی اکائی 'مادّہ' کو مان کر اس سے دیگر مشتق الفاظ حاصل کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مادّہ سے فعل امر کے صیغے بنانے کے قاعدے دیکھئے:

فعل امر کے صرف دو ہی صیغے ہیں۔ واحد مخاطب اور جمع مخاطب۔

(الف) واحد مخاطب کے لئے مادّہ کو جوں کا توں رہنے دیتے ہیں جیسے چل، کھا، پی وغیرہ۔

(ب) اگر مادّہ کے آخر میں ر یا ڑ ہوتو جمع مخاطب بنانے کے لئے و کا اضافہ کرتے ہیں جیسے کر سے کرو، مُڑ سے مُڑو۔ چل سے چلو، لکھ سے لکھو

(ج) اگر مادّہ کے آخر میں مصوتہ (حرف علت) ہوتو جمع مخاطب بنانے کے لئے وو کا اضافہ کرتے ہیں جیسے گا سے گاوو، پی سے پیوو، رو سے رووو

مصدر:

اصل سے مصدر بنانے کے قاعدے:

ا۔ اگر اصل کے آخر میں ل، ر یا ڑ ہوتو نا کا اضافہ کرتے ہیں جیسے کر سے کرنا، مُڑ سے مُڑنا۔

۲۔ اگر اصل کے آخر میں مصوتہ ہو یا ل، ر اور ڑ کے علاوہ کوئی اور مصمتہ ہوتو ڑا کا اضافہ کرتے ہیں جیسے کھا سے کھاڑا، لِکھ سے لِکھڑا۔

ماضی مطلق:

(الف) اگر مادّہ کے آخر میں ی ہوتو واحد مذکر کے لئے تّ اور ا بڑھادیتے ہیں جیسے پی سے پیتا، سی سے سیتا

(ب) اگر مادّہ کے آخر میں ے ہوتو واحد مذکر کے لئے ے کو زیر سے بدل کر تّ اور ا بڑھادیتے ہیں جیسے لے سے لِتا دے سے دِتا

(ج) اگر مادّہ کے آخر میں کوئی اور مصوتہ ہوتو واحد مذکر کے لئے یا بڑھادیتے ہیں جیسے آ سے آیا، رو سے رویا

(د) اگر مادّہ کے آخر مصمتہ ہوتو واحد مذکر کے لئے ا بڑھادیتے ہیں جیسے ڈر سے ڈرا، مُڑ سے مُڑا، سُک سے سُکا، لکھ سے لکھا

استثنا: کر سے کیتا، مر سے مویا، جا سے گیا، بیہ سے بیٹھا

گردان فعلِ ماضی مطلق (لازم)

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	آیا	آیا	آیا	آئے	آئے	آئے
مؤنث	آئی	آئی	آئی	آئی	آئیاں	آئیاں

گردان ماضی بعید (لازم)

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	آیاایاں	آیاائیں	آیاایا	آئے ایاں	آئے ایو	آئے ائے
مؤنث	آئی ائی آں	آئی ائی ایں	آئی ائی	آئیاں ائی آں	آئیاں ائی او	آئیاں ائیاں

ماضی استمراری (لازم)

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	آنّاں پیاایاں	آنداپیاائیں	آنداپیاایا	آندے پیئے ایاں	آندے پیئے ایو	آندے پیئے ائے
مؤنث	آنّی پئی ائی آں	آندی پئی ائی ایں	آندی پئی ائی	آندے پیئے ایاں	آندے پیئے ایو	آندیاں پئیاں ائیاں

نوٹ: بعض افراد ماضی استمراری کے صیغہ جمع مؤنث غائب کے لئے بھی جمع مذکر غائب کا صیغہ استعمال کرتے ہیں۔

ماضی شرطیہ

شرطیہ جملہ میں حروف شرط ''اَگر'' استعمال ہوتا ہے اور واحد مذکر متکلم بنانے کے لئے مادّہ میں ''دا'' کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے ''کر'' سے کردا، ''لِکھ'' سے لِکھدا۔ اگر مادّہ کے آخر میں مصوتہ ہو تو ''ندا'' بڑھایا جاتا ہے جیسے ''رو'' سے ''روندا''، ''پی'' سے ''پیندا''، ''سے'' سے ''سیندا'' اور ''کھا'' سے ''کھاندا'' مثلاً:

اگر میں اے کم کردا	اگر میں یہ کام کرتا
اگر میں مضمون لکھدا	اگر میں مضمون لکھتا
اگر میں روندا	اگر میں روتا
اگر میں پیندا	اگر میں پیتا
اگر میں چول سیندا	اگر میں چاول بھگوتا
اگر میں فروٹ کھاندا	اگر میں فروٹ کھاتا

گردان ماضی شرطیہ (لازم)

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	آندا	آندا	آندا	آندے	آندے	آندے
مؤنث	آندی	آندی	آندی	آندیاں	آندیاں	آندیاں

فعل حال

مادّہ کے آخر میں اگر مصمتہ ہوتو واحد مذکر متکلم بنانے کے لئے ناں واں کا اضافہ کرتے ہیں جیسے "کر" سے "کرناواں"، "لکھ" سے "لکھناواں"۔

مادّہ کے آخر میں اگر مصوتہ ہوتو واحد مذکر متکلم بنانے کے لئے ناں واں کا اضافہ کرتے ہیں جیسے آ سے آناں واں پی سے پیناں واں۔ مثلاً:

میں کم کرناں واں	میں کام کرتا ہوں
میں چٹھی لکھناں واں	میں چٹھی لکھتا ہوں
میں آناں واں	میں آتا ہوں
میں شربت پیناں واں	میں شربت پیتا ہوں

گردان فعل حال

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	آناں واں	آناں ایں	آنداا ے	آنے آں	آندے او	آندین
مؤنث	آنی آں	آنی ایں	آندی اے	آنے آں	آ آندے او	آندِیَن

فعلِ حال کی ایک اور صورت بھی ہے جو درج ذیل گردان میں دی گئی ہے:

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	آناں	آنئیں	آندے	آنے آں	آندے او	آندین
مؤنث	آنی آں	آنی ایں	آندی اے	آنے آں	آندے او	آندِیاَن

فعل حال جاری (لازم)

فعل حال جاری کا صیغہ واحد مذکر متکلم بنانے کے لئے فعل حال کے صیغہ واحد مذکر متکلم میں ساق (stem) ''آناں'' اور ''واں'' کے درمیان ''پیاں'' کا اضافہ کرتے ہیں۔ جیسے، آناں، پیاں، واں۔ مثلاً:

میں آناں پیاں واں	میں آرہا ہوں
میں مڑناں پیاں واں	میں مڑ رہا ہوں
میں کتاب لیناں پیاں واں	میں کتاب لے رہا ہوں
میں انوں بلاناں پیاں واں	میں اس کو بلا رہا ہوں

گردان فعل حال جاری

	واحد			جمع		
	متکلم	مخاطب	غائب	متکلم	مخاطب	غائب
مذکر	آناں پیاں واں	آناں پیاں ایں	آندا پیا وے	آنے پیئے آں	آندے پئے او	آندے پئین
مؤنث	آنی پئیں آں	آنی پئیں ایں	آندی پئی اے	آنے پیئے آں	آندے پئے او	آندیاں پئی اں[1]

بعض افراد جمع غائب مؤنث کے لئے بھی جمع غائب مذکر کا صیغہ استعمال کرتے ہیں

(نوٹ: الفبائی نظام اور بنیادی قواعد سے متعلق، یونٹ کا یہ حصہ صفحہ نمبر 183 تا 196 ڈاکٹر الٰہی بخش اعوان کا تحریر کردہ ہے)

2۔ ہندکو کی ابتدائی تحریریں

صوبہ سرحد میں ہمیں ہندکو ادب کا سراغ قدیم دور سے دستیاب ہے اور اس کی قدامت کا ثبوت خروشتی زبان کا وہ کتبہ ہے جو ٹیکسلا کے قریب آرہ کے مقام سے برآمد ہوا اور 41ء سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کتبہ راجا اشوک کے زمانے میں آرہ میں ایک کنواں کھودے جانے کے موقعے پر کنویں کی کھدائی کی تاریخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک شخص نے جس کا تعلق پشاور سے تھا اپنی آخرت اور اپنے خاندان کے فائدے یعنی نجات کے لئے یہ کنواں تعمیر کرایا تھا۔ ذیل میں اس کتبے کی ابتدائی سطر کی خواندگی اردو رسم الخط کے تحت پیش کی جاتی ہے جو ہندکو سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

"مہاراجہ راجاس، راجاتراجاس، دیوپتراس، قیصراس۔۔۔۔"

اردو ترجمہ: "بڑا راجا ہے، تین پشتوں سے راجا ہے، دیوتا کا بیٹا ہے، قیصر ہے۔۔۔۔۔"

(نوٹ: براہوئی کی ابتدائی تحریر کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن براہوئی نے بھی افغانستان سے دریافت ہونے والے تقریباً اسی دور کے ایک سکے کا حوالہ دیا ہے جس کے ایک طرف خروشتی میں تقریباً تقریباً یہی الفاظ درج ہیں۔ مرتب)

اس سلسلے میں قدیم ترین تحریروں کا تذکرہ ہمیں سنسکرت اور پنجابی ادب کی تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایسی ہی ایک تاریخی داستان کا ذکر ڈاکٹر موہن سنگھ نے اپنے مقالے "پنجابی" میں کیا ہے۔ جس میں ایک خصوصی بات اس قدیم گوشت کھانے والی قوم کی ہے جس کا نام

پشاچہ تھا۔اس زبان کا واضح سراغ شمالی سرحد کی پہلی ادبی تخلیق یعنی طویل کہانی "وڈ کہا" یا "وڈ کہان" میں پایا جاتا ہے جو ایک قدیم ادیب گنا دھایا نے تحریر کی تھی۔ ہندکو اور پنجابی زبانوں میں 'وڈا' بڑے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔اسی طرح "کنال کی کہانی" کا تعلق ٹیکسلا سے ہے۔ادبی دنیا میں اس ہندکو کہانی کو یوریپیڈیس کے یونانی المیے ہائپو لی ٹس (Hippolytus) اور ایس۔ کے۔ راسین کے کئے ہوئے انگریزی ترجمے فیدرز (PHAEDRS) سے مشابہ سمجھا جاتا ہے۔کنال کا اصل نام دھرم وی وردھن تھا۔باپ اسے پیار سے کنال کہتا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں چھوٹی اور خوبصورت تھیں۔

ہندکو زبان کا ایک اور ادب پارہ مسلمانوں کے سرزمینِ ہند پر قدم رکھنے کے دور سے تعلق رکھتا ہے۔یہ ادب پارہ مہابھارت کا ہندکو زبان میں ترجمہ ہے۔یہ وہ زمانہ ہے جب ہندو شاہیہ سلطنت افغانستان تک پھیل چکی تھی۔اس کا تذکرہ ڈاکٹر ایس کے چیٹر جی نے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔چیٹر جی مزید کہتے ہیں کہ اصل عربی ترجمہ میں سنسکرت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا بلکہ کسی پرانی بھاشا یا نئی ہند آرین بولی مثلاً ہندکی (مغربی پنجابی) یا سندھی سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

ہندکو کی تاریخ کا ایک اور ادبی نمونہ راجا رسالو کے کارناموں پر مبنی ہے۔اس کہانی کو باقاعدہ طور پر ایک پٹواری معرضِ تحریر میں لایا جس نے یہ کہانی ۱۸۶۹ء میں مسٹر جے ڈی ڈل میرک (J.D.Delmerick) کو سنائی جو اس وقت پنجاب کمیشن کے رکن تھے۔اس کہانی کو اس گمنام پٹواری نے نظم ونثر دونوں میں تحریر کیا لیکن آر سی ٹمپل نے حکایات پنجاب مرتب کرتے وقت نثر کو لفظ بہ لفظ مرتب نہیں کیا۔کہانی کے مطابق یہ داستان تو سیالکوٹ کے راجا سالباہن کے لڑکے راجا رسالو سے متعلق ہے لیکن راجہ رسالو کا مہموں پر نکلنے کے بعد جن مقامات سے گذرنے کا تذکرہ ہے ان کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے۔یہی سبب ہے کہ راجہ رسالو کے گیت ہزارہ کے سارے علاقے میں آج بھی رائج اور مقبول ہیں۔محمد ارشاد اپنی تحقیق "تاریخ ہزارہ" میں رقم طراز ہیں

"راجا رسالو جس کے قصے ابھی تک اس علاقے میں بیان ہوتے چلے آرہے ہیں ولایت پکھلی کا نامور حکمران تھا"

مزے کی بات یہ ہے کہ راجا رسالو کو مسٹر ٹمپل کی مذکورہ کتاب میں پورن بھگت کا سوتیلا بھائی بتایا گیا ہے اور پورن بھگت کی کہانی کو ہندوؤں کی ایک مذہبی یا دھارمک کہانی تسلیم کیا گیا ہے اور اس کہانی پر کئی سٹیج ڈرامے اور فلمی کہانیاں بنائی گئی ہیں۔

اسی طرح گورو گورکھ ناتھ ایک پنتھی جوگی تھا اور اس کا تعلق پشاور سے تھا۔اس نے پشاور کی مشہور تاریخی عمارت گور کھٹڑی (جو دراصل گورکھ ہٹڑی ہے) میں اپنے پنتھ کے درس دیئے۔گورکھ ناتھ موسیقی سے بھی لگاؤ رکھتا تھا اسی لئے اس نے شاعری کو راگ راگنیوں خصوصاً رام کلی، دھناسری، اساوری، بھیرویں، راگ گوڑ اور کیدارا میں موزوں کیا۔اس کے بعد جن شعرا نے ہندکو میں لکھا ان میں حاجی بابا رتن اور ہیم چند وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خاص وعام ہیں۔ جیسے بختہ ورے، بی بی جان، پری چہرہ، پھلاں باشہ زادی، جلالیہ وغیرہ۔ مختار علی نیر نے 1994ء میں "معتلاں" کے نام سے ہندکو ضرب الامثال بھی شائع کیں جن کے ہمراہ تشریح بھی دی گی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان کی طرف شائع کردہ سلطان سکون کی کتاب "ہندکو ضرب الامثال" میں 792 ضرب الامثال اور اردو میں اُن کا ترجمہ اور تشریح بھی دی گی ہے۔ ان کی دوسری کتاب "کاری دی گل" (1994ء) چھوٹی چھوٹی لوک کہانیوں اور دلچسپ واقعات پر مشتمل ہے جن کے بارے میں وہ دیباچہ میں کہتے ہیں "اس کتاب کی کہانیاں کچھ مقامی اور کچھ غیر مقامی ہیں۔ کچھ تو میں نے اپنے بچپن میں بڑے بوڑھوں کی زبانی سنیں اور کچھ بعد کی عمر میں ادھر اُدھر سے سنتا رہا تاہم یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بہت سی کہانیاں اور واقعات جو ادھوری صورت میں تھے انہیں میں نے اپنی تخلیقی صلاحیت سے مکمل کیا ہے۔" سلطان سکون کی مرتب کی ہوئی کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی یعنی ان میں قدیم کہانیوں کی طرح عمومی اخلاقیات کے حوالے سے کوئی نہ کوئی دانش اور دانائی کی بات ضرور پائی جاتی ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "چنوں چودھویں رات" (1996) میں ہند کو پہیلیاں اکٹھی کر کے شائع کی گی ہیں۔

4 ۔ ابتدائی بول چال کے فقرے

	اردو	ہندکو
☆	آپ کا نام کیا ہے؟	تہاڈا ناں کیہ وے
	میرا نام اسحاق شاہد ہے۔	میرا ناں اسحاق شاھد اے
☆	آپ کیا کرتے ہیں؟	تسی کی کردے او
	میں پڑھتا ہوں۔	میں پڑھناواں
☆	آپ کیسے ہیں؟	تہاڈا کی حال اے
	میں اللہ کے فضل و کرم سے بالکل ٹھیک ہوں۔	میں اللہ دے فضل و کرم نال ٹھیک ٹھاک آں
☆	اور سنائیں! آپ کا کیا حال ہے	ھور سناؤ تہاڈا کیہ حال اے
	میں بالکل خیریت سے ہوں	میں بالکل خیریت نال آں
☆	آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟	تہاڈے والد صاحب کیہ کردے نے
	وہ ملازمت کرتے ہیں۔	او ملازمت کردن

☆ آپ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟

تہاڈا گھار اتھوں کتنا دور اے

زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ سڑک سیدھی میرے گھر کی طرف جاتی ہے

زیادہ دور نئیں۔ ایہہ سڑک سدھی میرے گھار ول جاندی اے

☆ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔

میری طبیعت ٹھیک نئیں

کیا آپ مجھے کسی ڈاکٹر کا پتہ بتا سکتے ہیں؟

تسی منوں کسے ڈاکٹر دا پتہ دس سکدے او

آپ سرکاری ہسپتال چلے جائیں

تسی سرکاری ھسپتال چلے جاؤ

جوکہ وہ سامنے نظر آ رہا ہے۔

جہڑا اوہ سامنے نظر آندا پیا اے

☆ گرمی بہت زیادہ ہے پیدل چلنا ممکن نہیں۔

گرمی بوت زیادہ وے۔ پیدل چلنا مشکل اے

آیئے میں آپ کو اپنی گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔

آؤ میں تہانوں آپڑی موٹر وچ چھوڑ آناواں

☆ بہت شکریہ! اچھا پھر ملیں گے۔

بڑی مہربانی۔ اچھا پھر ملسی ایں

آپ کا بھی شکریہ۔ خدا حافظ

تہاڈا بھی شکریہ۔ خدا حافظ

5۔ خود آزمائی

1۔ ہندکو زبان، زبانوں کے کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے؟ مفصل روشنی ڈالیے۔

2۔ ہندکو کی وجہ تسمیہ اور پس منظر اپنے لفظوں میں بیان کریں۔

3۔ ہندکو کی ابتدائی تحریروں کے بارے میں ایک نوٹ لکھئے۔

4۔ ہندکو لوک ادب کے بارے میں اپنے مطالعے کا خلاصہ قلم بند کیجیے۔

5۔ ہندکو کے پانچ فقرے اور ان کا اردو ترجمہ تحریر کریں۔

6۔ ہندکو میں ماضی کی مختلف اقسام بنانے کے قاعدے بیان کیجیے۔

یونٹ نمبر 7

ہندکو ادب قدیم و جدید

تحریر : پروفیسر خاطر غزنوی

نظرثانی : ڈاکٹر انعام الحق جاوید
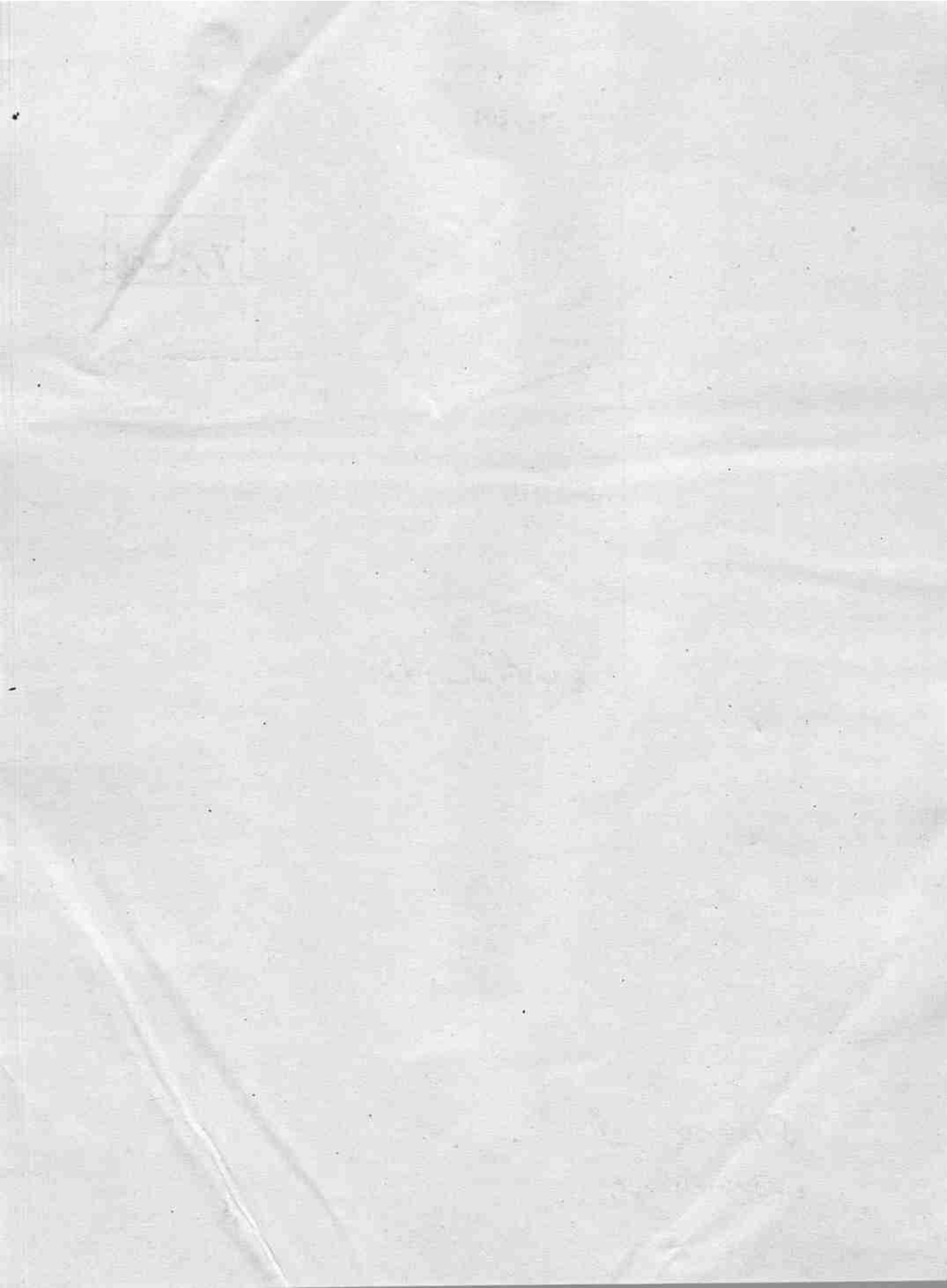
فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف

مطالعاتی رہنما کے اس یونٹ کا موضوع ہندکو زبان کا قدیم و جدید ادب ہے۔ یونٹ کے آغاز میں قدیم ہندکو شاعری کا مطالعہ (ادوار کے مطابق) پیش کیا گیا ہے، جس میں اس زبان کے قدیم شعراء کا تعارف اور کلام کے نمونے مع اردو ترجمہ دیئے گئے ہیں۔ آپ اس یونٹ میں قدیم شاعری کے علاوہ ہندکو کے جدید شعراء، ان کے کلام، شعری مجموعوں اور جدید نثری اصناف مثلاً ناول، افسانہ اور سفرنامہ کے بارے میں بھی پڑھیں گے نیز اس زبان میں تحقیق کی صورتحال، خاکہ نگاری اور دینی کتب کا مطالعہ بھی اس یونٹ میں شامل ہے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد طلبہ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

1۔ قدیم ہندکو شاعری کے بارے میں جان سکیں۔

2۔ ہندکو ناول، افسانے، سفرنامے اور تحقیق کے ارتقائی سفر پر اظہار خیال کرسکیں۔

3۔ ہندکو ادب کے بارے میں آگاہی حاصل کرسکیں۔

4۔ مجموعی طور پر اس زبان کے قدیم و جدید ادب کے پس منظر اور پیش منظر پر روشنی ڈال سکیں۔
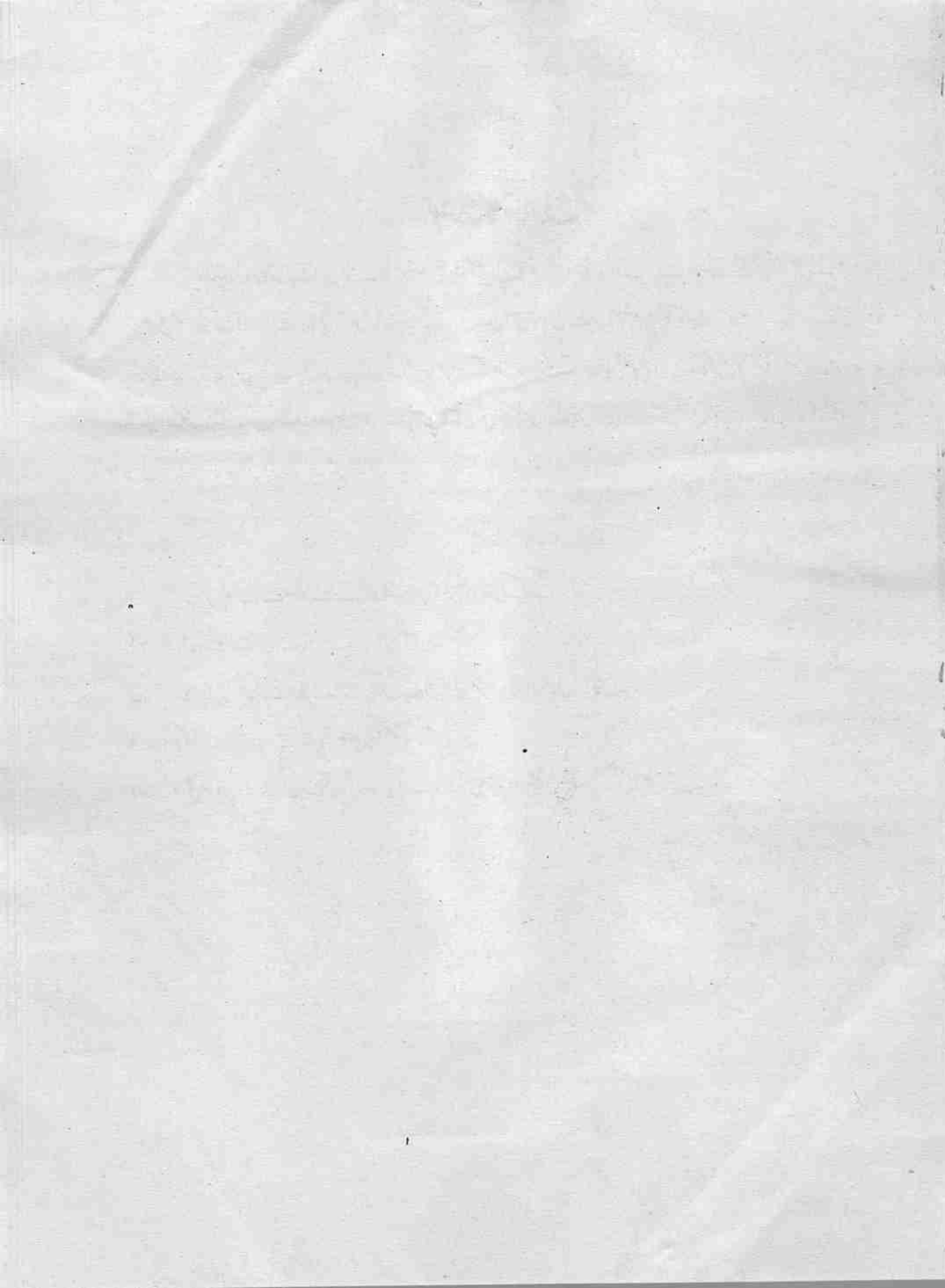
1۔قدیم ہندکو شاعری

1.1۔ ابتدائی دور

دیگر زبانوں کی طرح ہندکو کا ابتدائی ادب بھی شاعری پر مشتمل ہے۔قدیم دور کا جو ادب مختلف تذکروں اور کتابوں میں ملتا ہے،اس کی تفصیلات پیش ہیں۔

عیسیٰ خان مشوانی: مشوانی پشتونوں کی ایک قوم ہے جس کا تعلق کاکڑ قبیلے سے ہے۔شیخ عیسےٰ کی زندگی کے بارے میں مخزن افغانی میں یوں تحریر ہے:

"کہتے ہیں کہ میاں شیخ عیسےٰ مشوانی نے توحید باری تعالیٰ کے موضوع پر تین زبانوں پشتو، فارسی اور ہندوی میں ایک رسالہ تصنیف کیا تھا"

شیخ عیسےٰ انبالہ کے نزدیک ایک بستی داملہ میں سکونت پذیر ایک درویش صفت انسان تھے اوران کی درویشی کے قصے مخزن افغانی کے علاوہ پشتانہ شعراء مؤلفہ عبدالحئی حبیبی میں بھی درج ہیں۔ان کے تین اشعار ہندکو زبان کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کلمے ازلی جو گیا لکھ　　اس کارن سب کُجھ آوے دِکھ
گھر بیٹھے دے دیسی دام　　جو بی لکھیوس تیرے نام
جو تو کرسی اللہ یقین　　کامل ہوسی تیرا دین

قدیم دور کے ایک اہم شاعر وجید کے حمد یہ کلام کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو، جو ہندکو سے بہت قریب ہے۔

مکہ جابنایوس، سو وچ پہاڑیاں
گرمی سی لونڈے، بٹھ سکدیاں جھاڑیاں
کاشی پیٹھ رہایوس گنگا نیل دھر
وجیدا کوݨ صاحب نوں آکھے،انج نئیں اِنج کر
حسنؓ حسینؓ نواسے پاک رسولؐ دے
فاطمہؓ دے فرزند علیؓ مقبول دے
اتیاں تھیں اوہ کہائے، رت دھر
وجیدا کوݨ صاحب نوں آکھے،انج نئیں انج کر

اردو ترجمہ : ''پہاڑیوں کے درمیان اس نے مکہ بسایا' جہاں گرمی سے زمین بھٹ کی طرح تپتی اور جھاڑیاں دھوپ کی حدت سے خشک ہو جاتی ہیں۔ کاشی میں باریابی کی تمنا دلوں میں جگائی' گنگا کو نیلاہٹیں دیں' کون اللہ تعالیٰ سے کہے یوں نہیں یوں کرو۔ حسنؓ اور حسینؓ پاک رسولؐ کے نواسے تھے اور حضرت فاطمہؓ و حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ ان کو ان کے امتیوں کے ہاتھوں شہید کروا دیا۔ اے وجید! کون اللہ تعالیٰ سے کہے یوں نہ کر اور یوں کر۔''

صاحب حق

صاحبِ حق کا تعلق خاص پشاور سے تھا' وہ ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد اپنے دور کے اہم گدی نشین رہے۔ والد کی وفات پر صاحب حق کو سجادہ نشینی اور پیری مریدی کا سلسلہ حاصل ہوا۔ اپنے کلام میں اُنھوں نے رمز و کنایہ سے کام لیا' عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف آئے۔ ان کی اس نظم میں بادشاہوں کے خلاف جنگوں کا جو ذکر آیا ہے، اس کا اشارہ یقیناً خوشحال خان خٹک کی طرف ہے۔

شاعر لڑن شاہواں نال — ایہہ کم ہوندے باہواں نال
باہواں بی جد کپیاں جاون — ڈھول نہ وجن گاہواں نال
عشق توڑ چڑھانداوے — سارے میلے ساہواں نال

اردو ترجمہ: ''شاعر بادشاہوں سے نبرد آزما ہیں، یہ سارے کام قوتِ بازو سے ہوتے ہیں لیکن جب بازو کٹ جائیں تو فصل کی کٹائی کے موقع پر ڈھول نہیں بجتے۔ عشق سے بات بنتی ہے۔ سارے کام زندگی سے مربوط ہیں۔''

استاد نامور

استاد نامور، استاد صاحب حق کے شاگرد رشید تھے۔ ان کی تاریخ وفات سید فارغ بخاری نے 1752ء لکھی ہے۔ نمونہ ءِ کلام کے طور پر یہ اشعار قابل ذکر ہیں:

جوڑ جوڑ کے سندر خیال آپڑے موتی پیغلہ جوانی دی راہ کڈ دے
کوئی لبھدی نہ جد مثال سب نوں' بے مثال دلو ٹھنڈی آہ کڈ دے
نیناں نیر اندر بھرا اوہ جادو، نظر کرو تا جیکر اوہ ساہ کڈ دے
نامور عشق اوہ کم کیتا جیویں چیرا دے کے روگ جراح کڈ دے

اردو ترجمہ: ''عمدہ خیالات سے موتی کنواری جوانی کی راہ نکالتے ہیں۔ جب کوئی مثال نظر نہ آئے تو بے

مثال کے لئے سرد آہ نکلتی ہے۔اس کی بھیگی آنکھوں میں وہ جادو بھرا ہے کہ اس کی طرف دیکھنے سے جان نکلتی ہے۔ ناسورِ عشق نے وہ کام کر دکھایا جو جراح کی جراحت سے ہوتا ہے۔"

استاد نظیر احمد روا

استاد نظیر احمد روا بھی استاد صاحب حق کے شاگرد تھے۔ استاد کی درویشی سے متاثر ہو کر ان کی شاگردی اختیار کر لی اور پھر فقر و درویشی کی زندگی گزارتے ہوئے 1800ء میں فوت ہوئے۔ان کی ایک حرفی دستیاب ہوئی ہے۔

لامکان دی دکان دا جوہری ہو بݨ مہمان وچ رگ جان بیٹھا
سنگ ہیرے دی اصل پرکھ کرنے سنگ بیٹھیاں دے کدرے آن بیٹھا
ہر مورکھ دکان نشان لائی' ہتھ رکھ کے نیلم مرجان بیٹھا
روا نیک عملاں دی کسوٹی اُتے کھوٹے کھرے دی کرے پچھان بیٹھا

اردو ترجمہ: "لامکان کی دکان کا جوہری رگِ جان کا مہمان بن گیا ہے۔ ہیرے کی پرکھ کرنے وہ جوہریوں کے پاس آبیٹھا ہے، پر ناداں نے نشانی کے طور پر دکان کھولی اور ہاتھوں پر نیلم مرجان رکھے دکھا رہا ہے۔ روا! نیک اعمال کی کسوٹی پر کھرے کھوٹے کی پرکھ کر رہا ہے۔"

مرزا عبدالغنی

مرزا عبدالغنی ہندکو زبان کے وہ واحد شاعر ہیں، جن کا کلام گریرسن نے اپنی مشہورِ زمانہ تحقیقی کتاب "LINGUISTIC SURVEY OF INDIA" یعنی ہندوستانی زبانوں کا جائزہ (جلد 8' حصہ اول) میں شامل کیا ہے۔ یہ ایک ہندکو چاربیتہ ہے، جسے "غزل" کا نام دیا گیا ہے:

خالق اکبر دی بندگی کر لے کجھ وقتِ سحار — اکثر مرنائی بندیا غفلت وچ نہ سوقرار
ایسی غفلت نے بھلائیں بھلیں کیوں نادان تو
خوشیاں کردم نوں نبھائیں وچ فانی دوران تو
بہت کھاسیں ارمان توں جد پچھسیا پروردگار — خالقِ اکبر دی بندگی کر لے کجھ وقتِ سحار

اردو ترجمہ: "فجر کے وقت خالق اکبر کی بندگی کر لے آخر تمہیں مرنا ہے۔ غفلت میں مت رہو، ایسی غفلت میں

ہر چیز نہ بھلا بیٹھو، خوش رہو اور اس فانی دنیا سے نباہتے رہو، تم سے جب پروردگار نے پرسش کی تو اس وقت پچھتاؤ گے۔"

اسے غزل اس لئے کہا گیا ہے کہ ہندکو یا پشتو چاربیتہ گانے کی چیزیں ہیں اور راگ رنگ اور غزل سرائی کو مترادف سمجھا جاتا ہے۔ نیز اس چاربیتے کے آخر میں لفظ غزل ان ہی معنوں میں یعنی محاورتاً استعمال کیا گیا ہے۔

مرزے کر لے خوش طبع، خوش غزل مکھ سی پکار

اردو ترجمہ: "مرزا خوش طبعی کے لئے غزل خوانی کر"

سخی نمانڑاں

سخی نمانڑاں پشاور کے کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ چاربیتہ باز تھے۔ ان کا نواسہ سائیں برقی المعروف سائیں نمانڑاں پشاور میں مسجد گنج علی کی دکانوں میں رہتا تھا۔ سخی کا صرف ایک ہی چاربیتہ دستیاب ہوا ہے۔

سائیں شادا

سائیں شادا مردان کا رہنے والا تھا۔ ادبی تاریخوں میں اس کی تاریخ پیدائش 1682ء درج ہے۔ سائیں شادا ایک عالم و فاضل شخص تھا اور مختلف زبانوں سے واقف تھا۔ اس کا ایک چاربیتہ دستیاب ہوا ہے، جس میں فارسی، ہندی اور ہندکو کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

خون شد دلِ ما، خون شد دلِ ما

نیناں تیرے مار مکایا ہردے اندر تیر لگایا

کیہہ کراں تے کتھے جاواں آپ نوں منے سولی چڑھایا

اردو ترجمہ: "مرا دل خون ہو گیا ہے، دل کا خون ہو گیا ہے۔ تیری آنکھوں نے مار ڈالا، دل کے اندر گویا تیر ترازو ہو گیا، کیا کروں کہاں جاؤں، میں نے اپنے آپ کو سولی پر چڑھا دیا۔"

غلام محمد ماہیو

غلام محمد ماہیو پشاور کے رہنے والے تھے۔ عبدالغفور قریشی اور سید فارغ بخاری دونوں نے انہیں اردو، فارسی اور ہندکو کا شاعر لکھا ہے۔ ان کا یہ حمدیہ چاربیتہ ملاحظہ ہو:

تیرے بنا نئیں اِتھے رب کجھ
تو ای رب کجھ،تو ہی سب کجھ
رب جی تیرا ہی سب ظہور اے
ہر ھک شے وچ تیرا نور اے
دل تے دل دا جانی آپ ایں
آدم بی توآپ،درخانی آپ ایں
آپ ای اگ تے آپ ای پانی
آپ ای پیٹا تے آپ ای تانی

اردو ترجمہ: ''اے خدا تیرے سوا یہاں کچھ نہیں، اے خدا تو ہی رب ہے تو ہی سب کچھ ہے، اے اللہ یہاں سب تیرا ظہور ہے ہر شے میں تیرا نور ہے۔ تو دل ہے تو ہی دل کا جانی ہے، تو ہی عاشق آدم خان ہے تو ہی اس کی محبوبہ درخانی ہے، تو ہی آگ ہے تو ہی پانی ہے، آپ ہی تانا ہے اور خود ہی بانا ہے۔''

اس چار بیتے میں آدم اور درخانی سرحد کی رومانی کہانیوں کے دو کرداروں یعنی عاشق اور معشوق کی طرف اشارہ ہے۔

1.2۔ سکھوں اور انگریزوں کا دور

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں سیاسی انتشار پھیل گیا۔ رنجیت سنگھ کے بیٹے کھڑک سنگھ نے مختصر عرصہ حکومت کی۔ 1846ء میں عہد نامہ لاہور کے تحت پنجاب پر بھی انگریزوں کی بالادستی ہوگئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی رانی جنداں کے جوڑ توڑ کی وجہ سے 1849ء تک پنجاب سکھوں کے پاس رہا۔ ادھر سرحد میں سکھوں نے 1835ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد کو شہید کر کے قبضہ کر لیا تھا اور اطالوی نژاد ابوطبیلہ (Avitable) کو پشاور کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔ پشاور پر سکھوں کا قبضہ 1835ء سے 1850ء تک رہا۔ 1850ء میں انگریزوں نے پشاور پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔

ہندکو شاعری سکھوں کے دور میں اس لئے بھی پھلی پھولی کہ سکھوں کی زبان ہندکو سے بڑی مماثلت رکھتی تھی۔ اس مماثلت کا سبب وادیءِ سندھ کی تہذیب و زبان کی یکسانیت تھی۔ پنجابی اور ہندکو ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ اس زمانے میں گورکھٹڑی کا سکھ تحصیلدار بھی شعر و ادب کا شائق تھا اور باقاعدگی سے تحصیل گورکھٹڑی میں مشاعرے کرایا کرتا تھا۔ ان مشاعروں میں ہندو، سکھ اور مسلمان جو گنج لاہوری دروازے، گاڑی خانے، ہشت نگری اور کریم پورے کے علاقے سے تعلق

رکھتے تھے، باقاعدگی سے آتے۔ ان شرکاء میں ہندکو کے معروف غیر مسلم شعراء کنہیا سنگھ، دنی چند، ارجو بھر جو، ہر جی مل، پرشوتم، کشن چند اور مرلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مشاعرے انگریزوں کے دور تک بلکہ پاکستان کے قیام تک رتے کا باغ (موجودہ ریڈیو پاکستان کا احاطہ) وزیر باغ، شاہ رسول پیر کا مزار، سنگھاں دا تکیہ (کپھی محلّہ) مزار شادی پیر، لاہوری چوک، چوک یکہ توت اور چوک ناصر خان، کننگھم پارک (موجودہ جناح پارک)، پنج تیرتھ (موجودہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی عمارت)، شاہی باغ، اسلامیہ کلب کی عمارت، نمک منڈی کا باغ نیز کوچہ رسالدار نوتھیہ اور محلّہ خداداد وغیرہ میں تواتر سے ہوتے رہے ہیں۔

ہندکو زبان میں شعراء نے انگریزوں کے ظلم واستبداد کے خلاف بہت کچھ لکھا' غیر منقسم ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مختلف تحریکیں چلیں جو عوام کو آزادی کے راستے دکھاتی رہیں۔ سرحد میں حاجی صاحب ترنگزئی' پیر صاحب ہڈہ شریف اور سرحد پر مختلف مزاحمتی جنگیں اسی کشمکش کی آئینہ دار ہیں۔ اس ضمن میں مشہور ہندکو شاعر بردے کی یہ حرفی قابلِ ذکر ہے:

انگریزاں دے ظلم وستم نے بڑے بڑے لائق حکمران مارے
کئی جرنیل، سپاہ سالار، نالے بہادر جنگجو جوان مارے
بڑے بڑے رستم، بھاویں ہندو آئے کہ مسلمان مارے
بردا خان انہاں دے ظلماں نے زبردست سرکش پٹھان مارے

1.3۔ کلاسیکی دور

ہندکو ادب کا کلاسیکی دور استاد شیر غلام سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے شعراء کو ہندوستان گیر شہرت ملی۔ یہ شعراء راولپنڈی، لاہور، امرتسر، جالندھر اور انبالے تک مشاعروں میں مدعو کئے جاتے اور داد وتحسین کے تحفے اور نئے شاگردوں کی شاعرانہ اصلاح کی ذمہ داریاں لے کر واپس آتے۔ ان میں استاد شیر غلام، استاد رمضو، استاد مَیَن، استاد سائیں احمد علی پشاوری، استاد مٹھو، استاد بردا، استاد شیر شاہ سیفی قابلِ ذکر ہیں۔

استاد شیر غلام

استاد شیر غلام دراصل شیخ غلام تھے' کشمیر سے ہجرت کر کے پشاور آئے' وہ کشمیری برہمنوں میں سے تھے' پشاور میں اسلام قبول کرلیا، اس لئے نام کے ساتھ لفظ شیخ کا اضافہ ہوگیا۔ شیخ اور شیر کی لفظی مناسبت سے وہ شیخ کے بجائے شیر

کہلائے۔وہ پشاور کے محلہ بیلداراں میں مقیم ہوگئے اور اب بھی ان کی اولاد اسی محلے میں مقیم ہے۔ان کی اولاد میں سے اکبر اب بھی لاہوری دروازے کے اندر دکانداری کرتے ہیں اور خود بھی شاعر ہیں۔

استاد شیر غلام ہندکو زبان کے صاحب طرز شاعر اور استاد سائیں احمد علی کے استاد رمضو کے بھی استاد تھے۔استاد غلام کا بیٹا گل بھی شاعر تھا۔ان کی اس حرفی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بھی زندہ تھے جب 1889ء پشاور میں ریل گاڑی آئی۔

کسباں چو کسب پسند کیتا' ہوندا زرگر تا گھڑدا حمیل گل دی
رانی چڑھ بیٹھی رنگ محل اتے' لاندی عطر فلیل چمبیل گل دی
حسین وَل جد دھیان پیا' ماراں تاڑی تے اُڈ گئی آ خیل گل دی
شیخ غلام پیارے دل تو غم دور کرلے' لے سواری آ گئی آ ریل گل دی

اردو ترجمہ: ''اگر پیشوں میں زرگری کا پیشہ اختیار کرتا تو میں اپنے محبوب کے گلے کا ہار بناتا۔میری محبوبہ رانی رنگ محل میں عطر اور خوشبوؤں میں بسی بیٹھی ہے اور پھولوں کا عطر پسند کرتی ہے۔جب میں نے چمن کی طرف دھیان کیا اور تالی بجائی تو پھولوں جیسی حسیناؤں کی ڈار اُڑ گئی،اے شیخ غلام،اے عزیز من۔دل کا غم دور کرلے !ریل میں سواری کرتے ہوئے وہ گل اندام آ ہی پہنچی ہے۔''

استاد رمضان علی رمضو

استاد رمضان علی رمضو (1816ء۔1900ء) کشمیری الاصل تھے اور استاد سائیں کے استاد تھے۔ان کی شاعری کی دھوم بھی سارے پنجاب میں پھیلی ہوئی تھی۔ہندکو کے سارے بزرگ شعراء کا کہنا ہے کہ ان کے والد انگریزوں کے زمانے میں فوج کے ٹھیکیدار رہے ہیں اور وہ ملک ملک گھومتے رہے ہیں۔ان کی بعض حرفیوں میں مختلف شہروں اور ملکوں کا تذکرہ ملتا ہے،ان کے ہاں فرنگیوں سے نفرت کا رجحان بھی پایا جاتا ہے مثلاً:

حیا زمانے دا اُٹھ گیا 'جدو ملک دے حاکم فرنگی ہوگئے
ماں باپ دا کہنا من دے نئیں ' پتر آپی رنگ برنگی ہوگئے
ذات پات نوں کوئی پچھان دا نئیں جیہڑے ٹرلے اَئے او ہ کلنگی ہوگئے
امیراں دے پتر شرابی کوابی ' غریباں دے پتر چرسی بھنگی ہوگئے

اردو ترجمہ: ''ملک کے حاکم فرنگی ہو گئے اور اس سبب زمانے سے شرم وحیا رخصت ہو گئی، ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے، بیٹے رنگ برنگے ہو گئے ذات پات کا دور ختم ہو گیا، جو اصیل چوزے تھے وہ کلنگی بن گئے ہیں، امیروں کی اولاد شرابی کبابی اور غریبوں کی اولاد چرسی اور بھنگی ہو گئی ہے۔''

انھوں نے حرفی اور چاربیتہ کے ساتھ ساتھ نعت بھی لکھی جس میں حزم واحتیاط اور عقیدت واحترام کے حسن کو مدِ نظر رکھا۔ عشق کے بیان میں باریکیاں اور وارفتگی ملتی ہے۔ وہ کلام میں سلاست اور فنی حسن و پختگی کے ساتھ ساتھ الفاظ کا انتخاب' غنائیت اور علمیت نیز تجربات ومشاہدات کی وسعتیں بھی بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اظہار خیال میں بے تکلفی اور طبقاتی اونچ نیچ کو بھی اشعار کا موضوع بناتے ہیں۔ فنی نقطۂ نظر سے شاعرانہ نازک خیالی' تشبیہہ' استعارہ' لفظوں کا انتخاب اور ان کا صحیح استعمال واضح انداز میں ان کی شاعری کی تکمیل کرتے ہیں' ان کے ہاں قافیہ بندی کا التزام کلام کو موسیقیت اور روانی بخشتا ہے۔ اس حرفی میں زرد رنگ کے مختلف پہلوؤں پر ایک بڑے مفکر اور ایک جزئیات نگار شاعر کی مہارت سامنے آتی ہے۔

سُرمے دی سیاہی مدھم ہو گئی' وچ نیناں دے زردی دی تار آ گئی
میں تا جان دا اس مدان نوں ایاں' زردی کیونکر وچ انار آ گئی
تیری نت نت دی سر دردی کولو' زردی گل گلاب وچکار آ گئی
رنگ ویکھ کے یار دلدار والا' رمضو کہندا بسنتی بہار آ گئی

اردو ترجمہ: ''سرمے کی کجلاہٹ مدھم پڑ گئی، آنکھوں میں زردی کی لکیریں آ گئی ہیں۔ میں تو اس کھیت سے واقف تھا پھر انار میں زردی کیونکر آ گئی، تیری ہمیشگی کی تکرار سے گلِ گلاب میں زردی رچ گئی، محبوب کا رنگ دیکھ کر رمضو کہتا ہے کہ بسنتی بہار آ گئی ہے۔''

استاد رمضو نے اردو، فارسی اور ہندکو تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی شہرت کا سبب ہندکو زبان بنی، وہ ہندکو حرفی کہنے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے چاربیتے بھی کہے کہ اس دور میں استادانہ کمال کی کسوٹی چاربیتہ گوئی تھی۔ ان کے کلام سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ پڑھے لکھے شاعر تھے اور بڑے بڑے علماء کی صحبتوں میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان کا مذہب کا مطالعہ بھی تھا۔ ان کی شاعری میں قرونِ اولیٰ اسلام کی تاریخ اور حدیث کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً:

ز۔ زور نال بدردے کافراں نوں، کیتا زیر صاحبِ ذوالفقار جا کے
سر مرحب تے عنتر دا اتار کے تے، کیتے عرب عجم تار تار جا کے

قدم رکھ کے دوشِ نبی ﷺ اُتے، توڑے بت کعبے وچکار جا کے
کہندا رمضو اس بحرِ علم اندر، فتح پائی شیر کردگار جا کے

اردو ترجمہ: ''حضرت علیؓ نے اپنی قوت کے بل بوتے پر کافروں پر فتح حاصل کی، مرحب اور عنتر کے سر اتار کر عرب و عجم کو تارتار کیا، محمد رسول ﷺ کے کندھے پر قدم رکھ کر کعبے میں بتوں کو توڑا، رمضو کہے ان حالات میں شیر کردگار نے فتح حاصل کی۔''

سائیں احمد علی

سائیں احمد علی پشاوری وہ شاعر تھے، جنہیں علامہ اقبال نے پنجابی زبان کا غالب کہا۔ پشاور میں ان کی استادی کا چرچا تھا' راولپنڈی کے ایک سکھ اور سائیں کے پرستار سردار کھا سنگھ انہیں راولپنڈی اپنے ساتھ لے گئے اور انہیں ایک عرصے تک اپنے پاس رکھا اور ان پر دل و جان سے اعتماد کیا، سائیں نے بھی ان سے ہمیشہ وفاداری برتی، آخری عمر میں وہ واپس پشاور آ گئے اور 13 اپریل 1932ء کو فوت ہوئے۔ وہ استاد رمضو کے شاگردِ رشید تھے۔ راولپنڈی کے قیام کے دوران وہ اپنی علمیت اور شاعری میں استادانہ صلاحیت کی بدولت بہت سے نامور شعراء کے استاد بنے جن میں چنگی (چڑنگی) ص، ہمسر، فضل گجراتی قابلِ ذکر ہیں۔ راولپنڈی میں وہ اس قدر مقبول ہوئے کہ پوٹھوہار کی موسیقی کی مشہور صنف حرفی کی صنف میں سائیں کا کلام آج تک عوام میں مقبول اور رائج ہے۔

سائیں ہفت زبان تھے۔ اردو، ہندکو' پوٹھوہاری' فارسی' پشتو' کشمیری اور پنجابی جانتے تھے۔ ان زبانوں میں انہوں نے شاعری بھی کی، اسی لئے پوٹھوہار والے انہیں اپنا، پشاور والے اپنا اور علامہ اقبال نے انہیں پنجابی زبان کا غالب کہا۔ ان کا اردو اور فارسی کلام بھی دستیاب ہے۔ ان کی شاعری میں مرزا غالب کا تخیل اور ان کے کلام کی شوکت، بیدل کی سی تراکیب، آتش کی سی مرصع کاری اور محسن کاکوروی کا سا خلوص اور عشق نبیؐ کی گرمی پائی جاتی ہے۔ مرحوم رضا ہمدانی ان کی شاعری پر اپنی رائے لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''سائیں نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا اور مقامی تقاضوں کا احترام بھی کیا۔ ان کی حرفی میں عرب و عجم کا سایہ بھی ہے اور اپنی دھرتی کی مٹی کی سوندھی سوندھی بوباس بھی، تصوف کی پاکیزہ چاشنی بھی ہے اور ہجر و فراق کا سوز و ساز اور معاملہ بندی کا گداز بھی۔''

اس زمانے میں شعراء کا کلام اکثر تحریر میں نہ آتا تھا۔ شاگرد استادوں کا کلام زبانی یاد کرتے اور یہ ملفوظات سینہ بہ

سینہ اگلی نسل تک پہنچتے۔سب سے پہلے گجرات کے ایک زرگر حاجی محمد ادریس نے ان کی 300 حرفیاں جمع کر کے شائع کرائیں اور مفت تقسیم کیں۔ان کے بعد مرحوم افضل پرویز نے ''کہندا سائیں'' کے نام سے ایک مبسوط دیباچے کے ساتھ ان کا کلام شائع کیا۔آخری مجموعہ رضا ہمدانی نے لوک ورثہ کے ادارے سے شائع کروایا۔

نمونۂ کلام: خال پیشانی تے دمکدا وے یا کہ مشتری زہرہ جبین اُتے

یا ایہہ کعبے وچ چور اسلام دا وے یا کہ ہندو کوئی آ گیا وے دین اُتے

یا نشانی پر طاؤس لے کے کسے طفل نے رکھیا اے یاسین اُتے

یا موذنِ مسجد بلال سائیاں نقطہ نون دا آیا مبین اُتے

اردو ترجمہ: ''اس کی پیشانی پر خال چمک رہا ہے کہ مشتری زہرہ جبیں پر چمک رہی ہے یا یہ کعبہ میں اسلام کا چور آ گھسا ہے کہ کوئی ہندو (سیاہ اور ہندو) دین اسلام پر چھا گیا ہے یا کسی بچے نے پر طاؤس لے کر سورۂ یاسین میں رکھ دیا ہے یا مسجد کا مؤذن حضرت بلال جیسا یا نون کا نقطہ آیۂ مبین پر''

شاعر ہو ذہنوں بعید ہو گئے حسنِ کودک دے وصف بتان لگیاں

دایہ وانگ زلیخا دے ہوئی کملی، اپنے یوسف دے گیسو سلجھان لگیاں

موقلم مصور ہو قلم ہو گئے، نقش قدرت قرطاس پر لان لگیاں

دل معلم دا ہو گیا سی پارہ، سائیاں پہلا ای پارہ پڑھان لگیاں

اردو ترجمہ: ''شاعر ہوئے اور شعور سے دور ہو گئے۔کسی کم عمر کے حسن کے اوصاف بیان کرتے رہے۔دایۂ! زلیخا کی طرح دیوانی ہو گئی اپنے یوسف کے بال سنوارتے ہوئے، مصور کا برش کاغذ پر نقش قدرت بناتے ہوئے قلم ہو گیا، اے سائیں! پہلا ہی پارہ پڑھاتے وقت معلم کا دل تیس پارے ہو گیا''۔

متیّن

متین بھی اس دور کا ایک اہم شاعر تھا۔اس کا اصل نام عبدالرحمان (مختار علی نیّر کے مطابق محمد شفیق) ہے۔شاعری کی طرف بیس برس کی عمر میں دھیان ہوا۔فن پر مکمل عبور حاصل تھا، شعری نازک خیالیوں اور زبان ومحاورہ کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔عمدہ حرفیاں کہتے تھے، ادبی حلقوں میں مقبولیت اور عزت حاصل کی۔موضوع شعر عشق ومحبت تھا لیکن زندگی کی تلخیوں کو بھی اپنی شاعری میں سمویا اور یوں درد وسوز کی دولت کو شاعری کا جزو بنایا۔ان کی شاعری بھی سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی۔ان کے اشعار

بعض شاگرد پیشہ شاعروں کو اب بھی زبانی یاد ہیں۔

جان جہان وچ اے بہت پیاری' اوبی لوک دیندے اُتو وار زر دے
تے جیہڑے ناز کردے نازنین ہو کے'اوبی ہو گئے نی ناز بردار زر دے
حاتم زر دے کے نامور ہویا' اسی طرح نی فائدے وچکار زر دے
میّن یوسف نوں زر نے خریدیا سی' اس طرح دے بردے ہزار زر دے

اردو ترجمہ: ''زندگی بہت پیاری ہوتی ہے لیکن بعض لوگ دولت کی خاطر اسے بھی قربان کر دیتے ہیں۔وہ نازنین جو اپنے حسن پر ناز کرتے تھے،وہ بھی زر کے ناز بردار ہو گئے۔حاتم سخاوت کر کے نامور ہوا،ظاہر ہے زر کا کوئی فائدہ نہیں سوائے لٹانے کے میّن یوسف کو زر نے خریدا گیا،اس طرح ہزاروں غلام بھی زر کے بدلے خریدے جا سکتے ہیں''۔

علم و ہنر کی بے قدری پر لکھتے ہیں

روبرو بلبل شیدا دے بہندے' منداں تے گلاں دی خار چڑھ کے
طوطی نوں زاغ نال بند کردے' اے صیاد ظالم مرن دار چڑھ کے
کردے ہمسری اہل نگاہواں دی اوہ اغیار مانندِ غبار چڑھ کے
میّن موتی تلدے سنگ پتھراں دے اس بے عدل ترازو وچکار چڑھ کے

اردو ترجمہ: ''بلبل شیدا کے مقابل پھولوں کی مسند پر خار چڑھ بیٹھتے ہیں۔طوطی کو کوّے کے ساتھ بند کرنے والے صیاد اللہ کرے دار پر چڑھ کر مریں۔اہل دانش کے مقابلے میں اغیار کی طرح جاہل چھا گئے ہیں۔اے میّن!اس بے انصاف ترازو میں موتی سنگریزوں کے ساتھ تل رہے ہیں''۔

سردار خان بردا

سردار خان بردا جنوبی ایشیا کے وسیع علاقوں میں بعض زندہ جاوید شعری ضرب الامثال والے اشعار کی بدولت جانی پہچانی شخصیات میں سے ہیں'ان کا یہ چار بیتہ زبان زدِعوام ہے۔

بری مرض لگی یارو عشق والی 'دارو لگدے نئیں طبیب والے

ساہوکاراں دے سخن منظور ہوندے، سخن سُن دے نہیں کسے غریب والے
نال عاجزی دے کم کڈ لیندے، رساں چوپ لیندے مٹھی جیبھ والے
کئی رُکھاں دی راکھی کرے بردا میوہ پکے تے کھان نصیب والے

اردوترجمہ: ''دوستو! عشق کا مرض برا ہے، اس میں کسی طبیب کی دوا اثر نہیں کرتی، ساہوکاروں کی ہر بات قابل اعتبار ہوتی ہے، غریبوں کی آواز صدا بہ صحرا ہوتی ہے۔ جو زبان کے میٹھے ہوتے ہیں وہ عاجزی سے کام لے کر اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ بردا درختوں کی دیکھ بھال کرتا ہے لیکن جب میوہ پک جائے تو اسے نصیبوں والے کھاتے ہیں۔''

پشاور میں 1850ء میں پیدا ہوئے۔ یہ بات ان کے ایک مصرعے سے واضح ہوتی ہے:

تیرھویں صدی دا طور پھریا، واؤ وگ رہیا غم کھانے نوں

یہاں تیرھویں صدی سے مراد یقیناً عیسوی سن نہیں کہ یہ تو ہند میں انگریزوں کی حکومت کا ابتدائی دور ہے یہاں تیرھویں صدی سے واضح طور پر سنِ ہجری مراد ہے، یعنی تیرھویں صدی کا اختتام یکم نومبر 1883ء اور نئی صدی کا آغاز 2 نومبر 1883ء کو ہوا۔ بردے کو اپنے بھائی سے لڑنے کی بنا پر 1882ء میں ہی گرفتار کر کے راولپنڈی جیل میں بھیجا گیا، اس وقت پشاور سنٹرل جیل تعمیر نہ ہوئی تھی۔ بردے نے پشاور سے راولپنڈی تک سفر اور راولپنڈی جیل میں دن گزارنے کا حال اپنی مسلسل حرفیوں میں تحریر کیا ہے۔ راولپنڈی کے سفر میں دریائے سندھ کو اٹک کے مقام پر کشتیوں میں عبور کیا جاتا تھا۔ اٹک پر ریل کا پل 1883ء میں مکمل ہوا جس پر عام آمدورفت 24 مئی 1883ء کو شروع ہوئی۔ بردا 1882ء میں کشتیوں کے پل پر سے راولپنڈی لے جایا گیا۔ جیسا کہ اس نے اپنی مسلسل حرفیوں میں سے ایک میں کہا:

شہر پشور سی ٹریا بردا کنڈے اٹک دے آن کھلاریو نے
پنج ست سپاہی نے اردے گردے، بیڑی والے نوں نعرہ ماریو نے
بیڑی آر آوے بیڑی پار جاوے، وچ بردے نوں چا سواریو نے
بردا کہندا یارو انگریز ڈاہڈا، پنڈی جیل خانے اندر واڑیو نے

اردوترجمہ: ''بردا پشاور شہر سے روانہ ہوا، اسے دریائے سندھ کے کنارے اٹک پر لا کھڑا کیا۔ پانچ سات سپاہی اردگرد گھیرا کیے کھڑے تھے جنھوں نے کشتی والوں کو آواز دی۔ دریا میں کشتی آتی تھی کشتی جاتی تھی۔ بردے

کو بھی اسی میں سوار کرا دیا۔ بردا کہے کہ یارو! انگریز کا حکم چلتا ہے مجھے راولپنڈی جیل میں بند کر دیا گیا۔"

بردے نے اس وقت کی پنڈی جیل کی تفصیل بھی اپنی ایک حرفی میں بیان کی ہے:

جیل خانہ راولپنڈی والا جس دیاں کوٹھیاں گنو تا ہیون چالی
پنج ست قیدی روز آندین ' کوئی دن نئیں جاندا دے مول خالی
باراں سیر دیندے چھولے پیسنے نوں' منہ تے چھائی زردی' اکھیاں چ آئی لالی
بردا کہندا یارو انگریز ڈاہڈا' جہاں سیکڑے جواناں دی جند گالی

اردو ترجمہ: "راولپنڈی کی جیل میں چالیس کوٹھیاں ہیں، پانچ سات قیدی روز آتے ہیں کوئی دن خالی نہیں جاتا۔ جیل والے بارہ سیر چنا پیسنے کو دیتے ہیں، منہ پر زردی آنکھوں میں سرخی پھیل گئی ہے۔ بردا کہتا ہے یارو! انگریز کا حکم چلتا ہے جس نے کئی جوانوں کی زندگی برباد کی ہے۔"

بردا ایک باشعور اور باکمال شخص تھا۔ اسے زندگی کے نشیب و فراز کا گہرا تجربہ تھا۔ وہ دوستیوں، دشمنیوں، منافقتوں، بے وفائیوں اور دھوکے بازیوں، مطلب پرستیوں کے زخموں سے بخوبی آشنا تھا۔ اس کی شاعری گل و بلبل کی شاعری نہ تھی۔ وہ زندگی کی گہرائیوں کو پاٹ چکا تھا اور حیات کی وسعتوں اور تنگنائیوں کو پڑھ چکا تھا۔ اس کے ہاں حکمت و دانش کے نمونے بھی ملتے ہیں اور اس نے ایسے شعر بھی کہے ہیں جو ضرب المثل بن چکے ہیں۔

بردے کی شاعری میں فن کا معیار بہت بلند ہے' وہ شاعری کی ساری ضرورتوں اور نزاکتوں کا شعور رکھتا تھا۔ اس کی یہ حرفی قافیوں کی تکرار کا نمونہ ہے جسے انگریزی میں (Inter rhyming) کہتے ہیں۔ یہ خصوصیت اس کی شاعری میں عام طور پر نظر آتی ہے۔

درد سر دا منوں بہت چر دا ' جتھے صندل پھر دا ' اُتھے ناگ کالے
اوہ پئے ڈنگ دے نی' حاصل منگدے نی' نی اوہ سنگ دے نی' جیہڑے کول پالے
جے تو چھیڑ گیوں ' پھیر نکھیڑ گیوں' کیوں کھدیڑ گیوں' جیہڑے کن ڈالے
بردے نکیاں میڈھیاں' منہ تے تریڈھیاں' تیرے جیڈھیاں گھتاں دے گھن گالے

اردو ترجمہ: "ایک عرصے سے دردِ سر میں مبتلا ہوں' صندل استعمال کروں تو کالے ناگ اس پر مائل ہوتے ہیں۔ وہ ڈستے ہیں اور حاصل مانگتے ہیں وہ ساتھ رہتے ہیں کہ اپنی گود کے پالے ہیں' اگر تو نے انہیں چھیڑا تو گویا

خود کو مصیبت میں بتلا کر دیا۔ وہ جو کانوں کا حسن ہیں انہیں کیوں اتارتے ہو۔ اے بردے محبوب کی مینڈھیاں چھوٹی چھوٹی ہیں اور اس کے ماتھے پر شکنیں ہیں تجھ جیسی نے در پردہ کیا کیا بربادیاں کی ہیں۔''

اس حرفی میں دراصل محبوب کے خدوخال اور ان پر شاعرانہ ظلم وتعدی کا روائتی طنز اپنے نئے اور اچھوتے انداز میں برتا گیا ہے۔ برداہندکوادب کا ایک بڑا اور ہمہ گیر نام ہے جو ہندکو کے مختلف لہجوں اور پنجابی زبان پر دسترس کی خصوصیات کا حامل ہے۔

مرزا غلام جیلانی صحیح سالم

مرزا غلام جیلانی صحیح سالم پشاور کے ایک اور اہم شاعر تھے۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے لیکن اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم غالباً اس دور کے مدرسوں میں حاصل کی۔ وہ 1842ء میں پشاور کے علاقہ کریم پورہ کے محلہ شہداد میں پیدا ہوئے۔ تصوف سے لگاؤ تھا اور چشتیہ قادریہ سلسلے میں بیعت تھے انہیں اب تک اردو فارسی شاعر کے طور پر جانا جاتا تھا، لیکن اب ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان دستیاب ہو گیا ہے۔ ایک بزرگ اور مجلس قادریہ صابریہ کے صدر تاج محمد مظہر صدیقی قادری صابری مرحوم نے یہ مخطوطہ مصنف کے اصل خط میں فوٹو کاپی کے طور پر شائع کر دیا ہے۔ ہندکو سی حرفی کو انہوں نے تیس حروف کے التزام سے لکھا ہے یعنی الف سے ے تک ہر حرفی تمام حروف کے تابع لکھی ہے۔ استاد حرفی پر پوری طرح قادر تھے اور سائیں احمد علی سے پیشتر زنجیری دار حرفی کہہ چکے تھے۔ ان کی یہ زنجیری دار حرفی، قافیوں کی تکرار اور موسیقیت کی وجہ سے ہندکو ادب میں بڑا مقام رکھتی ہے۔ اس حرفی میں ایک حیرت انگیز اور جدید ترین خصوصیت یہ ہے کہ غزل کی طرح مطلع کے بعد ہر شعر کا دوسرا مصرعہ مطلع سے ہم آہنگ ہے، جبکہ ہر طاق مصرعہ آپس میں ہم قافیہ ہے، ملاحظہ ہو:

حسن تیرے دی شان کہواں ، لعلِ لب نوں آب حیوان کہواں
تیغ ِ ابرو تے تیرِ مژگاں کہواں، جس نوں دیکھ حاسد غلطان ہوگئے
قدِ یار نوں سرو روان کہواں ، کالی زلف نوں آفت جان کہواں
سوہنٹرے منہ نوں کیوں نہ قرآن کہواں ، جنہوں دیکھ کافر مسلمان ہوگئے
اسدے ظلم دا میں کیہہ بیان کہواں ، سنٔ کے دل دا ارمان کہواں
کیوں نہ فتنہِ آخر زمان کہواں ، ظلم جس دے سی کئی ویران ہوگئے
دلبر اپنۓ نوں ماہِ تابان کہواں ، خسرو ِخیل خوبان کہواں
یا دشمن دین ایمان کہواں، دیکھ سالم جۓ کئی حیران ہوگئے

اردوترجمہ: ''تیرے حسن کی شان بیان کروں تمہارے لعلِ لب کو چشمۂ آب حیوان کہوں۔ تیغ ابرو تیر اور مژگاں کہوں جسے دیکھ کر حاسد حیران ہو گئے۔ قدِ یار کو سرو رواں کہوں، کالی زلف کو آفت جاں کہوں، خوبصورت چہرے کو کیوں نہ مصحف کہوں جنہیں دیکھ کر کافر بھی مسلمان ہو گئے۔ اس کے ظلم کی داستان کیا بیان کروں سن کر اسے دل کی چاہت کہوں، اسے کیوں نہ فتنہ آخر زمان کہوں جس کے ظلم سے کئی آبادیاں ویران ہو گئیں۔ میں اپنے دلبر کو ماہ تاباں کہوں، حسینوں کا سردار کہوں یا دشمن دین وایمان کہوں جسے دیکھ کے سالم جیسے کئی لوگ حیران اور پریشان ہیں۔''

استاد مٹھو پشاوری

استاد مٹھو پشاوری انیسویں صدی کی آخری دہائی کے شروع میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ وہ پشاور شہر کے مشہور تاریخی محلے چوک ناصر خان کے علاقہ میں محلّہ جٹاں کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے ایک شعر میں محلّے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

میرا محالہ چوک منڈی جان، ماجھی محالہ تے جٹاں دا مدان

اردوترجمہ: ''میرا محلّہ چوک منڈی، بھینسوں (ماجھی) محلّہ اور اس کے اندر جٹوں کا میدان ہے''

ان کا اصل نام میر احمد تھا۔ انھیں بچپن میں پیار سے مدو کہتے تھے اور ان کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں اتنی رواں اور شیریں ہوتی تھی جیسے طوطے کی میٹھی باتیں، اس لئے انھیں مدو سے مٹھو کہا جانے لگا اور پھر یہ نام عمر بھر کے لئے ان کی پہچان بن گیا اور پھر یوں ہوا کہ انہوں نے کلام موزوں بھی کہنا شروع کر دیا۔ اساتذہ کی محفلوں میں بیٹھتے بیٹھتے ایک قادرالکلام شاعر کی صورت میں ادبی مجلسوں کے پردھان بن گئے۔ مٹھو کا ایک سوتیلا بیٹا تاج محمد تھا جو دق کے مرض میں مبتلا تھا اور جوانی ہی میں مر گیا۔ استاد اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس کی موت پر انہوں نے ایک طرحی مشاعرہ کرایا جس میں دور دور سے استاد کے دوست احباب آئے اور شامل ہوئے اور اپنے مرثیے پیش کئے جو بعد میں کتابچے کی صورت میں شائع بھی ہوئے۔

استاد مٹھو اصل میں پٹھان تھے اور اس کا ثبوت ان کی یہ حرفی ہے۔

زندگانی یارو عجب چیز ہیوے ، زندگانی دے نال سارا جہان رہوے
سخن داناں دا ہیوے غلام یارو، وچ پشور دے مٹھو پٹھان رہوے

اردو ترجمہ: ''دوستو زندگی عجیب چیز ہے۔ زندگی ہے تو جہان ہے۔ مٹھو سخندانوں کا غلام ہے، پشاور میں مٹھو پٹھان رہتا ہے۔''

استاد مٹھو ان پڑھ تو تھے، لیکن انہیں اپنی عقل و دانش پر ناز تھا چنانچہ ان کا یہ مصرعہ زبان زدِ خلائق ہے۔

مٹھو کھوے میں کریم اللغات ہیواں

اردو ترجمہ: ''مٹھو کہے کہ میں کریم اللغات ہوں''

غالباً اس زمانے میں کریم اللغات ہی مستند لغت کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی۔ مٹھو کو اپنے قادر الکلام ہونے کا زعم بھی تھا۔ استاد نے ان پڑھ ہونے کے باوجود اس زمانے کے شعراء کے برعکس شاگردوں پر اپنے کلام کو محدود رکھنے کے بجائے باقاعدہ طور پر ایک منشی کی خدمات حاصل کیں اور اس سے اپنا مکمل کلام لکھوایا۔ استاد کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے زمانے میں ہونے والے حادثات و واقعات کو بھی نظم کیا چنانچہ ان کے کلام میں پرنس آف ویلز کی پشاور آمد، ترکوں کی انگریزوں کے خلاف کامیابی پر پشاور میں جشن کا حال، مولانا محمد علی کی پشاور آمد اور اس طرح کے دوسرے اہم واقعات ملتے ہیں۔

استاد کی شاعری ہمہ گیریت کی حامل ہے۔ انھوں نے مختلف تاریخی شخصیات کی پشاور آمد، اہم واقعات و حادثات، نوحے، مرثیے، سلام، دولت و امارت، غربت، روپیہ پیسہ، بے وفائیاں، قصے کہانیاں، مختلف مذاہب کے لوگوں اور ان کی مذہبی رسومات اور اساطیر کا تذکرہ بھی کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ انہوں نے انسانی رویوں کی بڑی دلکش اور موثر انداز سے عکاسی کی ہے۔ شاعری کو وہ بچوں کا کھیل نہیں سمجھتے تھے بلکہ وہ اچھا شاعر اس کو سمجھتے تھے جو شاعری کے رموز و علائم پر قادر ہو اور شاعری کو ایک گلشن کی طرح رنگ رنگ کے گل بوٹوں سے سجانا جانتا ہو۔ استاد مٹھو نے شہادت حسنین، قصہ لیلیٰ مجنوں اور قریباً ڈیڑھ ہزار حرفیوں پر مشتمل دیوان چھوڑا ہے جو راقم الحروف کی تحویل میں ہے۔

استاد عبداللہ

استاد عبداللہ سائیں احمد علی کے ہمعصر تھے۔ یہ ایک پڑھے لکھے عالم فاضل شخص تھے اور علمی نقطۂ نظر سے ان کی چوٹیں سائیں احمد علی سے رہتیں۔ عبداللہ انیسویں صدی میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے باقاعدہ عربی، فارسی اور اردو کی تعلیم حاصل کی۔ وہ قرآن کے حافظ تھے۔ انہیں گلستان اور بوستان بھی زبانی یاد تھی۔ انہوں نے اپنے زمانے کے مشہور شاعر سید غلام حسین کو استاد مان کر فارسی میں شاعری کی۔ ان کی وفات سائیں کی وفات سے دو برس پہلے یعنی 1930ء میں ہوئی۔ ایک پڑھے لکھے آدمی کی حیثیت سے انہوں نے شاعری میں بحور، قافیہ، ردیف، تشبیہ و استعارہ اور صنائع بدائع میں کمال

حاصل کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اساتذہ اپنے بے شمار شاگردوں کے غول میں گھرے رہتے تھے۔ عبداللہ چونکہ ایک پڑھے لکھے شخص تھے وہ ان پڑھ شاگردوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے۔ اس لئے ان کے شاگردوں کی تعداد بہت کم تھی اور یہ بات ان کے لئے نقصان کا باعث بنی۔ بات یہ ہے کہ شاگرد ہر محفل میں اپنے کلام سے پہلے اپنے استاد کا کلام پیش کیا کرتے تھے اور یوں اساتذہ کے کلام کو زندگی اور دوام بخشتے تھے۔ اگر چہ یہ کلام سینہ بہ سینہ آ تا رہا اور بہت حد تک محققوں نے ان اساتذہ کے کلام کو شاگردوں کی وساطت سے قلم بند بھی کرلیا لیکن استاد عبداللہ ایسے شاعر تھے کہ ان کا کلام آگے نہ بڑھ سکا۔ ان کی چند حرفیاں ہم تک پہنچی ہیں جن میں علم وفضل اور بلند خیالی بڑے واضح انداز میں سامنے آتی ہے۔

حرفی دے تختۂ نرد اُتے مہر عقد ثریا دے جوڑ سکناں
بلکہ سدِ سکندر دے فصلیاں تک اپڑی عقل دے گھوڑے نوں ٹور سکناں
جے دیکھاں سنسار دے سامنے میں جھٹ اکھاڑ کے پنجہ مروڑ سکناں
عبداللہ تیں دے تیں اس شاعر خبیث شخص دے دند میں توڑ سکناں

اردو ترجمہ: ''میں حرفی کے تختہ نرد پر عقد ثریا کے سورج جوڑ سکتا ہوں بلکہ سدِ سکندری تک میرا اشہت خیال دوڑ سکتا ہے۔ اگر دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا پہلوان میرے سامنے آئے، اس کا پنجہ مروڑ سکتا ہوں۔ اے عبداللہ! اس خبیث شاعر کے دانت توڑنے کی سکت رکھتا ہوں۔''

تجھے اناج نہ باج تیرے ہوݨ مزاج نو کرکے' علاج رکھئے
یوسف ثانی مہربانی دے نال جانی دُنیا فانی ہے کوئی دن راج رکھئے
وانگ برق دے تڑق نہ فرق کوئی کشتی غرق بس ہوئے تاراج رکھئے
وانگ شیر نہ دیر بے مہر ساقی نہ چشم پھیر عبداللہ دی لاج رکھئے

اردو ترجمہ: ''تیرے اناج اور باج کی کوئی بات نہ سوجھے، تیرے مزاج کو سمجھا تو گویا علاج پالیا۔ یوسف ثانی تیری مہربانی کے ساتھ میری جانی دنیا فانی ہے، کچھ دن راج کرلو، برق کی طرح اس کی تڑق کا فرق بس کشتی غرق ہونے والی ہے اور یہیں تاراج کرلو شیر جست کی طرح۔ دیر نہ ہوتا اے بے مہر ساقی مجھ سے آنکھیں مت پھیرو اور عبداللہ کی لاج رکھو''

سیفی شاہ

سیفی شاہ کا اصل نام شیر شاہ اور تخلص سیفی تھا تاہم سیفی شاہ کے نام سے مشہور رہے، قوم کے رضوی تھے۔ان کے والد حاجی میرا اکبر شاہ تعزیہ دار تھے۔اپنے آبائی مکان محلہ محمد داد (آسیہ) پشاور میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کا سال 1886ء بتایا گیا ہے۔سیفی شاہ کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ مادری زبان ہندکو کے علاوہ اردو' فارسی' سرائیکی اور پنجابی میں شعر کہے ہیں۔شاعری میں انہیں ہندکو کے مایہ ناز شاعر استاد احمد علی سائیں کا تلمذ حاصل تھا۔ ان کے مقبول سلام اور مرثیے شائع ہو چکے ہیں۔

پشاور کے دو محلوں کو اس لئے بڑی شہرت حاصل ہے کہ یہاں بڑے بڑے شعراء نے جنم لیا۔ان کا بچپن اور ان کی جوانیاں یہاں گزریں۔ان محلوں میں بڑے بڑے شعری اجتماعات ہوئے ہیں۔ان محلوں میں سیفی شاہ کا محلہ آسیہ (جس میں گڑ منڈی' محلہ محمد داد' عصا شاہ مردان' منڈی بیری شامل ہیں) خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔یہاں استاد پہلوان رمضو، سائیں احمد علی، استاد سیفی، خادم حسین کربلائی، استاد جگر کاظمی، محمود الحسن کوکب، رضا ہمدانی، جوہر میر، خواجہ یعقوب اختر اور نجانے کون کون پلے بڑھے اور شعری محلات تعمیر کرتے رہے۔

شیر شاہ عام طور پر سیفی شاہ کے نام سے پہچانے جاتے ہیں کہ یہی نام شیریں مشہور ہوا۔چونکہ وہ اثنا عشری عقیدے سے تعلق رکھتے تھے اور خاندانی طور پر تعزیہ دار تھے اس لئے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ حضرت امام حسینؓ کی مداحی اور ان کے مرثیوں اور نوحوں پر مشتمل ہے۔ان کے مرثیے، سلام اور نوحے بہت مشہور ہیں اور پشاور میں ہر محرم میں ہر طرف گونجتے سنائی دیتے ہیں۔بقول رضا ہمدانی، ''سیفی شاہ کے چند اردو اور ہندکو سلام' نوحے اور مرثیے تو اب کلاسیک کا درجہ رکھتے ہیں اور گزشتہ پون صدی سے تواتر کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ٹھیٹھ ہندکو زبان کے علاوہ سیفی شاہ نے پنجابی خصوصاً سرائیکی میں بھی سلام اور نوحہ کہا ہے۔''

ان کی حرفیوں کے دو نمونے یہ ہیں:

''ع'' عاشقاں دے خشک خمیرو چوپھٹ کے بوٹی بن گئی اے وچ عام مہندی

لگے تدے زیب دست و پا کرنے سمجھ کے تحفے سارے گلفام مہندی

ایہہ تاثیر عاشق دے خون دی اے جیہڑی سرخی دس رہی اے مدام مہندی

سیفی زینتِ دستِ دلدار ہو کے کردی ستم والے انتظام مہندی

اردوترجمہ: ''عاشقوں کے خشک خمیر سے اگ کر بوٹی عام لوگوں میں مہندی کہلائی۔تب سے دست و پا کو زیب وزینت بخشنے کے لئے گلفام مہندی لگانے لگے۔ یہ تاثیر عاشق کے خون کی ہے جو ہمیشہ کے لیے مہندی کی سرخی بن گئی ہے۔اے سیفی محبوب کے ہاتھ پر پھیل کر مہندی ستم گر بن جاتی ہے۔''

''ل'' لاالہ اندر مضراب مارے تے اللہ اللہ پئی دل دی ستار بولے
رگ رگ وچ عشق حقانی ہووے تار تار ستار ستار بولے
جاوے کھل جے وحدت دا رنگ سارا زباں تو ای تو پئی بار بار بولے
انا الحق سیفی حق حق کرکے سرِ دار منصور دے ہار بولے

اردوترجمہ: ''لا الہ میں مضراب کی چوٹ پڑے تو دل کی ستار اللہ اللہ بولتی ہے، رگ رگ میں عشق حقانی ہو اور تارتار ستار ستار کا ورد کرے، اگر وحدت کا رنگ کھل جائے تو زبان سے تو ہی تو کے کلمے نکلیں۔سیفی منصور کی طرح اناالحق کو حق حق کہے اور سرِ دار بولے''۔

سید جگر کاظمی

استاد سید جگر کاظمی اردو اور فارسی زبانوں میں بھر پور طور پر لکھتے رہے اس لئے اگر چہ انہوں نے ہندکو میں سی حرفیاں کہیں، لیکن وہ کم تر دستیاب ہیں۔جگر کا اصل نام سید لعل شاہ کاظمی تھا۔پشاور میں 21 مئی 1877ء میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سید نیاز علی شاہ تھے۔ وہ کاظمی سادات میں سے تھے۔لعل شاہ بچپن میں بزرگوں کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اس زمانے میں پشاور کے تاجروں کا کاروباری ٹھکانہ کلکتہ ہوا کرتا تھا۔لعل شاہ نے کلکتہ کے مدرسہ عالیہ میں تعلیم حاصل کی۔مولانا ابوالکلام آزاد ان کے ہم جماعت تھے۔ وہاں انہیں اچھا ادبی ماحول میسر آیا۔مشاعروں میں شعراء کو سننے کے لئے جایا کرتے۔1896ء سے شعر کہنا شروع کیا اور مولانا عبدالغفور نساخ کے بیٹے نوابزادہ ابومحمد شمس کے شاگرد ہو گئے۔پھر یوں ہوا کہ خانگی جھگڑے کی وجہ سے کلکتہ سے بھاگ کر مونگیر، کانپور اور پھر دہلی آ گئے جہاں ایک جوہری کے ہاں منشی گیری کا کام کرنے لگے۔فارسی میں خط و کتابت کے ماہر تھے چنانچہ وہاں دو برس قیام کیا اور وہیں حضرت داغ سے ملاقات ہوئی۔1897ء میں پشاور واپس لوٹے۔

حلقہ احباب میں سائیں احمد علی، صحیح سالم اوز برق گنجوی جیسے بلند پایہ ہندکو اور فارسی کے شعراء تھے، اس لئے ہندکو کی طرف بھی راغب ہو گئے اور اردو، فارسی کے علاوہ ہندکو میں بھی بہت کچھ لکھا، ان کی دو ایک حرفیاں دستیاب ہیں۔نمونہ پیش

خدمت ہے:

اے راز معلوم ہے ہور کس نوں، سّر حق دا رکھدیاں راز اکھیاں
اگے گیئاں مقام محمود کولوں ، ہویاں واقفِ راز و نیاز اکھیاں
اکھیاں جاون قربان انہاں اکھیاں توں ،جیہڑیاں اکھیاں ہوئیاں ممتاز اکھیاں
جگر کیہڑا دن ہوسی میرے ول لطف کر کے او پھیرسی بندہ نواز اکھیاں

اردو ترجمہ: ''یہ راز اور کس کو معلوم ہے، سرِّ حق کا راز آنکھوں کو معلوم ہے۔ یہ مقام محمود سے بھی آگے پہنچ گئیں ۔آنکھیں راز و نیاز سے واقف ہو گئیں۔ آنکھیں ان آنکھوں کے قربان، وہ آنکھیں ممتاز ہو گئیں۔ جگر! وہ کون سا دن ہوگا کہ وہ میری طرف لطفاً آنکھیں پھیرے گا۔''

جگر صاحب نے 95 برس سے زیادہ عمر پائی۔ وہ آخر وقت تک چست اور صحت مند رہے لیکن ایک دن پشاور کلب روڈ پر خانہ فرہنگ ایران سے نکلے اور بس پر چڑھنے لگے کہ پاؤں رپٹا اور گر گئے جس سے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس عارضے سے وہ آخر کار جانبر نہ ہو سکے۔

حیدر بسمل

حیدر بسمل بھی جگر کاظمی کے ہمعصروں میں سے تھے۔ حرفی کہتے تھے۔ استاد سائیں کی شاعری سے متاثر تھے۔ ان کی حرفیوں کے کچھ ضعیف اوراق دستیاب ہوئے ہیں۔ بعض حرفیاں اوراق کے گوشوں کے گل جانے کی وجہ سے نامکمل رہ گئی ہیں۔ ان کے کاغذات میں ان کے حساب کتاب درج ہیں۔ یہ کام ان کی جوانی اور کاروباری ایام سے تعلق رکھتے ہیں اور ان پر 1906ء کی تاریخ لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انیسویں صدی میں پیدا ہوئے اور جگر کاظمی کی پشاور میں اردو اور سائیں احمد علی کی ہندکو مجلسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ جگر صاحب کا کہنا ہے کہ وہ سائیں احمد علی کے شاگردوں میں سے تھے۔ حیدر بسمل اور بسمل نام کے دو شعراء ہمارے سامنے آئے ہیں۔ حیدر بسمل کی حرفیوں میں تخلص بسمل ہی استعمال ہوا ہے، لیکن ایک حرفی ایسی بھی دستیاب ہوئی ہے جس میں شاعر کا نام حیدر درج ہے۔

ان کی یہ حرفی حسن زبان کی منہ بولتی تصویر ہے، اس میں لفظ ''وَل'' کو چار مختلف معنوں (ہار، صحت مند، دوبارہ، طرفدار) میں استعمال کیا گیا ہے۔

نادان نہیں سمجھدا گل سدھی، کیتی گل تے گلے دا وَل ہویا

ہوندے وَل تا سوری ازار والے ، دکھی گل دا ناں کدے وَل ہویا
اس نو کیمیا کہیا وَل تو آ پیارے، بُر اسجھ کے غیر دے وَل ہویا
بسمل کہے کھملا کے خشک ، دلبر اوڑک دل میرے دا کنول ہویا

اردو ترجمہ: ''نادان سیدھی بات نہیں سمجھا۔اس نے بات کی اور گلے کا ہار ہوئی۔آزار دینے والی دکھتی بات کا غم کبھی صحت مند ہوسکتا ہے۔اسے کیمیا کہا ہے تو اے پیارے پھر آ جا۔غیر کا طرفدار نہ ہو،بسمل کہتا ہے کہ دلبر آخر کملا کر میرے دل کا کنول بن گیا''

حافظ غلام محمد

حافظ غلام محمد علاقہ یکہ توت میں ملک کندہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ زمیندار ملک تھے۔مکتب میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع بھی ملا۔انہوں نے قرآن حفظ کیا،اس لئے ان کے نام کے ساتھ حافظ کا اضافہ ہوگیا۔ان کی ایک حرفی دستیاب ہوئی ہے۔

میرے فہم و ادراک دے پڑدیاں وچ روشنی ھک شمع کررہی اے
ماضی بعید تے حال دے کجھ قصے ، داستان حیات جمع کررہی اے
وانگ مالی دے ہتھ وچ مقراض لے کے گندیاں شاخاں دا قلع قمع کررہی اے
ہووے ھندکو دے وچ پیدا سر سید حافظ میری روح اے طمع کررہی اے

اردو ترجمہ: ''میرے فہم وادارک کے پردوں میں ایک شمع روشنی پھیلا رہی ہے۔ماضی بعید اور حال کے کچھ قصے ، زندگی کی داستان مرتب کر رہے ہیں ۔ مالی کی طرح ہاتھ میں قینچی لے کر گلی سڑی شاخوں کو کاٹ رہا ہے۔ہندکو زبان کو کوئی سرسیّد مل جائے۔حافظ میری یہی تمنا ہے۔''

اس حرفی کا قافیہ اور انگریزوں کے دور میں سرسید کی وطن اور قوم پرستی کا احساس ایک پڑھے لکھے شخص کو ہی ہوسکتا ہے۔پھر حافظ نے اس حرفی میں جس انداز سے قافیے استعمال کئے ہیں وہ ایک پڑھے لکھے آدمی کا حصہ ہیں۔

عطا محمد درزی

عطا محمد درزی (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے)،درزی کا کام کرتے تھے،لیکن اپنے پیشے سے اتنی محبت تھی کہ انہوں نے

اپنا تخلص ہی ''درزی'' لکھ لیا۔ شہر میں عطا محمد درزی کو عام طور پر لوگ ''عطو درزی'' پکارا کرتے تھے۔ ان کی ایک حرفی ملاحظہ ہو:

جوبن جوانی تے عیش مستی ، انھاں جانا نئیں دلبرا نال تیرے
حاکم حکومت دے زور زینت سارے ، رہ جان اس جگہ مال تیرے
چھوڑ کبر تے مان مغرور سبھے کیونکہ خواب ہوجان خیال تیرے
کسے یار نہیں آنا کم اتھے ، درزی اتھے کم آون سب اعمال تیرے

اردو ترجمہ: ''اے میرے محبوب! تیرا جوبن اور جوانی اور عیش و مستی وغیرہ نے تیرے ساتھ نہیں جانا۔ حاکمیت، حکومت اور زور و زینت یہ سارے سامان یہاں رہ جائیں گے۔ اب غرور اور کبر کو چھوڑ کیونکہ یہ سارے خیالات خواب ہو جائیں گے یہاں کوئی دوست یار کام نہیں آتے، صرف تیرے اپنے اعمال کام آئیں گے''

موجی

موجی کا نام بعض لوگوں نے موچی لکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ جوتوں کا کاروبار کرتا تھا لیکن تخلص اس نے موجی رکھا تھا۔ حرفی کہتا تھا اور حرفی میں ایک مقام کا مالک تھا۔

اجڑ گئی میری جھوک یارو ، لے کے ٹر گیا اوہ قرار دل دا
چارو پاسے اوہ غُپ ھنیرا ہویا ، رستہ لبھا نہ آر تے پار دل دا
اکھیاں ترس گیاں ھک گاہک واسے کوئی رہیا نہ اتھے خریدار دل دا
منڈی بند ہوگئی اے عشق والی، سرد ہوگیا ، موجی بزار دل دا

اردو ترجمہ: ''میرا گھر لٹ گیا۔ وہ میرے دل کا قرار لے کر چل دیا۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ کہیں راستہ نہیں مل رہا۔ آنکھیں صرف ایک گاہک کے لئے ترس گئی ہیں۔ کوئی دل کا خریدار نہیں رہا۔ عشق والی منڈی بند ہوگئی ہے اور دل کا بازار سرد پڑ گیا ہے۔''

محمد سرور سائیں

محمد سرور معروف شاعر سائیں کے زمانے کا شاعر تھا، بازار کلاں کا رہنے والا تھا اس لئے گنج والوں کا اس پر اثر تھا، حرفی کہتا تھا۔ ان کی حرفی ملاحظہ ہو:

نجومی سٹ قرعہ تے دیکھ طالع میرا اختر منحوس پامال کیوں وے

سر تے ٹٹا ہویا وے پہاڑ غم دا ، پیشانی وچ گردش کمال کیوں وے
دُرج ، بُرجاں وچ جیکر اسیر ہیواں ، بدلا بخت دا کوسِ ہلال کیوں وے
سرور تختہ محفوظ دا پلٹ جاوے ، میری قسمت وچ عشق دی بدفال کیوں وے

اردو ترجمہ: ''اے نجومی قرعہ پھینک اور میری قسمت کا حال دیکھ، میرا استارہ پامال کیوں ہو گیا، میرے سر پر غموں کا پہاڑ ٹوٹا ہوا ہے، پیشانی میں گردش کیوں لکھی ہے۔ میں جو برجوں کے دورج میں اسیر ہوں، میرے بخت کی قوس ہلال کیوں بدل گئی ہے۔ سرور لوح محفوظ پلٹ جائے میری قسمت میں عشق کی فال کیوں پلٹ گئی ہے۔''

گل محمد

گل محمد (ٹوپیاں والا)، ٹوپیاں بنانے اور ان پر باریک دھاگے کا کام کیا کرتا تھا۔ محلّہ گنج میں سکونت پذیر تھا۔ اکثر گھر سے نکل کر شیخ جنیدؒ کے مزار پر جا بیٹھتا تھا۔ یہ سائیں کے شاگردوں میں سے تھا اور استاد سیفی کا استاد بھائی تھا۔ حرفی کے فن میں بہت اعلیٰ درجے کا مالک تھا۔

الٰہی بخش مفلس

اُستاد الٰہی بخش مفلس علاقہ یکہ توت کے رہنے والے تھے۔ شخصیت، شاعری اور شعور کے لحاظ سے وہ پشاور کے ہندکو شعراء میں ایک بلند مقام کے مالک تھے۔ چار بیتے بھی کہتے لیکن ان کی حرفیاں بڑی زور دار تھیں ۔ ہندکو مشاعروں میں اکثر شرکت کیا کرتے اور جادو بیانی اور بلند آہنگی کے سبب محفل پر چھا جایا کرتے۔ طبیعت کے دوسرے سائیں احمد علی تھے۔ دو مرتبہ ریڈیو پاکستان کے ہندکو مشاعروں میں شرکت کی۔ اس وقت وہ خاصے ضعیف ہو چکے تھے پھر بھی ان کے اندر کا شوق انہیں ضعف سے بعید رکھے ہوئے تھا۔ ان کی وفات 1956ء میں ہوئی۔

تیرے عشاق نے اے جان میری روز ازل سی پڑھی کتاب وکھری
بازی جیتی اس قیس فرہاد کولو اس دی صف ہوئی انتخاب وکھری
ہجر ہویا وے دشمنِ جان وکھرا نالے جان پے گئی وچ عذاب وکھری
تیری تیغ سی مفلس نوں ذبح ہو کے ملی عاشقاں دی آب تاب وکھری

اردو ترجمہ: ''اے محبوبہ! تیرے عشاق نے روز ازل سے الگ کتاب پڑھی۔ اس نے قیس وفرہاد سے بازی جیت لی، اس کی صف الگ منتخب ہوئی۔ ہجر دشمن جان ہوا، میری جان عذاب میں پڑ گئی! تیری تیغ سے مفلس کو ذبح ہو کے عشاق میں منفرد آب وتاب ملی۔''

خادم حسین کربلائی

آسیہ کے مردم خیز محلے کا ایک خوبصورت شاعر خادم حسین کربلائی بھی ہے۔ وہ اور استاد گھائل دونوں استاد سیفی شاہ کے شاگردوں میں سے تھے۔ خادم حسین کربلائی کے کلام میں تازگی اور تلاش کا حسن ملتا ہے۔ اس کے ہاں تشبیہوں کا انداز سائیں احمد علی کا ہے۔ انہوں نے چار بیتہ، نوحہ، مرثیہ سبھی کچھ کہا، لیکن حرفی کا رنگ نکھرا ہوا ہے۔ ہندکو لفظ ومعنی کی پوری درک رکھتے تھے۔

اُتھے نخلِ امید کد پھل دیندا ، جس کھیت دی زمی کمزور ہووے
ترانے بلبلاں دے اُتھے کد ہوندے جتھے زاغ و زغن دا شور ہووے
اس دے وعظ دا نئیں کچھ اثر ہوندا، جہیڑا خود عملاں دا چور ہووے
اس یار تے رکھیں نہ آس خادم، دلو چور تے منہ تے کجھ ہور ہووے

اردو ترجمہ: ''جس کھیت کی زمین کمزور ہو وہاں نخل کب پھل دے سکتا ہے۔ جہاں زاغ وزغن کا شور ہو وہاں بلبلوں کے نغمے کب سنائی دے سکتے ہیں۔ جو خود بد عمل ہو اس کے وعظ کا کب اثر ہو سکتا ہے۔ اے خادم اس دوست سے کوئی امید نہ رکھنا جو منہ سے کچھ اور ہے اور دل میں کچھ اور۔''

استاد وحشی

استاد وحشی، استاد احمد علی سائیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ علاقہ گنج کے رہنے والے تھے۔ تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ جوانی تک صاحبِ حیثیت اور صاحب جائداد تھے۔ اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے معاشرے میں مقام پیدا کیا۔ 1952ء میں وفات پائی۔ ان کی حرفی میں سائیں کا رنگ واضح طور پر جھلکتا ہے۔

استاد عبدالحکیم

استاد عبدالحکیم پشاور کے رہنے والے تھے، لیکن تلاش روزگار انہیں راولپنڈی لے گئی۔ استاد سائیں کی راولپنڈی

میں موجودگی سے انہیں اچھا شعری ماحول میسر آیا اور وہ بھی حرفی کہنے لگے۔ ان کی حرفیوں میں سوز وگداز بدرجہ اتم ملتا ہے۔ تعلیم کوئی زیادہ نہ تھی لیکن اردو، فارسی، پشتو اور ہندکو پر مکمل عبور تھا۔ 1954ء میں فوت ہوئے۔

استاد محمد یونس یونس

استاد محمد یونس یونس 1894ء میں علاقہ گاڑی خانہ میں پیدا ہوئے اور اپنی وفات یعنی 1984ء تک وہیں رہے۔ حرفیاں لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ انہوں نے قیام پاکستان کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی شاعری میں طبقاتی ناہمواری کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ وہ خود مزدور تھے غریبوں کا درد ان کے دل میں ٹھاٹھیں مارتا تھا۔

استاد غلام رسول گھائل

استاد غلام رسول گھائل، ہندکو کے اُن خوش قسمت شعراء میں سے ہیں، جن کا کلام ان کی زندگی میں ہی شائع ہوگیا۔ 1962ء میں استاد گھائل کی حرفیوں کا مجموعہ ''دیوان گھائل'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ پروفیسر الٰہی بخش اعوان کی کوششوں سے منصۂ شہود پر آیا اور ان ہی کا نام اس دیوان کے مرتب کے طور پر کتاب کی پیشانی پر چھپا۔

استاد گھائل 1914ء میں قصہ خوانی کے علاقے میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤاجداد شہنشاہ بابر کے ساتھ افغانستان سے آئے تھے۔ ان کے والد کا نام غلام حسن تھا۔ بدقسمتی سے وہ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے، اس لیے فکرِ معاش نے انہیں تعلیم سے محروم کردیا۔ انہیں فطری طور پر شعروسخن سے محبت رہی، استاد غلام رسول گھائل حرفی کے شاعر تھے اور حرفی میں ان کا انداز روایتی اور کلاسیکی رہا۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے رہے۔

انہوں نے ہندکو ادب کی خدمت کے لیے ''بزم شعور ہندکو'' کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی۔ بزم شعور ہندکو نے آج کے کئی نوجوان اہل قلم کو تربیت دی۔ استاد گھائل نے حرفی کے علاوہ غزلیں بھی لکھیں اور بارہ ماسے بھی۔

ایسے حسین قزاق دے گیر چڑھیاں ، جھیڑا گیاوے گنجِ حیات لٹ کے

مار کے نیناں دی جگر وچکار برچھی گیا دل دی میرے کائنات لٹ کے

جھیڑی سانبھ کے رکھی ائی وچ سینے ظالم لے گیا اُوہ بی سوغات لٹ کے

بڑے لوبھی ہوندین لے حسین گھائل نئیں رجدے کدی شش جہات لٹ کے

اردو ترجمہ: ''میں ایسے خوبصورت ڈاکو کے پنجے میں پھنس گیا جس نے زندگی کا خزانہ لوٹ لیا۔ آنکھوں کی برچھی

میرے جگر میں گاڑ کر اس نے میرے دل کی کائنات لوٹ لی جو میں نے دل میں سنبھال کر رکھی تھی وہ سوغات بھی لوٹ لی۔ یہ حسین بڑے لالچی ہوتے ہیں شش جہات لوٹ کر بھی مطمئن نہیں ہوتے۔"

عبداللطیف ساجن۔عبدالرشید تاج

محلّہ گنج میں عبدالطیف ساجن اور عبدالرشید تاج دو بھائی تھے۔ دونوں بھائی شاعر تھے اور گنج خیلی ہونے کے سبب حرفی ان کی شاعری کی دل پسند صنف تھی۔ ان دونوں بھائیوں نے بہت لکھا اور خوب لکھا۔

ساجن بڑے بھائی تھے اور بزرگی کے نقطۂ نظر سے غالباً وہ برادر خُرد کے سامنے عشق و عاشقی سے زیادہ دین و مذہب، پندونصائح اور وقت پیری نماز کی باتوں کے قائل تھے۔ تاج جس مشاعرے میں جاتا اپنے پڑھنے کے دلکش اور بلند آھنگ انداز سے مشاعرہ لوٹ لیتا۔ ساجن اور تاج کا تیسرا بھائی بابوصادق بھی ایک اچھا شاعر تھا۔ ساجن بھی استادوحشی کا شاگرد تھا۔

ان دونوں کا شعری کلام ملاحظہ ہو:

عبداللطیف ساجن

میرے اِس دلِ مظلوم اُتے دلبر اتنا ظلم بے انداز نہ کر
ابتدا سی تیرا شیدا میں واں میرے سازِ دل نوں بے آواز نہ کر
چُھٹ پنے وچ ویکھے میں ناز تیرے ہون جوانی وچ ویکھ تو ناز نہ کر
تیرے راز دا محرمِ اسرار ساجن تو غیر نال راز و نیاز نہ کر

اردو ترجمہ: "اے محبوب، میرے مظلوم دل پر یوں بے اندازہ ظلم نہ کر۔ میں ابتدا سے ہی تیرا شیدا ہوں میرے ساز دل کو بے آواز نہ کر۔ میں تمھارے ناز تمہاری کم عمری سے دیکھ رہا ہوں، جوانی میں اب وہ انداز چھوڑ۔ تیرے راز کا محرمِ اسرار ساجن ہے تو غیر سے راز و نیاز نہ رکھ۔"

عبدالرشید تاج

لیلیٰ دی تے شیریں دی قسم مینوں ، تیرے اُتو میں دل نثار کرساں
تیریاں شربتی شربتی اکھیاں دا انہاں اکھیاں وچ انتظار کرساں
دل دے شیشے وچ تیری تصویر تک کے تیری زلف موباف نوں پیار کرساں

تیرے پیراں دی مٹی نوں تاج کہندا کوہجے منہ تے مل کے سنگھار کرساں

اردو ترجمہ: ''مجھے لیلیٰ اور شیریں کی قسم، میں تجھ پر دل نثار کروں گا۔ تیری شربتی آنکھوں کا ان آنکھوں سے انتظار کروں گا۔ دل کے آئینے میں تیری تصویر رکھ کر موباف سے پیار کروں گا۔ تاج! میں تیرے پاؤں کی مٹی اپنے بدصورت چہرے پر مل کر سنگھار کروں گا۔''

گل محمد ذاکر

گل محمد ذاکر کسی قدر تعلیم یافتہ تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا کلام چھوڑا ہے جو تاج محمد تاج کے پاس محفوظ ہے، تاج محمد تاج اسے اپنا استاد کہتا ہے۔ گل محمد ذاکر نے مرثیے، نوحے اور سلام بھی لکھے۔ حرفی اچھی لکھتا تھا۔ شاعری کا نمونہ ملاحظہ ہو:

سخاوت وچ یار یکتا ہیوے ، بھکھاں نال نئیں عاشقاں ماردا وے
غم کھانے نوں پینے نوں خونِ جگر ، دیندا اے لنگر پیا چلدا سرکار دا وے
دل درد، آہ سرد، رنگ زرد لے تے نالے زرد رنگ عاشقاں سنگھار دا وے
دے کے دید حشر وچ وصل کرسی، کہندا اے ذاکر کہ پکا اقرار دا وے

اردو ترجمہ: ''اگر محبوب سخاوت میں یکتا ہو تو عاشق کو بھوکا نہیں مارتا۔ کھانے کو غم، پینے کو خون جگر۔ میرے سرکار کا یہی لنگر جاری ہے۔ دل درد، آہ سرد، رنگ زرد، نیز زرد رنگ عاشقوں کے سنگھار کے لئے ہے۔ حشر میں اپنا جلوہ دکھا کر وہ وصل کا ساماں کرے گا۔ ذاکر کہتا ہے کہ یہ پکا اقرار ہے۔''

1.4۔ نوکلاسیکی دور

بیسویں صدی ایجادات اور انقلابات کی صدی بن کر آئی، اس صدی میں عظیم عالمی جنگیں بھی ہوئیں۔ لاکھوں انسان زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بڑی بڑی طاقتیں اپنا زور اور اپنا گھمنڈ کھو بیٹھیں۔ اس صدی میں ہوائی جہاز بھی ہواؤں میں انسان کو اڑانے لگے اور انسان انسانوں پر آسمان سے بارود کی بارشیں بھی کرنے لگے۔ اس صدی میں جوہری بم بھی ایجاد ہوا اور انسانوں اور فضاؤں کے لیے سم قاتل بنا۔ اس دور میں کئی شہنشاہیاں ختم ہوئیں۔ جمہوریت کا ڈول ڈالا گیا۔ روس اور چین میں اشتراکیت کے تجربے ہوئے اور انسانوں کو برابری کا حق دینے کا اعلان ہوا۔ کئی ملکوں کی حکومتوں کے تختے الٹے گئے۔ برطانیہ کے کبھی نہ غروب ہونے والے سورج کو گہن لگ گیا۔ علم وعرفان کے چراغ روشن ہوئے۔ احتجاج کی

رو چلی، کئی ملکوں کو غلامی سے نجات ملی۔ پاکستان وجود میں آیا اور کئی ملکوں نے آزادی کے سویرے دیکھے۔

اس دوران دریائے سندھ کی روانیوں میں بھی انقلاب آیا۔ اس دریا پر پل بنے، بند باندھے گئے۔ وادئ سندھ کی تہذیب نے ایک آزاد مسلم مملکت کو طلوع ہوتے دیکھا۔ اسی صدی میں ہندکو زبان وادب نے بھی نئی دنیا سے ہم آہنگی کا ثبوت دیا اور کچھ شعراء اور ادباء نے نئے دور کے انقلابات کا ساتھ دیا، انقلاب کا سبب بھی بنے اور انقلابی تحریروں کی تخلیق بھی کی۔ سندھ کے بالائی حصوں سے اس کے دہانے تک ہر علاقے میں نوکلاسیکی ادب کی رو چلی۔

محمد جی ونجیارا، نوکلاسیکی دور کا ایک صاحبِ شعور شاعر تھا۔ اس نے اپنے دور کے شعراء میں ایک اہم مقام حاصل کیا اور قابل احترام زندگی گزاری۔ وہ انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں میں پیدا ہوا اور 1937ء میں وفات پائی۔ محمد جی ونجیارا فن موسیقی سے بھی آشنا تھا۔ وہ زمانہ جبکہ ہر طرف حرفی اور چار بیتے کا دور دورہ تھا، محمد جی ونجیارا نے حرفی اور چار بیتے کے ساتھ پہلی مرتبہ جدید دور میں ہندکو غزل لکھی۔ ونجیارا نے غزل محض لکھی ہی نہیں، اس کی دھنیں بنا کر مختلف راگوں میں ان کو ڈھالا بھی۔ وہ حرفی میں بھی نئی شان اور نئے انداز کا شاعر تھا۔ اس کے چار بیتوں کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے انہیں اونچا مقام بخشا ہے۔

1930ء برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسا سال ہے، جب انگریزوں کے خلاف جدوجہد اپنے عروج پر پہنچی۔ جلسے جلوس شروع ہوئے۔ اس دور میں سیاسی، نظریاتی اور ادبی انقلاب کی داغ بیل پڑی۔ تصور پاکستان بھی اسی سال کی پیداوار ہے۔ نئے ادب میں اردو زبان میں لکھنے والوں نے انقلاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی کا اظہار کیا۔ اس دہائی میں ترقی پسند تحریک کا آغاز بھی ہوا۔ اسی دہائی میں ونجیارا نے چار بیتے اور حرفی کے ساتھ ساتھ غزل سے ہندکو شاعری کو روشناس کیا۔

ان کی پہلی غزل ملاحظہ ہو:۔

یاری لانی اے سکھلی ، پر نبھانی اوکھی اے
آتش عشق والی لگے تا، بجھانی اوکھی اے
کملی والیا سائیاں، رکھیں لج لڑ لائیاں
جند نیناں والے تیر سی بچانی اوکھی اے
جنہاں عشق اے کمایا، حکم در در رُلایا
ہونی ہوندی اے ونجیارے ، پھر مٹانی اوکھی اے

آغا محمد جوش

آغا محمد جوش 1909ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ شاعری کا شوق جوانی کی امنگوں نے بخشا۔ استاد سائیں کی صحبتیں دیکھیں، لیکن سائیں کے شاگرد رشید استاد شیر شاہ سیفی کے شاگرد ہوئے۔ پشاور کے نو کلاسیکی دور کے سربراہ شعراء میں سے ہیں۔ ان کی حرفیوں میں جدیدیت اور تازگی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ سلاست اور روانی ان کی شاعری کے جوہر ہیں۔ ان کے آخری دور کی حرفیوں میں تصوف کی چاشنی پیدا ہوگئی تھی۔ ان کے کئی شاگرد تھے جو ہندکو روایتی شاگردوں کی طرح ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ان میں نذیر حسین شاد، زیڈ آئی اطہر، باصر نسیم اور ابن برق وغیرہ شامل ہیں۔ آغا صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام ''مٹی دے بت'' کے نام سے 2001ء میں شائع ہوا۔ ان کی نقطہ سنجی، بندشیں، تراکیب، استعارے چونکا دینے والی ایک انتہائی شیریں زبان کے واضح عناصر کے علاوہ آسان زبان، روزمرہ کی باتیں، زندگی کے مضامین، سہل ممتنع کی خوبیاں لئے ہوئے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''مینا تے جام'' میں درج ان کی کی یہ حرفی ہندکو ادب کی بلندیوں کو چھوتی ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

''ز''۔ زبان محبوب دی خوب بولے واہ واہ مٹھیاں مٹھیاں بولیاں دو
کدے ہاں کرے کدے ناکرے، گلاں سجدیاں بھولیاں بھولیاں دو
سوہنڑے مکھ تو زلفاں چکیاں جد اکھیاں کھولیاں پولیاں پولیاں دو
لگیاں ڈاہڈیاں جوش دے وچ سینے نگہ والیاں کالیاں گولیاں دو

اردو ترجمہ: ''میرے محبوب کی زبان خوب بولتی ہے اس کی میٹھی میٹھی باتیں کبھی اقرار کریں کبھی انکار کریں۔ اس کی دو باتیں بھولی بھالی ہیں۔ خوبصورت چہرے سے اس نے زلفیں ہٹائیں اور نرم نرم دو آنکھیں کھولیں۔ تو جوش کے سینے میں نگہ والی کالی کالی دو گولیاں پیوست ہوگئیں۔''

مضمر تاتاری

مضمر تاتاری کا اصل نام غلام صمدانی تھا۔ 1906ء میں پشاور کے حافظوں کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ خود بھی خاندانی معمول کے مطابق قرآن حکیم کا درس لیا۔ تعلیم تو یہیں تک تھی، لیکن خداداد صلاحیت نے ان کو ایک فطری شاعر کی صلاحیتیں بخشیں۔ انہوں نے صرف ہندکو ہی میں شاعری نہیں کی بلکہ اردو میں بھی وہ دلکش لفظی اور معنوی پھول کھلائے کہ احمد ندیم قاسمی یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ:

''اگر مضمر تاتاری علم وفضل سے بھی بہرہ ور ہوتا تو اچھے اچھوں کی کرسیاں خالی کرالیتا۔''

وہ شروع ہی سے شعروشاعری سے دلچسپی رکھتے تھے۔ شعراء کی محفلوں میں اٹھتے بیٹھتے۔ بڑی بڑی کتابیں اپنے طور پر بھی پڑھتے اور پڑھوا کر بھی سنتے۔ انہوں نے بڑے بڑے شعراء کے اشعار، علماء کی کتب اور نقادوں کی تنقیدیں پڑھیں۔ سائیں احمد علی اور سیفی شاہ کی محفلوں میں باقاعدگی سے جایا کرتے۔ لالہ مضمر کی سوچ روایتی شعراء سے بہت مختلف تھی۔ وہ جاگیرداروں، امراء اور سیاستدانوں کی رنگ بدلتی دنیا اور ان کی خودغرضیوں سے نالاں تھے۔ بعد میں وہ ادب کی ترقی پسند تحریک سے منسلک ہوگئے۔

ان کا مستقل ٹھکانہ سائیں احمد علی کی محفلیں، دائرہ ادبیہ، سید ضیا جعفری اور نذیر مرزا برلاس کی محفلیں، فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی قربت اور صحبت، مظہر گیلانی کی محبت کی کشش تھی۔ وہ بڑی باقاعدگی سے پہلے دائرہ ادبیہ، پھر فارغ رضا کی بیٹھک اور مظہر گیلانی کے پیر خانے میں پائے جاتے۔ ان کی اردو اور ہندکو شاعری کا مجموعہ ''آبشار'' فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کی کوششوں سے 1986ء میں شائع ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد آپ کا انتقال ہوگیا۔

ان کی ترقی پسندی اور انقلابی رجحان انہیں اقبالؒ کے تخیل کے اس مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ جہاں انہوں نے کہا کہ:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

مضمر غزل کے رنگ میں فرماتے ہیں:

ہر موڑ تے ڈیوے بال کہ دنیا جاگ اُٹھے
خود آپ بدل حالات کہ جھگڑے چُک جاون
ھک قدم تنے کیہہ بدلا، دنیا بدل گئی
ہون واگ اس پاسے موڑ کہ رستے مک جاون
اوہ کھیتی باڑی ساڑ، جتھے بھکھ اُگدی اے
دے فصلاں نوں تیزاب کہ بیں بی سک جاون
کئی الٹی چلیا چال کہ خطرے رک گئے وُن
ہون ہتھو بازی ہار کہ کھیڈاں ٹک جاون

ھک ہور تو کردے وار کہ اژدر زخمی وے
اٹھ پکڑ، اج نعرہ مار کہ خطرے مُک جاون
نا کھوتر زیناں ڈوھنگیاں ، لاوے پُھٹ پیُسن
کوئی بھارے پتھر جوڑ کہ شعلے رک جاون

رضا ہمدانی

نام مرزا رضا حسین ہمدانی تھا، پشاور میں 1914ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سارا خاندان مشرقی تعلیم سے آراستہ تھا۔ ان کے عموزاد بھائی مصطفیٰ علی ہمدانی لاہور ریڈیو کے مشہور اور تاریخ ساز اناؤنسر رہے۔ وہ مغربی تعلیم سے آشنا نہ تھے، کیونکہ وہ دس سال کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ انہوں نے پانچویں جماعت میں تعلیم کو خیر باد کہا لیکن حصول علم سے دور نہ رہے۔ وہ دن کو کام کرتے اور راتوں کو پڑھا کرتے۔ انہوں نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اچھی خاصی صلاحیت پیدا کر لی اور منشی فاضل اور پشتو فاضل وغیرہ کے امتحان پاس کرنے کے بعد میٹرک بھی نجی طور پر پاس کر لیا۔ انہوں نے فارسی کی وہ ساری کتب جو مشرقی علوم کے لئے لازمی ہوتی ہیں۔ گلستان، بوستان، منطق الطیر، مثنوی معنوی رومی نیز اردو کے سبھی شعراء، افسانہ نگاروں اور نقادوں کو پڑھا، ادبی تحریکوں سے منسلک بھی رہے اور ادبی تحریکوں کی بنیادیں بھی رکھیں۔ وہ اول اول بزم سخن پشاور کے رکن رہے، وہاں اردو اور فارسی کے بڑے بڑے سخنوروں سے صحبت رہی اور ان میں رہ کر اردو اور فارسی ادب میں پوری دسترس حاصل کی، لکھا اور داد حاصل کی اور پھر دائرۂ ادبیہ سے منسلک ہوئے۔ بعد ازاں انہوں نے اپنے ہمزاد سید فارغ بخاری کی معیت میں ایک جدید ادبی انجمن ''ادبستان'' کی بنیاد ڈالی۔

تلاش معاش میں انہوں نے کمپاؤنڈری میں سب سے اونچے درجے کا امتحان پاس کیا اور دیہات میں علاج معالجے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

آخر انجمن ترقی اردو (سرحد) اور ترقی پسند مصنفین کے رکن بنے اور زندگی کو ترقی پسندی کے زینوں پر لا ڈالا اور بلندیوں کی جانب پرواز شروع کر دی۔ انہوں نے فارغ بخاری اور خاطر غزنوی کے ساتھ مل کر سہ ماہی رسالہ ''سنگ میل'' جاری کیا اور ترقی پسند شعراء میں مقام پیدا کیا۔

اردو اور فارسی میں وہ لکھتے ہی تھے، ہندکو میں بھی لکھا۔ تحقیق کا فریضہ ادا کیا، ہندکو ادب کے مختلف پہلوؤں کی آبیاری کی۔ پرانے شعراء، ادباء، کی مجلسوں، زبان، محاورات، آداب، تہذیب و تمدن یا کلچر کے خزانے جمع کئے۔ بے شمار

کتابیں لکھیں۔ ان میں اردو شاعری کے مجموعوں، نثری کتابوں کے علاوہ ہندکو شاعری کے مجموعہ ''مٹھے ڈنگ'' اور ''تُرے تُرے'' کے نام سے صوبہ سرحد میں بچوں کی قدیم کہانیوں پر مشتمل کتاب لکھی۔ اپنے آخری دور میں ایک استاد کا درجہ رکھتے تھے۔ 9 جولائی 1994ء کو وفات پائی۔

2۔ دبستانِ چاربیتہ

چاربیتہ پشتو زبان کی ایک مقبول عام مجلسی صنف ہے جو گائی جاتی ہے اور اردو میں قوالی کی طرح محفل میں رنگ بکھیرتی ہے۔ یہی صنف صوبہ سرحد میں پشتو سے ہندکو زبان میں بھی در آئی اور اس کے شعراء ہزارہ سے زیریں علاقوں تک مقبول و معروف ہوئے۔ یہ نظم کی ایک قسم ہے جس کے دو مصرعے ٹیپ یا استھائی کے طور پر لکھے اور گائے جاتے تھے۔ پھر ہر بند میں تین سے چار تک مصرعے لکھے جاتے ہیں اور پھر ترجیع بند کے طور پر ٹیپ کے مصرعے دہرائے جاتے ہیں۔ یہ صنف پشتون جانباز اپنے ساتھ لے کر ہندوستان گئے اور آج بھی یہ صنف روہیل کھنڈ کے سارے علاقے میں مقبول ہے۔ قیام پاکستان کے بعد چاربیتہ گانے والوں کی ٹولیاں پاکستان ہجرت کر کے آئیں تو حیدر آباد اور کراچی میں آباد ہوگئیں۔ آج بھی ان شہروں میں یہ چاربیت باز اپنے فن اور اساتذہ کے چاربیت اپنے ساتھیوں کی سنگت کے ساتھ محفلوں میں گاتے ہیں اور محفل کی رونق بڑھاتے ہیں۔ رضا ہمدانی نے چاربیتہ پر پوری ایک کتاب اپنی عمدہ تحقیق اور تراجم کے ساتھ لوک ورثہ کے تحت 1978ء میں شائع کی۔ اس میں سرحد کے بہت سے چاربیتہ باز شعراء کا کلام جمع کر دیا گیا ہے۔ سرحد میں اچھے چاربیت کہنے والوں میں فقیر جیلانی، سائیں غلام دین، ارجو برجو، ہر جی مل، کرم داس، حضرت گل، دانش وند، لونگا، اللہ بیلی، نذر و فقیر، سائیں زلابا، محمد عمر عمر، استاد محمد امین، سلطان (جرمن)، محمد جان عاصی، رشید گجر (چوا گجر)، جمالہ مرزا گھگا، آغا جان تلی، فقیر محمد فقیرا، محمد عاشور، شیخ سلطان محمد، کشن چند مُرلی، دامدار خان گھمیار، حضرت اللہ، سردار علی محمد بخشیش، چمن لال موتی، جمعہ خان، پیر بخش، الف دین، بلور سائیں، عمران خان، کرم علی عرف ملی، محمد عمر (ملاحی ٹولہ)، کنہیا سنگھ، مچھی شہار، پرشوتم اور دُنی چند قابل ذکر ہیں۔

سائیں غلام دین

سائیں غلام دین ہزاروی کا پورا نام غلام محی الدین قادری تھا۔ وہ سائیں غلام دین (بابا جی) کے نام سے مشہور تھے ان کا شجرہ نسب پینسٹھویں پشت میں حضرت عمر فاروقؓ سے ملتا ہے۔ سائیں نے بچپن میں مسجد میں تعلیم حاصل کی۔ قرآن حکیم

وہیں پڑھا۔ سائیں غلام دین قرآن حکیم کے مضامین پر غور وفکر کرتے اور ان کا بیان اپنے چار بیتوں میں کرتے۔ سائیں کا تمام تر کلام ہزارہ کی ہندکو میں ہے اور حیدر زمان حیدر کی کوششوں سے ''سوداگراس بازار دا'' کی صورت میں منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ ان کے چار بیتوں کا موضوع وحدانیت، روحانیت اور اخلاقیات کا احاطہ کرتا ہے۔ انہوں نے قرآن وحدیث دونوں کا بڑا گہرا مطالعہ کیا اور لوگوں کو پیش آنے والے مختلف مسائل کو اشعار میں سمویا۔

سائیں غلام دین ہزارے کی آبرو ہیں۔ ان کے کلام کی نزاکت، پاکیزگی، علوئیت، بلند سوچ اور عوامی انداز، ان کو آج بھی ہزارہ کے گوشے گوشے میں اس طرح محبوب بنائے ہوئے ہیں جس طرح پوٹھوہار کے علاقے میں سائیں احمد علی کے نغمے بیتوں کی صورت میں عوام کے دلوں کی دھڑکن بنے ہوئے ہیں۔ وہ چار بیتہ خوانوں میں بہت مقبول رہے اور ان ہی کی وساطت سے ہم تک پہنچے۔ ایک چار بیتہ ملاحظہ ہو:

مالی! پکی آ ڈالی، بلبلاں پایا شور وے
آکے منو لے جا' متے لے جاوی کوئی ہور وے

مالی ہیویں باگاں دا　　تو مالک ساریاں جاگھاں دا
پتہ ہیوی راگاں دا　　تو طوطی میں مور وے
مالی پکی آ ڈالی، بلبلاں پایا شور وے

طوطی بولے بولیاں　　تو بھر پھلاں دیاں جھولیاں
تیرے اُتو گھولی آں　　پا گل ونگڑی نال زور وے
مالی پکی آ ڈالی، بلبلاں پایا شور وے

گل ونگڑی میری ٹُٹی نڈیا　　تو چمبے دی بوٹی نڈیا
اچن چیتی گئی آں لٹی نڈیا　　تے پے گئے عشق دے جھور وے
مالی پکی آ ڈالی، بلبلاں پایا شور وے

چور آگئے نی اچن چیتی　　دھاکھاں کھونے لگے چھیتی
سیو میرے دل دا بھیتی　　جس دی سوہنی بانکی ٹور وے

اردو ترجمہ:　''مالی! پھل پک گیا ہے، بلبلوں نے شور مچا دیا ہے۔ آ! اور مجھے لے جا، کہیں کوئی اور مجھے نہ لے

جائے۔تو باغوں کا مالی ہے، ہر مقام کا مالک ہے۔ تجھے سارے راگوں کا علم ہے۔تو طوطی اور میں مور ہوں۔ مالی پھل پک گیا ہے، بلبلوں نے شور مچا دیا ہے۔طوطی کئی بولیاں بولتا ہے۔تو پھولوں سے جھولیاں بھرلے۔ میں تجھ پرواری تم پورے زور سے مجھے گلے لگالو۔ مالی پھل پک گیا ہے، بلبلوں نے شور مچا دیا ہے۔ اولڑکے! میرے گلے میں حمائل بائیں ٹوٹ گئی ہیں۔تو چمبے کا پودا ہے۔ میں اچانک لٹ گئی ہوں، عشق کے غم مجھ پر چھا گئے ہیں۔ مالی پھل پک گیا ہے، بلبلوں نے شور مچا دیا ہے۔اچانک چور آ گئے۔ دولت لٹنے لگی۔ مرے محبوب میرے دل کے ہمراز تمھاری چال بڑی بانکی ہے۔''

استاد مرزا محمد سعید فارغ قادری سیو

استاد سیو کا اصل نام محمد سعید تھا۔وہ مغل تھے اس لئے مرزا کا اضافہ نام کے ساتھ رہا۔ وہ پشاور کے علاقہ گاڑی خانہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد عبدالحکیم قوم کے چودھری تھے۔ وہ بھی ہندکو کے شاعر تھے۔ان کے چار بیٹے بھی قابل ذکر ہیں۔ محمد سعید کی عمر دس سال تھی کہ والد فوت ہو گئے۔ان کی پرورش بابا بھولو نامی بزرگ نے کی جو ان کے دادا تھے اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے محمد سعید کو رائج تعلیم بھی دلائی۔سائیں احمد علی کا اس زمانے میں پشاور میں طوطی بولتا تھا۔محمد سعید ان کے شاگرد ہو گئے اور ہندکو حرفی میں طبع آزمائی شروع کر دی۔ ہندکو میں سیو اور فارغ دونوں نام استعمال کئے۔ انہوں نے اردو میں بھی شاعری کی۔ ان کا اردو کا تخلص فارغ تھا، وہ قادریہ سلسلے سے منسلک تھے اس لئے فارغ قادری کہلائے۔ اردو میں مولانا غریب سہارن پوری کے شاگرد ہو گئے۔ مولانا غریب کا پشاور کے شعراء پر بڑا اثر تھا۔ پشاور کے ایک اور مشہور شاعر اور سرحد کے پہلے صاحب دیوان شاعر مرزا بیدل پشاوری بھی ان کے شاگرد تھے۔ مرزا محمد سعید سیو فارغ قادری اپنے زمانے کے اہم شاعر تھے اور شہر میں قابل احترام لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔

بہت پُر گو اور بہت مہمان نواز تھے ان کے گھر پر تقریباً روزانہ اہل ذوق کا جمگھٹا لگتا۔ وہ اپنے اشعار ترنم سے پڑھا کرتے تھے۔ آخری عمر میں اپنا کلام ترتیب دینے میں مصروف تھے کہ ملک الموت نے مہلت نہ دی اور 5 جون 1958ء کو فوت ہو گئے۔ان کی ایک حرفی ملاحظہ ہو:

ہور بی واللہ حسین ہیون کیا میں تینوں دل کٹھور لبھیا
دلِ زار نوں لگا ایں آزار دینے میرے سوا نہ تنوں کوئی ہور لبھیا
کیہڑی ضبط کر بیٹھاں جاگیر تیری' اے دلآ رام میں ای تنوں چور لبھیا

کہندا فارغ کہ گلشن دہر اندر اے شاہ زور! میں تنوں کمزور لبھیا

اردو ترجمہ: ''یوں تو اور بھی حسین موجود ہیں جانے کیوں اے سنگدل میں نے تجھے ہی منتخب کیا۔ میرے دل زار کو آزار دینے لگے ہو کیا تجھے میرے سوا اور نہیں ملا۔ میں تمہاری کون سی جاگیر پر قابض ہو گیا ہوں۔ اے دل آرام کیا تجھے میرے سوا کوئی اور چور نہیں ملا۔ فارغ کہتا ہے کہ گلشن دہر میں اے شاہ زور کیا میں ہی کمزور ملا ہوں۔''

3۔ ہندکو غزل

ہندکو میں غزل کا ابتدائی نمونہ محمد جی ونجیارا کے ہاں پایا جاتا ہے جو کہ موسیقی کا رسیا تھا اور نغمے الاپتا رہتا تھا۔ اس نے گانے کیلئے کئی غزلیں لکھیں۔ ان کی یہ غزل خاص طور پر قابل توجہ ہے:

یاری لانی اے سکھلی پر نبھانی اوکھی اے

آتش عشق والی لگے تا بجھانی اوکھی اے

جدید دور میں ہندکو غزل کا احیاء مضمر تاتاری، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، جوہر میر اور خاطر غزنوی نے کیا۔ علاوہ ازیں تاج سعید، محسن احسان، استاد غلام رسول گھائل، ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری، سعد اللہ ناز درانی، مقبول اعجاز اعجازی، جلیل احمد کمال، ناز سیٹھی، صابر حسین امداد، اورنگزیب غزنوی، حسام حُر اور دیگر بہت سے شعراء نے غزلیں لکھیں۔ پشاور کے علاوہ ہزارہ میں بھی کئی غزل گو شعراء نے مقبولیت حاصل کی جن میں آصف ثاقب، یحییٰ خالد، حیدر زمان حیدر، ارشاد شاکر اعوان، افتخار ظفر، جعفر سید، سلطان سکون، عبدالغفور ملک، عاصی رضوی، اشرف راہی، رحیم سلطان رحیم، حفیظ عاجز، پرواز تربیلوی، خالد خواجہ اور بشیر احمد سوز کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہندکو میں خالص غزلوں پر مبنی درج ذیل مجموعے چھپ چکے ہیں۔

سوچاں تے جگراتے	منیر حیدر	1996ء
کونجاں	خاطر غزنوی	1999ء
برگی چھاں	محمد زید	1999ء
ہندکو غزلاں دی سوغات	مرتبہ: اورنگزیب احمد غزنوی	2002ء

آخری کتاب میں محمد جی ونجیارا سے لے کر یاسمین زیبی تک 136 شعراء کی غزلیں پیش کی گئی ہیں۔ آصف ثاقب اور یحییٰ خالد کی مرتب کردہ کتاب ''دکھ سنجھیالے'' (1983ء) میں بھی آصف ثاقب، ارشاد شاکر، افتخار ظفر، جعفر سید، سلطان

سکون، محمد فرید اور یحییٰ خالد کی غزلوں کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ فارغ بخاری کی مرتب کردہ کتاب ''نویاں راواں'' (1964ء) میں مختلف شعراء کے دیگر کلام کے علاوہ رضا ہمدانی، فارغ بخاری، جوہر میر، مختار علی نیر، سعید گیلانی، فہمید آتش، خادم ملک، اسماعیل اعوان، ناز درانی اور خالد خواجہ کی ایک سے زیادہ غزلیں شامل ہیں۔ ''سجرے پُھل'' مطبوعہ 1982ء میں آصف ثاقب، عبدالغفور ملک اور حیدر زمان حیدر جیسے شعراء کا منتخب کلام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی شعراء کے مجموعوں میں غزلیں شامل ہیں۔

4۔ شعری مجموعے

جدید دور میں غزل کے علاوہ آزاد نظم، نثری نظم، موضوعاتی نظمیں، چار بیتے، ہائیکو اور دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی گئی۔ اب تک جو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں ان میں سے چند اہم مجموعوں کی تفصیلات پیش ہیں:

- ☆ پرواز تربیلوی کا مجموعہ ''پُھل تے کنڈے'' (1984ء) غزلوں، موضوعاتی نظموں، گیتوں، دوہڑوں اور ماہیوں پر مشتمل ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ ''ککھ تے لکھ'' 2000ء میں شائع ہوا۔
- ☆ یحییٰ خالد کا مجموعہ ''پیار پہلیکھے'' (1986ء) نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔
- ☆ مقبول اعجاز اعجازی کے مجموعے ''تاراویرا'' (س۔ن) میں قطعات، موضوعاتی نظمیں، غزلیں اور حرفیاں پیش کی گئیں ہیں جبکہ ''بول ملنگا'' (1995ء) نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔
- ☆ محمد فرید کے مجموعے ''سنجھ سویل'' (1987ء) میں نظمیں، غزلیں، ''چٹے نقطے'' (1996ء) میں دو سی حرفیاں، دوبیتے اور ترِ ئگے (تین مصرعی چھوٹی نظم، جس کا تیسرا مصرع آدھا ہوتا ہے) اور ''چھپ نماشاں'' (1997ء) میں صوفیانہ کلام پیش کیا ہے۔
- ☆ تاج سعید کا مجموعہ ''لیکھ'' (1991ء) نظموں، غزلوں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔
- ☆ صابر حسین امداد کے مجموعے ''کھورے سچ'' (1992ء) میں نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جبکہ ''سچ دا زہر'' (1997ء) غزلوں، آزاد نظموں، مثلثوں اور قطعات پر مشتمل ہے۔
- ☆ ثریا حسام حُر کا مجموعہ ''تصویراں'' (1994ء) گیتوں، نظموں، غزلوں، ہائیکو اور ماہیوں پر مشتمل ہے۔
- ☆ پروفیسر بشیر احمد سوز کی کتاب ''چلکاں'' (2001ء) ہزارے کی منظوم تاریخ ہے، چھوٹی بحر کے اڑھائی

ہزار مصرعوں پر مشتمل اس مسلسل نظم کو مصنف نے ہزارے کی تاریخ کے کچھ اوراق قرار دیا ہے۔

☆ فارغ بخاری کی کتاب ''کالی ٹھپ'' (2003ء) میں غزلیں، آزاد نظمیں اور گیت پیش کئے گئے ہیں۔

☆ ناز سیٹھی کے مجموعے ''دل دے ہتھوں'' (2003ء) میں غزلیں، نظمیں اور گیت پیش کیے گئے ہیں۔

☆ شریف حسین شاہ کی کتاب ''ٹسکی معتبری'' (2001ء) میں شگفتہ اور طنزیہ قطعات پیش کئے گئے ہیں جن کے نیچے اردو نثر میں ان کا ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

☆ ''الارے'' فقیر حسین ساحر کا مجموعہ کلام ہے جو 1986ء میں منظر عام پر آیا۔

☆ ''سوچاں تے جگراتے'' منیر حیدر کا مجموعہ کلام ہے جو 1996ء میں شائع ہوا۔

☆ رضا ہمدانی کے مجموعے ''مٹھے ڈنگ'' اور ''تُرے تُرے'' کے نام سے، آصف ثاقب کا مجموعہ ''او ہلے خواب خیالاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ آصف ثاقب کی کتاب ''تارالوئی والا'' (2002ء) میں مختلف موضوعات کے حوالے سے الگ الگ ماہیے پیش کئے گئے ہیں۔

مرتب کردہ کتب میں ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان کا مرتبہ ''دیوان گھائل'' (1963ء) خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس میں ہندکو کے شاعر استاد غلام رسول گھائل کی سی حرفی، غزلیات، بارہ ماسہ اور متفرق شاعری کو یکجا کر کے شائع کیا گیا۔ استاد آغا محمد جوش کی منتخب حرفیاں، زیڈ آئی اطہر نے بھی مرتب کر کے ''مینا تے جام'' کے نام سے 1981ء میں شائع کرائیں جبکہ ظفر مہدی نے آغا محمد جوش کی تمام حرفیاں جمع کر کے ''مٹی دے بت'' کے نام سے 2001ء میں شائع کرائیں۔ حیدر زمان حیدر نے سائیں غلام دین کے صوفیانہ چار بیتے ''سوداگر اس بازار دا'' کے نام سے 1988ء میں شائع کرائے۔ رضا ہمدانی نے 1969ء میں سائیں احمد علی پشوری کا کلام ایڈٹ کر کے لوک ورثے کی طرف سے شائع کرایا جبکہ افضل پرویز نے ''کہندا سائیں'' (1979ء) کے نام سے سائیں احمد علی پشوری کا کلام ایڈٹ کر کے مفصل حالاتِ زندگی کے ساتھ پنجابی ادبی بورڈ، لاہور سے شائع کرایا۔ نسیم سحر کی مرتبہ کتاب ''کل تے اج'' (1985ء) میں جلیل احمد کمال کی حرفیوں، غزلوں، نظموں اور گیتوں کو یکجا کر کے شائع کیا گیا ہے۔ حیدر زمان حیدر کی کتاب ''مشال'' (1995ء) ہندکو چار بیتوں کے قدیم و جدید نمونوں پر مشتمل ہے۔

''حُر دا اقبال'' مطبوعہ 1998ء میں حسام حُر نے منتخب کلام اقبال کا ہندکو ترجمہ پیش کیا۔ ''ڈیفوڈل سی موتیے تک'' مطبوعہ 2003ء میں ملک ارشد حسین نے انگریزی کے 16 شعراء کے منتخب کلام کا منظوم ہندکو ترجمہ پیش کیا۔ ''اک خواب

ہمارا'' (1997ء) نامی کتاب میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کی مناسبت سے اردو، پشتو اور ہندکو (ہندکو صفحہ 155 تا 216) کے قومی گیت یکجا کر کے پیش کیے گئے ہیں۔

5۔ ہندکو نثر

ہندکو نثر کا آغاز روزنامہ ''انجام'' پشاور کے ہندکو صفحے سے ہوتا ہے جس میں جوہر میر کے پیش لفظ کے علاوہ رضا ہمدانی، فارغ بخاری، مختار علی نیرّ جہانگیر تبسم، خادم ملک اور آتش فہمید کے مضامین اور افسانے شائع ہوتے رہے۔ ہندکو میں خاکے، ناول، افسانے، سفرنامے، تاریخ، لسانیات اور دینی ادب کے حوالے سے جو پیش رفت ہوئی اس کا جائزہ پیش خدمت ہے:

5.1۔ افسانہ

افسانے کی ابتداء آتش فہمید (مرحوم) نے کی۔ ان کے افسانے ''انجام'' اور ''دیدہ ور'' میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ جہانگیر تبسم، نسیم جان، جلیل حشمی اور بعد میں یوسف عزیز زاہد نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ جدید دور میں خالد سہیل ملک، جواد، ناصر علی سید، صبا جاوید، ش شوکت، ارشد حسین، قدسیہ قدسی اور دیگر کئی افسانہ نگار سامنے آئے جنھوں نے روایتی رنگ کے علاوہ علامتی افسانے بھی لکھے۔

جہانگیر تبسم کے افسانوں کے مجموعے ''دُکھ سُکھ'' میں وہ حقیقی زندگی کے عکاس نظر آتے ہیں۔ جہانگیر تبسم نے فہمید آتش کے بعد افسانے لکھنے شروع کیے اور آخر تک یہ سلسلہ جاری رکھا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے مختلف اور متضاد پہلوؤں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی خرابیوں، گھریلو جھگڑوں، غلط رسموں اور انسانی نفسیات کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں ''دواتھرو''، ''روشندان'' اور ''انقلاب تے انصاف'' قابل ذکر ہیں۔

حسام حُر کے افسانوں کا مجموعہ ''نِکی جی گل'' 1992ء میں شائع ہوا جس میں 18 افسانے پیش کیے گئے ہیں۔

نسیم جان کی کتاب ''کوک'' (1993ء) میں گیارہ مکمل افسانے اور آخر میں کچھ مختصر افسانے شامل ہیں۔ یہ افسانے انھوں نے پہلے اردو میں لکھے تھے اور بعد میں ان کا ہندکو ترجمہ کر کے کتابی صورت میں شائع کرایا۔ نسیم جان کا موضوع انسان اور انسانی جذبات سے تعلق رکھتا ہے۔ ان میں محبت اور نفرت کے جذبات کی رنگارنگی کے حوالے سے منفی اور مثبت رویوں کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کے افسانوں میں ''ہنیر ے''، ''کوک''، ''سانجھے دکھ'' اور ''ٹانگے والا'' قابلِ ذکر ہیں۔

ہندکو افسانوں کی دنیا میں مستورات نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ثریا حسام حُر کے افسانوں کا مجموعہ ''دل دے دُکھ ہزار'' 1994ء میں چھپا جسمیں 9 افسانے شامل ہیں۔ قدسیہ قدسی کے افسانوں کا مجموعہ ''کنڈے کنڈے وادی'' 1995ء میں سامنے آیا جس میں 16 افسانے پیش کیے گئے ہیں۔

خالد سہیل کے افسانوں کے مجموعے ''اپنّا ویہڑہ اپنی کہانڑی'' (2003ء) میں خالص مقامی ریتوں، رسموں، تہذیبی قدروں اور زندگی کے مختلف رنگوں کی تصویریں ملتی ہیں۔ انھیں نئی نسل کا نمائندہ افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔

اورنگزیب غزنوی کی مرتب کردہ کتاب ''ہندکو افسانے'' (1992ء) میں مسز صبا جاوید، ش شوکت، نذیر بھٹی، ناصر علی سید، اورنگزیب حُر، حیدر زمان حیدر، اورنگزیب غزنوی، تنویر احمد خان، مسرت حسین زبیری، محمد ارشد امین، افتخار احمد تشنہ، سید معصوم شاہ ثاقب اور دیگر لوگوں کے تحریر کردہ افسانے پیش کئے گئے ہیں۔

5.2۔ ناول

حسام حُر کا ناول ''حق اللہ ھُو'' 1996ء میں شائع ہوا جو صوبہ سرحد کے حوالے سے محرم 1929ء سے محرم 1992ء تک کے تناظر میں لکھا گیا ہے اور جسے ہم تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہندکو میں اب تک صرف یہی ایک ناول لکھا گیا ہے۔

5.3۔ سفر نامہ

ہندکو میں ہمیں تین سفر نامے ملتے ہیں۔ پہلا سہیل انجم کا تھائی لینڈ کا سفر نامہ ''گوتم دے دیس'' (1995ء) ہے اس سفر نامے میں فاضل مصنف نے کھلی آنکھوں اور متجسس دل کے ساتھ تھائی لینڈ کے سفر کا احوال بیان کیا ہے اور وہاں کی عمارتوں، لوگوں، عقیدوں اور ثقافت کا بھر پور جائزہ پیش کیا ہے۔ دوسرا سفر نامہ ملک ارشد حسین کا ''راکا پوشی دی چھاں'' (1997ء) کے نام سے شائع ہوا جس میں شمالی علاقہ جات کی سیر کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ ''مبارک سفر حج'' 2002ء حیدر زمان حیدر کی تخلیق ہے جس میں حجاز مقدس کے سفر کا احوال تمام تر جزئیات اور عربی دعاؤں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

5.4۔ خاکہ نگاری

حسام حُر کے تحریر کردہ خاکوں کا مجموعہ ''ہسدے وسدے لوک'' (1993ء) میں منظر عام پر آیا۔ شخصی خاکوں کی اس کتاب میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی، محسن احسان، خاطر غزنوی، مختار علی نیر، ڈاکٹر اعجاز راہی، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان، حیدر

زمان حیدر، ساحر مصطفائی، صابر حسین امداد، ش شوکت، زیڈ آئی اطہر، نذیر تبسم اور ناصر علی سید کے خاکے پیش کئے گئے ہیں۔

5.5- تحقیق

ہندکو زبان و ادب کے بارے میں تحقیق کی کتابیں ہندکو کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی لکھی گئیں۔ ''تاریخ زبان ہندکو'' (1977ء) مختار علی نیر کی تصنیف ہے جو اردو میں لکھی گئی ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''عظیم گندھارا اور ہندکو زبان'' کے نام سے 1996ء میں شائع ہوئی۔ خاطر غزنوی کی کتاب ''اردو زبان کا ماخذ ہندکو'' (2003ء) مقتدرہ قومی زبان کی طرف سے شائع ہوئی۔ 438 صفحات کی اس کتاب میں خاطر غزنوی نے موضوع کے حوالے سے مفصل معلومات فراہم کرنے کے علاوہ ہندکو کے نوکلاسیکل دور تک کے شاعروں کا کلام بھی دیا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ''ہندکو نامہ'' (2002ء) اپنے مندرجات کے اعتبار سے ہندکو زبان کی کلاسیفائڈ لغت ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت ہندکو الفاظ ان کے معانی اور وضاحتیں دی گئی ہیں۔ ''ہندکو زبان و ادب کا تاریخی جائزہ'' (1997ء) میں ش شوکت نے ہندکو زبان اور اس میں تخلیق ہونے والے ادب کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان کی انگریزی کتاب "The phonology of the verbal phrase in Hindko" (1994ء) ہندکو صوتیات کے متعلق ہے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان نے اس موضوع پر لندن سے پی ایچ ڈی کی تھی اور یہ دراصل ان کے پی ایچ ڈی کا تھیسز ہے جس میں انھوں نے جدید لسانی قواعد کے مطابق ہندکو صوتیات کا جائزہ لیا ہے۔ سلطان سکون کی ''ہندکو اردو لغت'' 2002ء میں شائع ہوئی۔ بڑی تقطیع اور 285 صفحات پر مشتمل اس لغت میں اعراب کے علاوہ فرہنگِ عامرہ کی طرز پر تلفظ بھی دیا گیا ہے مثلاً پَیر (پَے۔ر)، پِیر (پی۔ر) وغیرہ، جس سے کسی لفظ کی اصل آواز تک رسائی مزید آسان ہو جاتی ہے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز قائداعظم یونیورسٹی اور سمر انسٹی ٹیوٹ آف لنگوئسٹکس کی جانب سے (1992ء) میں چھپنے والی کتاب ''Sociolinguistic Survey of Northern Pakistan Vol. 3'' میں ہندکو، گوجری کا مفصل تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

ہندکو میں لکھی گئی مختار علی نیر کی کتاب ''ہندکو نثر دی کہانڑیں'' پہلی بار 1965ء میں اور دوسری بار ترمیم و اضافے کے ساتھ 1992ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ہندکو کے حروفِ تہجی مختلف آوازوں والے حروف کی املا اور رسم الخط کے حوالے سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ ان کی ایک کتاب ''ہندکو قواعد'' مطبوعہ 1976ء میں ہندکو گرامر سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

''ہندکو رسم الخط ایک بحث'' (1978ء) صابر حسین امداد کا مختصر سا کتابچہ ہے جب کہ ان کا ایک اور کتابچہ ''ہندکو

رسم الخط تے اس دا ماخذ'' کے نام سے 1978 میں شائع ہوا۔ حسام حُر کے ''ہندکو قاعدہ'' کے علاوہ 1994ء میں مجاہد اکبر کا ''ہندکو قاعدہ'' شائع ہوا۔

5.6۔ دینی کتب

اورنگزیب احمد غزنوی کی کتاب ''رسولِ اعظمؐ'' (1995ء) سیرت کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ حسام حُر کی کتاب ''حدیثاں پاک رسولؐ دیاں'' (1996ء) میں 42 حدیثیں مع ہندکو ترجمہ پیش کی گئی ہیں جب کہ سید شجاعت گیلانی کی کتاب ''ہیں توں مسلمان'' (1999ء) دینی واخلاقی مضامین اور اسلامی احکامات پر مبنی ہے۔ عبدالغفور ملک کی کتاب ''نتریاں گلاں'' (1998ء) میں 43، احادیثِ مبارکہ کا منظوم ہندکو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ حیدر زمان حیدر کے کیئے ہوئے قرآن پاک کے ہندکو ترجمے کے مسودے پر مولانا محمد یعقوب القاسمی، حافظ سعید قادری، اورنگ زیب احمد غزنوی، محمد امجد امین، محمد ارشد امین اور یاسمین زیبی کی طرف سے نظر ثانی کا کام مکمل ہو چکا ہے تاہم یہ ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکا۔

5.7۔ متفرق کتب

''ہندکو چار بیتے دے رنگو رنگ نذارے'' (1980ء) حیدر زمان حیدر کی کتاب ہے جس میں ہندکو چار بیتہ کی تاریخ اور نمونے دیئے گئے ہیں۔ ''لفظاں دی چھاں'' (1996ء) اورنگ زیب احمد غزنوی کی مرتب کردہ کتاب ہے جس میں صابر حسین امدادی کی شخصیت اور فن کے بارے میں لکھے گئے مختلف قلمکاروں کے مضامین اور نظمیں شائع کی گئی ہیں۔ ''ٹُٹ گئیاں زنجیراں'' (1996ء) بھی اورنگزیب احمد غزنوی کی تحریر کردہ کتاب ہے جس میں صوبہ سرحد میں تحریک آزادی کے حوالے سے پیش آمدہ واقعات اور مختلف شخصیات کا تعارف کرایا گیا ہے۔

(نوٹ: ہندکو کے یونٹوں کی تیاری کے سلسلے میں شعبے کو ڈاکٹر اعجاز راہی اور اورنگزیب احمد غزنوی کی معاونت بھی حاصل رہی)

6۔ خود آزمائی

1۔ سکھوں اور انگریزوں کے دور کی ہندکو شاعری پر روشنی ڈالیں۔
2۔ ہندکو کے نوکلاسیکی دور کے شعراء کا تعارف کرائیے۔
3۔ ہندکو کے جدید ادب کے حوالے سے کوئی سے تین شعراء کی خدمات پر مفصل نوٹ لکھیے۔
4۔ ہندکو افسانہ، ناول اور سفرنامہ کے ارتقائی سفر کا احوال اپنے لفظوں میں لکھیں۔
5۔ ہندکو میں لکھی گئی تحقیقی اور دینی کتب پر ایک مفصل نوٹ لکھئے۔

(نوٹ: ہندکو یونٹوں کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا۔)

1۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ از ڈاکٹر عین الحق فرید کوٹی، لاہور 1979ء

2. Linguistic Survey of India G.A.Grierson Vol-8 page 111.

3.Indain Literature by Dr. Nagendra-Lakshmi Narain Aggarwal-Agra- 1959 page 5-23

4. Hindko in Kohat and Peshawar by C.Shacale page 86.

5. Guide to Taxila- Sir John Marshall- 3rd Edition-Delhi - 1936 pp-73

6. The legends of the Punjab by R.C Temple Vol-1 Language Department Punjab, Patiala 1988 pp 1-65

7۔ تاریخ ہزارہ، محمد ارشاد خان، احباب پبلشرز، پشاور، 1976ء، صفحہ 24

8۔ تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی، ترجمہ ڈاکٹر محمد بشیر حسین، مرکزی اردو بورڈ لاہور، صفحہ 934

9۔ تذکرہ علماء ہائے سرحد، مولانا سید امیر شاہ قادری گیلانی، عظیم پبلشنگ ہاؤس، پشاور، صفحہ 45

10۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، چودھویں جلد، پنجاب یونیورسٹی، 1971ء، صفحہ 210۔256

11۔ اردو زبان کا ماخذ ہندکو، پروفیسر خاطر غزنوی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 2003

یونٹ نمبر 8

توروالی زبان وادب

تحریر : انعام اللہ خان
نظرثانی : محمد پرویش شاہین

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف

مطالعاتی رہنما کے اس یونٹ کا تعلق توروالی زبان وادب سے ہے۔ توروالی ایک آریائی زبان ہے جو اس وقت ضلع سوات کی تحصیل بحرین میں بولی جاتی ہے۔ دیگر دردزبانوں کی طرح توروالی بھی کافی حد تک بیرونی اثرات سے محفوظ رہی، یہی وجہ ہے کہ بنیادی توروالی الفاظ میں سنسکرت کے الفاظ کی ایک بڑی تعداد اب بھی موجود ہے۔ ان میں سے سینکڑوں الفاظ اپنی اصل ماہیئت میں مستعمل ہیں اور بہت سے معمولی صوتی تغیر کے ساتھ استعمال ہو رہے ہیں۔ اس یونٹ میں آپ توروالی زبان کے آغاز وارتقاء کے بارے میں ماہرین السنہ کی آراء کے علاوہ اس زبان کے لہجوں، حروف تہجی، رسم الخط، بنیادی قواعد اور اردو کے ساتھ لسانی اشتراک کے بارے میں پڑھیں گے نیز اس زبان کے ادب کا مطالعہ بھی اس یونٹ میں شامل ہے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- توروالی زبان کی تاریخ اور لسانی خصوصیات پر بحث کر سکیں۔

2- توروالی اور اردو کے باہمی تعلق سے شناسائی حاصل کر کے، ان زبانوں کے مشترک عناصر کی نشاندہی کر سکیں۔

3- توروالی کے بنیادی قواعد جان سکیں اور ان کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے جملے بنا سکیں۔

4- توروالی ادب کی مجموعی تاریخ سے آگاہ ہو سکیں اور اسے حیطۂ تحریر میں لا سکیں۔

1- توروالیؑ زبان

توروالی زبان ضلع سوات کی تحصیل بحرین میں بولی جاتی ہے۔اس کے بولنے والوں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔جس میں سے آدھی سے زیادہ آبادی پاکستان کے مختلف شہروں مثلاً کراچی، حیدرآباد، کوئٹہ اور راولپنڈی میں مقیم ہے۔ یہ زبان شمالی پاکستان کی ان قدیم چھوٹی زبانوں میں سے ایک ہے جوٹرنر کے مطابق ''اگر چہ سیاسی طور پر اتنی اہمیت کی حامل نہیں لیکن لسانی طور پر زبردست اہمیت کی حامل ہے۔''(ح-1)

1.1- وجہ تسمیہ

توروالی بولنے والے اپنے آپ کو''کوستئی'' (کوہستانی) کہتے ہیں اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ بولتے ہیں وہ کتابوں میں ''توروالی'' کہلاتی ہے۔دراصل توروالی بولنے والوں کو یہ نام ان کے پڑوس میں دوسری زبانیں بولنے والوں نے دیا ہے۔خصوصاً کالامی کوہستانی اور انڈس کوہستانی بولنے والے تحصیل بحرین کے کوہستانیوں کو توروالی کہتے ہیں۔ ان کے مطابق علاقہ بحرین (جس کا نام والئی سوات سے قبل بھونال یا پشتو نام برانیال تھا) کا صدر مقام بحرین کے شمال میں توروال نامی گاؤں تھا، جو اب بھی موجود ہے چنانچہ اس گاؤں کی مناسبت سے انہیں ''توروالی'' کہا جانے لگا۔بعض مقامی روایات کے مطابق حضرت میاں قاسم بابا رحمۃ اللہ علیہ (پیر باباؒ کے نواسے) جب پہلی بار اس علاقے میں لوگوں کو مشرف بہ اسلام کرنے آئے تو سب قبائل اسلام لے آئے سوائے ایک چھوٹے قبیلے کے، واپسی میں کسی کے پوچھنے پر انہوں نے پشتو میں بتایا کہ ''سب لوگ اسلام لے آئے ہیں لیکن تھوڑی سی ''توروالے'' (یعنی کالک) رہ گئی ہے''۔اس وجہ سے علاقے کا پشتو نام توروالے یا توروال پڑ گیا۔ بعد ازاں مدین سے کالام کی حدود تک کا سارا علاقہ توروال کہلایا اور یہاں کی کوہستانی زبان توروالی کہلائی۔

1.2- پس منظر

توروالی گرامر اور صوتیات پر مستشرقین نے خاصا کام کیا ہے مگر زبان کی تاریخ پر کام کم ہوا ہے۔سٹرینڈ کے مطابق درداور نورستانی زبانوں کے بارے میں ہمارا علم یقیناً کمزور ہے۔(ح-2) مکمل اور مستند تاریخ کے فقدان پر پرویش شاہین کا کہنا ہے کہ سب سے بڑا مسئلہ ان زبانوں کا یہ ہے کہ ان کی جڑ کیا ہے، یہ کب سے بولی جارہی ہیں، کس کی بیٹیاں ہیں کس کی بہنیں ہیں۔(ح-3) بہر حال جو کچھ تھوڑا بہت کام ہوا ہے اس کے لئے بھی ہمیں مستشرقین کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

1.3- دردستان اوراس کی زبانیں

کشمیراور گلگت سے لے کر انڈس کوہستان (ضلع کوہستان، ہزارہ ڈویژن) اور سوات ودیر کوہستان کا علاقہ، بشمول چترال اور ملحقہ افغانی علاقہ کا فرستان (موجودہ نورستان) سب کا سب کسی زمانے میں ''دردستان'' کہلاتا تھا۔ ماہرین لسانیات نے شمالی پاکستان میں بولی جانے والی مختلف چھوٹی بڑی زبانوں کو ایک مجموعی نام ''درد'' یا ''دردی'' دیا ہے۔ ایل۔ آر۔ ٹرنر کی مشہور ہند آریائی زبانوں کی لغت میں ''درد'' گروہ کے ساتھ تیراہی، پَشّئی، شماشتی، ٹینگلامی، وَٹپوری، کٹارقلا، گوارباتی، کلاشہ، کھوار، گاروی، توروالی، کندیا، چیلیس، گاوُرو، پھلورا اور شنا زبانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ (ح-4) ان میں سے بعض زبانیں لغت اور گرامر کے لحاظ سے نسبتاً ایک دوسرے کے قریب تر ہیں۔ اس کے علاوہ ان زبانوں میں 3 تا 6 ایسی آوازیں ہیں جو پشتو/اردو میں نہیں ہیں۔

1.4- کیا دردزبانیں ہندآریائی زبانیں ہیں؟

بعض ماہرین لسانیات کے مطابق دردزبانیں ہند آریائی نہیں بلکہ ہندی زبانوں (جو کہ زیادہ تر مشرق میں واقع ہیں) اور ایرانی زبانوں کے بین بین زبانوں کا ایک مجموعہ ہیں۔ گریئرسن کی ترتیب کے مطابق کوہستانی زبانیں ایک طرف شِنا اور کشمیری اور دوسری طرف کھوار اور نورستانی زبانوں کو آپس میں ملاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''ان کے بعض پہلو ہند آریائی ہیں اور بعض پہلو ایرانی زبانوں سے ملتے جلتے ہیں۔'' (ح-5) اس طرح کے تحفظات کارل جیٹمار کو بھی ہیں۔ ان کے مطابق درد لوگوں کی مماثلت کئی طرح سے مغربی ایشیاء کے پہاڑی لوگوں اور خاص طور پر کاکیشیا کے مکینوں سے ہے۔ (ح-6)

لیکن ناروے کے پروفیسر مارگنسٹرین کی تائید کرتے ہوئے بہت سے دوسرے یورپی محققین مثلاً جیرالڈ فسمین، (ح-7) رُتھ لیلا شمٹ (ح-8) اور رچرڈ سٹرینڈ (ح-9) دردزبانوں کو قطعیت کے ساتھ ہند آریائی زبانیں مانتے ہیں۔

1.5- توروالی ایک دردزبان ہے

گریئرسن کا کہنا ہے کہ یقیناً توروالی زبان، زبانوں کے ''درد'' خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں تانیث کی بناوٹ اور افعال کی مختلف شکلیں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ یہ کشمیری سے منسلک ہے۔ (ح-10) توروالی ان زبانوں میں سے ایک ہے جنہیں مقامی طور پر ''کوہستانی'' کہا جاتا ہے۔ مثلاً انڈس کوہستان، سوات کوہستان اور دیر کوہستان کی زبانیں۔ یہ لغت اور گرامر میں کشمیری اور شنا سے قریب تر ہیں بہ نسبت پڑوسی کھوار یا چترالی زبان کے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ کھوار پر فارسی

کا اثر زیادہ ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ توروالی دوسری کوہستانی زبانوں کی طرح کھوار سے زیادہ نورستانی زبانوں کے قریب ہے، جو چترال کے مغرب کی طرف افغانستان میں بولی جاتی ہیں۔ جو مرکزی حیثیت کوہستانی زبانوں کو درد زبانوں میں حاصل ہے۔ وہی توروالی کو کوہستانی زبانوں میں حاصل ہے یعنی جغرافیائی لحاظ سے توروالی تینوں ''کوہستانیوں'' کی درمیانی کوہستانی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مستشرق اسے ''اصل درد'' بھی کہتے ہیں۔ سٹرینڈ نے توروالی کا رشتہ ہند آریائی زبانوں کے خاندان کے ساتھ اس طرح جوڑا ہے۔(ح-11)
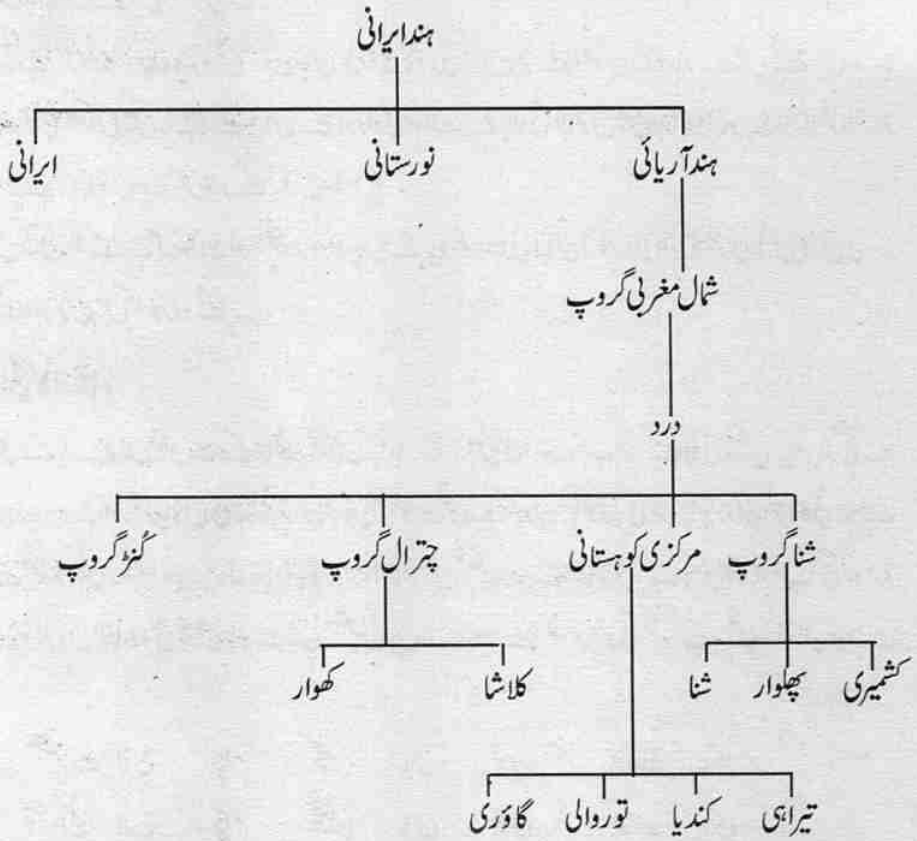
1.6- جغرافیائی پس منظر

درد زبان بولنے والے وہ قدیم آریا ہیں جو ہندوکش کے دامن میں مشرق تا مغرب آباد ہیں۔ بقول ڈاکٹر شہید اللہ، پاکستان کا شمال مغربی سرحد کا علاقہ دردستان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مشرق سے مغرب تک گلگت اور کشمیر، اباسین کوہستان اور سوات کوہستان، چترال اور کافرستان تک پھیلا ہوا ہے سنسکرت میں یہ ''دردا'' یا ''دَرَدْ'' اور یونانیوں میں

''دردارائے'' یا ''دَرَدائی'' کہلاتا ہے۔(ح-12)

توروالی زبان ضلع سوات کی تحصیل بحرین میں مدین سے اوپر دو وادیوں میں بولی جاتی ہے۔ایک وادی بحرین جو دریائے سوات کے ساتھ ہے اور دوسری مدین سے مشرق کی طرف وادی چیل جس کے درمیان ''اوولال'' ندی بہتی ہے۔یہ دونوں وادیاں مدین کے مقام پر آپس میں ملتی ہیں۔ان کے جنوب میں پشتو بولنے والے یوسف زئی اور شمال میں کالام کوہستانی (گاوری یا گاروی) آباد ہیں۔میک مے ہن کے مطابق ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ توروالی زبان بولنے والے ہی سوات کے اصل قدیم باشندے ہیں۔'' (ح-13)

اپنی کتاب ''ٹرائبز آف ہندوکش'' میں جان بڈلف گاوری زبان بولنے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔''یہ پنجکوڑہ وادی کے بالائی حصوں میں رہتے تھے جہاں سے وہ وادی سوات کے بالائی علاقوں میں دراندازہوئے اور اوشو، اتروڑ اور کالام کے تین بڑے دیہاتوں پر قابض ہو گئے۔(ح-14)

یہ سوال تحقیق طلب ہے کہ سوات اور پنجکوڑہ وادیوں کے یہ دو کوہستانی قبائل (توروالی اور گاوری) کن عوامل کی وجہ سے سکڑ کر نسبتاً تنگ وادیوں میں محصور ہو گئے۔

1.7- توروالی کا ارتقاء

توروالی کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی، لیکن یہ امر واضح ہے کہ یہ ایک آریائی زبان ہے اور آریاؤں کی قدیم ترین زبان سنسکرت تھی۔دیگر درد زبانوں کی طرح توروالی بھی کافی حد تک بیرونی اثرات سے محفوظ رہی۔یہی وجہ ہے کہ بنیادی توروالی الفاظ میں سنسکرت کے الفاظ کی ایک بڑی تعداد اب بھی موجود ہے۔ان میں سے سینکڑوں الفاظ اپنی اصل ماہیت میں مستعمل ہیں اور بہت سے معمولی صوتی تغیر کے ساتھ استعمال ہو رہے ہیں۔مثلاً

سنسکرت:	لاج	چام	پھین	ماس	لون	بھات	دِھی
توروالی:	لاج	چام	پھین	ماس	لون	بھات	دِھی
اردو:	شرم	چمڑا	جھاگ	گوشت	نمک	چاول	بیٹی

سنسکرت:	کاگا	گھوم	دیدی	ویواہ	پُشپ	سپتم	اشٹم	نودم	سگھم
توروالی:	کاگ	گھومُو	دیدے	بےواہ	پُشو	ستم	اُٹھم	نومُوم	سگھا
اردو:	کوا	گندم	بڑی بہن	شادی	پھول	ساتواں	آٹھواں	نواں	آسمان

بارہویں اور تیرہویں صدی تک توروالی مختلف ارتقائی مراحل سے گزر کر ایرانی زبانوں یعنی فارسی اور پشتو سے متاثر ہونے لگی۔ توروالی پر فارسی کے جو اثرات پڑے ہیں وہ پشتو ہی کے ذریعے پڑے ہیں۔ میک مے ہن کے مطابق "وادی سوات میں وارد ہونے کے بعد پشتون قبائل کا سامنا یہاں کے اصل باشندوں سے ہوا جو کہ درد توروالی تھے۔" (ح-15) اس وقت سے لے کر آج تک پشتو توروالی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ صدیوں کے باہمی اختلاط کے نتیجے میں مذہب، تعلیم، تجارت اور سیاست کے راستے بہت سے پشتو الفاظ توروالی کا حصہ بنے اور بن رہے ہیں۔ توروالی میں غالباً یہی ایرانی عنصر ہے جس کو دیکھتے ہوئے گریئرسن کو بھی جس نے توروالی گرامر اور صوتیات پر سب سے زیادہ کام کیا ہے، توروالی کو ہند آریائی زمرے میں شمار کرنے میں تردد رہا اور کہنا پڑا کہ اس میں ہندی اور ایرانی آثار برابر ہیں۔ (ح-16) لیکن بنیادی طور پر توروالی ایک آریائی زبان ہونے کی وجہ سے پشتو کی نسبت اردو کے زیادہ قریب رہی۔ مختلف ادوار میں اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہے ایک اندازے کے مطابق توروالی لغت میں شامل آدھے الفاظ ہندی اور سنسکرت کے ہیں یا ان سے ماخوذ ہیں اور باقی پشتو، فارسی، عربی اور انگریزی سے مستعار ہیں۔ توروالی علاقہ ایک سیاحتی علاقہ ہونے کی وجہ سے بھی دیگر زبانوں کے اثرات قبول کرتا رہا ہے۔

1.8۔ توروالی اور دیگر کوہستانی لہجے

سوات، دیر اور انڈس کوہستان کی تینوں زبانیں باقی درد زبانوں کی نسبت توروالی سے زیادہ مشابہت رکھتی ہیں۔ لیکن ان میں سے لغوی مماثلت توروالی اور گاؤری کے درمیان زیادہ ہے۔ ان زبانوں کی نہ صرف لغت بلکہ گرامر بھی بڑی حد تک مشترک ہے۔ اگر چہ دونوں زبانوں کا لہجہ ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہے کہ ایک عام توروالی اور گاوری آپس میں پشتو میں بات کرتے ہیں لیکن غور سے سننے پر زبان قابل فہم ہو جاتی ہے۔ مغربی ماہرین نے ان دونوں زبانوں میں 44% مماثلت بتائی ہے لیکن مقامی تعلیم یافتہ افراد کے مطابق یہ مماثلت 65% کے قریب ہے۔ کیلون ریخ نے 210 الفاظ کو معیار بنا کر توروالی اور گاوری کے ذیلی لہجوں کی لغوی مماثلت اس جدول سے ظاہر کی ہے۔ (ح-17)

	بحرین توروالی	چیل توروالی	دشوا کوہستانی
چیل توروالی	89		
دشوا کوہستانی	47	45	
کالامی کوہستانی	44	44	77

44 43 77 93 اُشوکوہستانی

44 43 80 91 88 تھل کوہستانی

43 43 75 91 90 88 لاموتی کوہستانی

43 43 75 75 78 75 75 راجکوٹی کوہستانی

44 44 68 69 69 69 70 73 کلکوٹی کوہستانی

چونکہ ان میں کالام اُشو، تھل اور لامُوتی لہجہ توروالی، راجکوٹی اور کلکوٹی لہجوں کی نسبت زیادہ مماثلت رکھتا ہے اس لئے دراصل یہ چار بڑے لہجے بن جاتے ہیں، جن کی باہمی لغوی مشابہت ہم یوں دیکھ سکتے ہیں۔

توروالی گروہ

67 کالامی گروہ

43 76 راجکوٹی گروہ

44 69 73 کلکوٹی گروہ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالام کوہستانی اور توروالی کوہستانی لہجوں میں جو مماثلت ہے تقریباً وہی کلکوٹی اور کالامی لہجوں میں ہے۔ واضح ہو کہ توروالی اور کالامی کوہستانی سوات کوہستان جبکہ راجکوٹی اور کلکوٹی کوہستانی دیرکوہستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مندرجہ ذیل جدول سے ہم ان چاروں لہجوں کا لغوی اور صوتی موازنہ کر سکتے ہیں۔

اردو:	منہ	کان	زبان	اُنگلی	سورج	چاند	ستارے	پتھر	باپ	ماں
توروالی:	مُو	کان	جِب	اُنگی	سی	یُن	تا	باٹ	باپ	ییئ
کالامی:	مکھے	کیان	جِب	اُنگیر	سِیر	یسون	تار	بٹھ	بوپ	ییَ
راجکوٹی:	مُکھ	کن	جِب	اُنگیر	سِر	یَن	تار	بَٹ	بَب	یَے
کلکوٹی	مُکھ	گن	جِب	انگر	سِر	یُون	تار	باٹ	بوب	یے

الف) چیل توروالی

رینچ کے جدول کے مطابق بحرین توروالی اور چیل توروالی کے درمیان 89% مماثلت ہے۔ چیل توروالی کا لہجہ نسبتاً سخت ہے لیکن لغوی فرق کم ہے۔ دراصل چیل وادی اور بحرین وادی کے درمیان مدین کا علاقہ آتا ہے جہاں پشتو بولی جاتی

ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ چیل توروالی میں پشتو کے مستعار الفاظ نسبتاً زیادہ ہیں۔ دونوں وادیوں کے کوہستانی، توروالی کوہستانی میں بات کرتے ہیں لیکن لہجے سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ گریئرسن نے اپنی کتاب ''Torwali, An account of a Dard Language of the Swat Kohistan'' (ح-18) میں جن تین توروالی کہانیوں کا تجزیہ کیا ہے وہ سر آرل سٹین نے وادی بحرین میں ریکارڈ کی تھیں جبکہ ''لنگوسٹک سروے'' میں درج توروالی کہانی اور گرامر کا خاکہ چیل توروالی لہجے میں ہے۔

ب) اوشوجو

چیل کی وادی میں چند گاؤں ایسے ہیں جہاں توروالی کے علاوہ اوشوجو بھی بولی جاتی ہے۔ ابھی تک مستشرقین اسے توروالی ہی کا ایک لہجہ خیال کرتے تھے لیکن حال ہی میں لنکن کیسر نے پہلی بار دنیا سے اس کا تعارف ایک الگ بولی کے طور پر کرایا ہے۔ اس بولی کے چاروں طرف توروالی بولی جاتی ہے اور اس کے بولنے والے توروالی روانی سے بول سکتے ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ دراصل مشرقی پہاڑوں کے دوسری طرف بولی جانے والی ''کولی شِنا'' اور مقامی توروالی کا امتزاج ہے۔ ساندرا ڈیکر کے بنائے ہوئے جدول کے مطابق اوشوجو اور توروالی 35% مشابہ ہیں جبکہ اوشوجو اور ''کولی شِنا'' میں 50% مماثلت پائی جاتی ہے۔ (ح-20)

1.9- حروف تہجی اور رسم الخط کی مختصر تاریخ

جان بڈلف (1880ء) کے بعد کئی ماہرین لسانیات نے توروالی گرامر پر کام کیا اور ان مخصوص آوازوں کی شناخت کی جو کم و بیش دوسری دردزبانوں میں بھی تھیں۔ گریئرسن (1929ء) نے پہلی بار توروالی کی پانچ مخصوص آوازوں کی نشاندہی ان کے متبادل رومن حروف کے ساتھ کی۔ لیکن ان کا کام انگریزی میں ہے اور ان کی لکھی ہوئی توروالی رومن حروف میں ہے جبکہ مقامی طور پر توروالی ایک غیر تحریری زبان رہی، جہاں لکھنے کی کوشش ہوئی وہاں اصل آوازوں کی بجائے ان کے قریب تر پشتو یا اردو حروف لکھے گئے۔ پہلی بار عبدالحمید کریمی (1982ء) نے اپنی کتاب ''اردو کوہستانی بول چال'' میں تین نئی آوازوں کے لکھنے کی کوشش کی۔ مقامی نوجوان شاعر کریم جان مجاہد نے بھی جب کوہ بجن (1987ء) کے نام سے ایک ادبی پرچہ نکالا تو اس میں توروالی مضامین شامل کئے۔ بعد ازاں 1996ء میں مقامی تعلیم یافتہ توروالی نوجوانوں کی ثقافتی تنظیم ''کوہستان کلچرل سوسائٹی'' قائم ہوئی جس نے توروالی حروف تہجی کے تعین کے لئے ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی نے توروالی زبان کو اردو رسم الخط میں لکھنے کا فیصلہ کیا اور مخصوص آوازوں کے لئے ماہرین کے مشوروں کی روشنی میں حروف تہجی مقرر کئے۔ اس

طرح توروالی حروف تہجی میں اردو کے تقریباً سب اور پشتو کی ایک مخصوص آواز ''ح'' شامل ہے۔ باقی پانچ مخصوص توروالی حروف یہ ہیں۔

توروالی حروف	اَ	چ̣	ځ	ژ̣	ش̣
قریب ترین اردو آواز:	اے	چ	ج	ژ	ش
آئی۔پی۔اے حروف:	æ	ç̣	j̣	ẓ	ṣ

راقم الحروف کے زیر تدوین پہلی ''توروالی، اردو، انگریزی لغت'' میں بھی یہی حروف استعمال کئے جا رہے ہیں جو تقریباً ساڑے تین سو صفحات پر مشتمل آٹھ ہزار سے زیادہ الفاظ کی ہوگی۔ اس کے لئے ''سمر انسٹی ٹیوٹ آف لنگوسٹکس'' کا تیار کردہ کمپیوٹر سافٹ ویئر ''شوباکس'' استعمال کیا جارہا ہے، جو کہ ایک جدید لسانیاتی کمپیوٹر پروگرام ہے۔

2- چند بنیادی قواعد

مصدر بنانے کا طریقہ

توروالی مصدر کی علامت یہ ہے کہ فعل کے آخر میں 'وٗ' یا 'ووَ' آتا ہے۔ عموماً فعل مجہول کے آخر میں 'وٗ' اور فعل متعدی کے آخر میں 'ووَ' آتا ہے جیسے مصدر 'پشوٗ' (دیکھنا) سے 'پشووَ' (دِکھانا) مثلاً

فعل مجہول		فعل متعدی	
توروالی	اردو	توروالی	اردو
پوٗ	پینا	دھووَ	دھونا
بوٗ	دیکھنا	کھووَ	کھانا
اُشو	اُٹھنا	مووَ	مارڈالنا
ہوبوٗ	سونا	لھووَ	پہننا
لیگوٗ	لکھنا	جَنووَ	سمجھانا
بھیوٗ	ڈرنا	بھَیووَ	ڈرانا

ضمائر

	متکلم		حاضر		غائب	
	واحد	جمع	واحد	جمع	واحد	جمع
حالتِ مفعولی:	آ (میں)	مھو(ہم)	تُو(تو)	تھو(تم)	سے(وہ)	سے(وہ)
حلتِ فاعلی:	ماَ (میں نے)	مھوے(ہم نے)	تاَ(تونے)	تھوے(تم نے)	تی (اُس نے)	تھَے(اُنہوں نے)
حالت مفعولی:	مھاَ (مجھے)	مھو(ہمیں)	تھاَ(تجھے)	تھو(تمہیں)	تیں(اُسے)	تھاَ (اُنہیں)
حلتِ اضافی:	مھی (میرا)	مُھن (ہمارا)	چھی(تیرا)	تُھن (تمہارا)	تِسی (اُس کا)	تھین (اُن کا)

'ہے' (مذکر) کیلئے تھُواور (مونث) کیلئے ''چھی'' استعمال کیا جاتا ہے۔اسی طرح 'تھا' کیلئے ''اَشوُ'' اور 'تھی' کیلئے ''اُشی'' استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ''پوشیرے تھو'' (لڑکا گھر میں ہے)، ''سیراَن شیرے چھی'' (لڑکی گھر میں ہے) اسی طرح ''مھی بھا شیرمی آشوُ'' (میرا بھائی گھر میں تھا)، ''مھی شوُشیرمی اشی'' (میری بہن گھر میں تھی)۔

فعلِ حال مطلق

صیغہ واحد مذکر بنانے کیلئے فاعل کے بعد فعل کیساتھ مصدر کی علامت ہٹا کر اس کی جگہ 'ادوُ' لگایا جاتا ہے جیسے ''کھوؤ'' (کھانا) مصدر سے ''کھادُوُ'' لگانے سے صیغہ واحد مذکر بن جاتا ہے اور 'اجی' لگانے سے صیغہ واحد مونث بن جاتا ہے جیسے ''کھوؤ'' مصدر سے واحد مونث ''کھاجی'' بن جائے گی۔ جمع کا صیغہ بنانے کے لئے مذکر و مونث دونوں میں مصدر کا ''ؤ'' یا ''وؤ'' ہٹا کر اس کی جگہ ''ادی'' لگایا جاتا ہے جیسے کھانا مصدر سے صیغہ جمع مذکر و مونث ''کھادی'' بن جاتا ہے۔

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
وہ کھاتا ہے	سے کھادوُ	وہ کھاتے ہیں	سے کھادی
تو کھاتا ہے	تو کھادوُ	تم کھاتے ہو	تھوکھادی
میں کھاتا ہوں	آ کھادوُ	ہم کھاتے ہیں	مھوکھادی
میں کھاتی ہوں	آ کھاجی	ہم کھاتی ہیں	مھوکھادی

فعلِ حال جاری

صیغہ واحد مذکر بنانے کے لئے مصدر کی علامت ''وٗ'' یا ''دوٗ'' ہٹا کر اس کی جگہ ''آ ییدُ وٗ'' لگایا جاتا ہے جیسے ''کھووٗ'' مصدر سے ''کھاییدُ وٗ'' اور صیغہ جمع مذکر اور مونث کے لئے ''آ ییدی'' لگایا جاتا ہے جیسے ''کھووٗ'' مصدر سے ''کھایدی''۔ اسی طرح صیغہ واحد مونث کے لئے ''آ یے جی'' لگایا جاتا ہے۔

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
وہ کھا رہا ہے	سے کھایےدُو	وہ کھا رہے ہیں	سے کھایےدی
تو کھا رہا ہے	تو کھایےدُو	تم کھا رہے ہو	تھوکھایےدی
میں کھا رہا ہوں	آ کھایےدُو	ہم کھا رہے ہیں	مھوکھایےدی
میں کھا رہی ہوں	آ کھایے جی	ہم کھا رہی ہیں	مھوکھایےدی

فعلِ ماضی قریب

فعلِ ماضی قریب بنانے کیلئے مصدر کی علامت ہٹائے بغیر ''دوٗ'' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ توروالی میں ضمیر واحد غائب ''سے'' صیغہ ماضی اور مستقبل میں ''تی'' میں بدل دیا جاتا ہے۔ مثلاً

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
وہ کھا چکا ہے	تی کھووَدوٗ	وہ کھا چکے ہیں	تھئے کھووَدُو
تو کھا چکا ہے	تأ کھووَدوٗ	تم کھا چکے ہو	تھوئے کھووَدُو
میں کھا چکا ہوں	مأ کھووَدوٗ	ہم کھا چکے ہیں	مھوئے کھووَدُو

فاعل کیلئے یہاں مذکر یا مونث کی صورت میں کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ مفعول اگر مونث ہو تو مصدر کی علامت ہٹا کر ''یجی'' کا اِضافہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً 'وہ روٹی کھا چکا ہے' ''تی گیل کھیٔ جی'' 'میں روٹی کھا چکا ہوں' ''مأ گیل کھیٔ جی'' وغیرہ۔

ماضی مطلق

ماضی مطلق بنانے کیلئے فاعل اور مصدر کی علامت سمیت فعل لگایا جاتا ہے۔ البتہ مفعول اگر مونث ہو تو مصدر کی علامت ہٹا کر ''لی'' کا اِضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے 'اُس نے تختی لکھی' کے لئے ''تی چیویل لیکی'' بنتا ہے۔ مثلاً

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
اُس نے کھایا	تی کھوؤ	اُنہوں نے کھایا	تھیئے کھوؤ
تو نے کھایا	تاَ کھوؤ	تم نے کھایا	تھوئے کھوؤ
میں نے کھایا	ماَ کھوؤ	ہم نے کھایا	مھوئے کھوؤ
اُس نے روٹی کھائی	تی گیل کھیئی	اُنہوں نے روٹی کھائی	تھیئے گیل کھیئی

ماضی استمراری

فاعل کے بعد مصدر کی علامت سمیت صیغہ مذکر مونث دونوں صورتوں میں ''دُود'' لگایا جاتا ہے۔ مثلاً

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
وہ کھاتا تھا	سے کھوؤدود	وہ کھاتے تھے	سے کھوؤدود
تو کھاتا تھا	تو کھوؤدود	تم کھاتے تھے	تھوکھوؤدود
میں کھاتا تھا	آ کھوؤدو	ہم کھاتے تھے	مھوکھوؤدود

ماضی بعید

فاعل کے بعد مصدر کی علامت سمیت ''شُو'' لگایا جاتا ہے۔ اگر مفعول مونث ہو تو مصدر کی علامت ہٹا کر ''ی'' کے ساتھ ''شی'' لگایا جاتا ہے جیسے 'وہ روٹی کھاچکا تھا' کا جملہ ''تی گیل کھیئی شی'' بن جائے گا وغیرہ۔ مثلاً

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
وہ کھاچکا تھا	تی کھوؤشو	وہ کھاچکے تھے	تھیئے کھوؤشو
تو کھاچکا تھا	تاَ کھوؤشو	تم کھاچکے تھے	تھوئے کھوؤشو
میں کھاچکا تھا	ماَ کھوؤشو	ہم کھاچکے تھے	مھوئے کھوؤشو

ماضی جاری

مصدر کی علامت ہٹا کر ''آ ییو دُود'' لگانے سے ماضی جاری جملہ بن جاتا ہے جیسے 'احمد لکھ رہا تھا' کے لئے ''احمد لِکا ییو دُود'' بنتا ہے۔ مثلاً

اُردو	توروالی	~~اُردو~~	توروالی
وہ کھا رہا تھا	سے کھاییو دود	وہ کھا رہے تھے	سے کھاییو دود
تو کھا رہا تھا	تو کھاییو دود	تم کھا رہے تھے	تھو کھاییو دود
میں کھا رہا تھا	آ کھاییو دود	ہم کھا رہے تھے	مھو کھاییو دود

مستقبل مطلق

مستقبل کی علامت 'نین' ہے جو فعل کے ساتھ لگائی جاتی ہے۔ جیسے 'وہ سوئے گی' کے لئے جملہ ''تی ہُوب نین'' بن جاتا ہے۔ مثلاً

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
وہ کھائے گا	تی کھانین	وہ کھایں گے	تھیئے کھانین
تو کھائے گا	تأ کھانین	تم کھاؤ گے	تھوئے کھانین
میں کھاؤں گا	مأ کھانین	ہم کھائیں گے	مھوئے کھانین

مستقبل جاری

فعل مستقبل جاری جملہ بنانے کے لئے فاعل کے بعد مصدر کی علامت ہٹا کر ''ا یینین'' لگایا جاتا ہے جیسے مصدر'' تِلُو'' (چلنا) سے ''تِلا یینین'' بن جاتا ہے۔ مثلاً

اُردو	توروالی	اُردو	توروالی
وہ کھاتا رہے گا	تی کھایینین	وہ کھاتے رہیں گے	تھیئے کھایینین
تو کھاتا رہے گا	تأ کھایینین	تم کھاتے رہو گے	تھوئے کھایینین
میں کھاتا رہوں گا	مأ کھایینین	ہم کھاتے رہیں گے	مھوئے کھایینین

واحد جمع بنانے کا طریقہ

صیغہ واحد سے درمیانی 'الف' ہٹا کر صیغہ جمع بنایا جاتا ہے۔

واحد	جمع	واحد	جمع
کھان (پہاڑ)	کھَن	جان (سانپ)	جَن

جانگ (ٹانگ)	جَنگ	کان (کان)	کَن
یاب (نالی)	یَب	چام (چمڑا)	چم
پان (راستہ)	پَن	دان (دانت)	دَن

کسی لفظ کی درمیانی الف کو حرفِ علت ''اُ'' میں تبدیل کرنے سے بھی جمع کا صیغہ بن جاتا ہے مثلاً

ڈھار ڈھاُر (اطراف) بات باُت (باتیں) کھار کھاُر (ندیاں)

بعض اوقات کسی قاعدے کے بغیر واحد سے جمع کا صیغہ بنایا جاتا ہے، مثلاً

باپ۔بوپ (باپ)، بھا۔بھئ (بھائی)، شُو۔شی (بہن)، گا۔گیئ (گائے) وغیرہ، لیکن بعض الفاظ کا جمع بناتے وقت کوئی تبدیلی نہیں آتی مثلاً۔ ماش۔ماش (مچھلی)، گیل۔گیل (روٹی)، باٹ۔باٹ (پتھر)، ڈاپ۔ڈاپ (دیوار) وغیرہ۔

مذکر مونث بنانے کا طریقہ

مذکر سے مونث بنانے کے لئے کوئی مخصوص قاعدہ نہیں البتہ اسم اگر اسم صفت ہو تو اس کا ابتدائی یا درمیانی (الف) ''اُ'' میں تبدیل کرنے سے مونث بن جاتا ہے۔ جیسے

مذکر	مونث	مذکر	مونث
اَن (اندھا)	اُن	بار (موٹا)	باُر
اَم (کچا)	اُم	پھَن (گورا)	پھاُن
کھون (ہونٹ پھٹا)	کھاُن	نَن (ننگا)	ناُن

اِستفہامیہ/ اِشارہ

توروالی	اُردو	توروالی	اُردو
مھیت	یہاں	کھدیک	کتنا
تھیت	وہاں	کامیک	کونسا
میل	اِدھر	کھاُدے	کِدھر
تیل	اُدھر	کی	کِس نے

کھیت	کہاں	کے	کب
کا	کیا	کئی	کیوں
کام	کون	کیوڈک	کب کا
کھاَ کا	ِکس طرح	کیں یت	کہیں
ِکسی	کس کا	کھال/کھاَل	کیسا/کیسی
یام	جو	مھال/مھاَل	ایسا/ایسی

3- اردو کے ساتھ اشتراک اور لسانی ہم آہنگی

توروالی ایک ہند آریائی زبان ہونے کی وجہ سے اردو کے ساتھ خاص یکسانیت اور ہم آہنگی رکھتی ہے- توروالی ذخیرہ الفاظ کی ایک بڑی تعداد دوسری زبانوں کی نسبت اردو سے صوتی اور معنوی اعتبار سے زیادہ قریب ہے- اردو اور توروالی کی گرامر بھی بڑی حد تک مماثل ہے۔ دونوں زبانوں کا ''مزاج'' بھی یکساں ہے مثلاً وہ تمام ہائیہ آوازیں (Aspirants) جو اردو میں دیگر پراکرتوں سے آئی ہیں توروالی میں بھی موجود ہیں جیسے بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، ڈھ، کھ، گھ وغیرہ۔ اس کے برعکس توروالی کی صدیوں پرانی پڑوسی زبان پشتو میں یہ آوازیں نہیں ہیں۔ اس طرح اردو کی تمام معکوس آوازیں (Retroflex) بھی توروالی میں موجود ہیں۔ مثلاً ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ۔

جس طرح اردو میں عربی اور فارسی کے وہ تمام حروف بھی شامل ہیں جو اردو کی اپنی بنیادی آوازوں (Phonemes) کے علاوہ آوازوں کو ظاہر کرتے ہیں (مثلاً ط، ظ، ص، ض وغیرہ) اس طرح توروالی رسم الخط کے بارے میں بھی یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ انہی حروف کو اپنایا جائے گا یعنی ظالم، کو، زالم، کی بجائے ''ظالم'' ہی لکھا جائے گا۔ اس طرح توروالی کے حروف تہجی وہی بنتے ہیں جو اردو زبان کے ہیں۔ سوائے چار مخصوص آوازوں (Consonants) یعنی ڇ ݮ ݬ ݜ ایک حرفِ علت (Vowel) '' اَ '' اور ایک پشتو حرف '' ځ '' کے۔ درج ذیل جدول سے اردو اور توروالی کے لغوی ربط کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ مترادفات بھی دیئے گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ توروالی پر زیادہ اثر انداز ہونے والی زبان پشتو کی نسبت، توروالی اردو کے کتنا قریب ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک عام توروالی، پشتو کے مقابلے میں اردو جلدی اور آسانی سے سیکھ لیتا ہے۔

اردو:	ہاتھ	کان	بال	ٹانگ	بھائی	باپ	پُرانا	میٹھا	چمڑا	گھی
توروالی:	ہات	کان	بال	جانگ	بھا	باپ	پُران	میٹھ	چام	گھت
پشتو:	لاس	غوگ	ویخته	پنڈئی	ورور	پلار	زوڑ	خوگ	سرمن	غوڑی

4- ابتدائی بول چال کے فقرے

اُردو:	توروالی:
☆ آپ کا نام کیا ہے؟	چھی کا نام تُھو؟
میرا نام محمد اسحاق شاہد ہے۔	مھی نام محمد اسحاق شاہد تُھو۔
☆ آپ کیا کرتے ہیں؟	تو کا کام کوُدو؟
میں پڑھتا ہوں۔	اَسوق بَندوُ۔
☆ آپ کیسے ہیں؟	تو کھیاَ تُھو؟
میں اللہ کے فضل وکرم سے بالکل ٹھیک ہوں۔	آ خُدیَ سی فضل دے بالکل جور تُھو۔
☆ اور سنائیں آپ کا کیا حال ہے؟	دُوئیَ بَن چھی کا حال چھی؟
میں بالکل خیریت سے ہوں۔	آ بالکل آراما تھو۔
☆ آپ کے والد کیا کام کرتے ہیں؟	چھی باپ کا کام کودُو؟
وہ ملازمت کرتے ہیں۔	سے نوکری کودُو۔
☆ آپ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟	چھی شِیر مھید اکھید یک دُھو چھی؟
زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ سڑک سیدھی میرے گھر کی طرف جاتی ہے۔	زیات دُھونی چھی۔ اَڑوک سِدا مھی شِیر سی دِش کے بَجدُو۔
☆ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کیا آپ مجھے کسی ڈاکٹر کا پتہ بتا سکتے ہیں؟	مھی طبیاَت ٹِک نی چھی۔ تو مھ یے کامے ڈاکٹر سی پتا بن بھادُو؟

آپ سرکاری ہسپتال چلے جائیں جو کہ سامنے نظر آرہا ہے۔ تو سرکاَری ہسپتال گے بَش پےُ مُخاَخ پَشدَی۔

5- توروالی شاعری

توروالی ایک غیر تحریری زبان رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی قدیم شاعری ناپید ہے تاہم ماضی قریب کے بڑے توروالی شعراء کا کلام سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر آج جزوی طور پر کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ سینکڑوں ایسے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہیں جن کے خالق گمنام ہیں۔ ایسے اشعار یا اُن کے حصے محاورں کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

توروالی شاعری کی تین اصناف ہیں۔ (ا) پھل (ب) لنڈی ژو (ج) ژو

(الف) پھَل

پھَل توروالی شاعری کی پرانی صنف ہے جو جدید توروالی شاعری میں تقریباً متروک ہے۔ اسمیں مصرعے تو مقفّٰی ہوتے ہیں لیکن وزن کا عام طور پر خیال نہیں رکھا جاتا۔ زیادہ تر اشعار کے آخر میں ''ا'' یا ''آ'' کی آواز آتی ہے۔ عموماً پھَل کے اشعار کا موضوع ایک نہیں ہوتا مثلاً:

بی بی دُرخو کی چاڑ بیلی آ وائے میرو چھی کا حالا

بیئل ٹیلینے وا آنگادے دَت مھی دھجیل بُگارا

ترجمہ: گھر کی چھت پر کھڑی بی بی دُرخو نے پوچھا میرو تمہارا کیا حال ہے۔ (میرو نے کہا) میں جھولن چار پائی میں پڑا ہوں اور میرا دُکھی دل آگ میں جل رہا ہے۔

بعض پرانے شعراء نے مختصر مصرعوں کے پھَل بھی کہے ہیں مثلاً ایک نامعلوم شاعر کے کلام سے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

۱) چڑ شیچو تھو مھی آسرلالہ

اِی کھوژور وا تُمی دی نالہ

۲) سیر اُنے کی وربَل سی جالہ

کومؤ یادی مھی آسرلالہ

ترجمہ: (۱) میرا آسر لعل بہت خوبصورت ہے۔ (لگتا ہے) اُس نے جوتوں میں نعل لگوائے ہیں۔

(۲) دوشیزاؤں نے زلفوں کو بل دے رکھے ہیں۔ ایسا اُنھوں نے میرے آسر لعل کو تڑپانے کیلئے کیا ہے۔

(ب)۔ لنڈی ژو

پھَل کی طرح یہ بھی تورِوالی شاعری کی پرانی صنف ہے جواب زیادہ مستعمل نہیں۔ اس کے مصرعے چھوٹے ہوتے ہیں اور ہر دوسرا مصرعہ مقفّٰی ہوتا ہے۔ اس صنف کی شاعری میں مصرعوں کے وزن اور خاص لے کی وجہ سے اشعار میں ایک طرح کی موسیقی ہوتی ہے اس لیے خوشی کے مواقع مثلاً جھولا جھولنے اور مکئی کوٹنے کے دوران مل کر گائے جاتے ہیں۔
چند اشعار ملاحظہ ہوں:

۱) مھیئے ذوالفقار آنا
آہات گیادے تھئی آ
۲) حیدری چیگا کیدے
موذی سی دَر زیت وَئی آ

ترجمہ: ذوالفقار (تلوار) لایا جائے تاکہ میں اس پر (قسم اُٹھانے کیلئے) ہاتھ رکھوں۔ نعرہ حیدری لگا کر اپنے رقیب کے دروازے پر حملہ کروں

۳) مھیے کی بُوشُو آمے
بان وا اُگھات کئی آ
۴) گیل سی حو سی سَت نی چھی
پوڑئ تھلدَی بھئ آ

ترجمہ: مجھے کس نے کہا تھا کہ میں بھی گرمائی چراگاہوں کو جانے کیلئے (پہاڑ) پر چڑھوں۔ (یہاں کے لوگ) روٹی کا ٹکڑا تو نہیں دیتے اور اونی نمدوں پر (اہتمام کے ساتھ) بٹھاتے ہیں۔

۵) خان کاگائے بنا تھیئے
دَش و دُوسو دَئ آ
۶) مھی بیٹریل آزاد کو
مھی آزار گھیدُو کئی آ

ترجمہ: خان چاچا سے (کوئی جا کر) کہہ دے کہ میں دوسو دس روپے تمہاری نظر کروں گا۔ میرے محبوب پر سے پابندیاں اٹھاؤ۔ کیوں مجھے آزار پہنچاتے ہو۔

(ج) ژو

ژوتوروالی کی جدید مقبول عام صنف ہے۔ اس میں اشعار کا موضوع ایک یا الگ الگ ہوسکتا ہے۔ اشعار کے مصرعے ہم وزن تو ہوتے ہیں لیکن مقفّی ہونا ضروری نہیں۔ "ژو" کے اشعار گھاس اور فصل کی کٹائی کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔ جس میں قبائلی لڑائیوں کے تذکروں سے لیکر ہجر ووصال تک کے سارے مضامین باندھے جاتے ہیں۔ مثلاً

غریبی گُل نمیراُ جَدگا سی جامہ

آخویدے چھی لول پوسی نُوخوزیت خپا

ترجمہ: گل نمیر! غریبی تو جوانوں کا پیراہن ہے ہی لیکن یوں تمہارا منہ اندھیرے (مزدوری کی تلاش میں) نکلنا مجھے اُداس کر دیتا ہے۔

پیر باوائے کو گاو چَر اُمُو نہ لَھنگا

ماَ تھاَ دُوئی پٹئی شیے آ کُٹھا نین اینگولا

ترجمہ: میرے محبوب پیر بابا کی زیارت کرنے جاؤ تو زیادہ عرصہ نہیں گذارو۔ میں جمعرات تک تمہارا انتظار کروں گی۔ (یعنی ہمیں اپنی زیارت کراؤ جس کیلئے جمعرات کا دن مقدس ہوتا ہے)۔

5.1- توروالی شعراء

توروالی کلاسیکل شعراء میں سے جن کا کلام ابھی تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اُن میں وادیٔ چیل کے مُلا گلزار، جمروز، زردادا اور رستم شامل ہیں جبکہ وادیٔ بحرین کے خان گل خان (درولئی) پیر دادا اور ملوک شاہ (پرانہ گاؤں) سمندر خان (رامیٹ) اور محبت مُلاَ (مانکیال) معروف شعراء ہیں۔ ان کی شاعری میں مذہبی مواعظ، مختلف قبائل کے آپس کی جنگوں کے حالات اور عشقیہ مضامین پائے جاتے ہیں۔ بونیر کے عظیم بزرگ پیر باباؒ اور اس کا ذکر توروالی صوفی شعراء کا خصوصی موضوع رہا ہے۔ توروالی کلاسیکل شعراء کے چند اشعار بطورِ نمونہ ملاحظہ ہوں:

مُو مانہ وو خیوا مھاَ دید نے دے دھما

ایٹک کالے منک ماچَر بھیئی آروا (جمروز)

ترجمہ: خیوا! میری گود سے مت اُترو اور مجھے جی بھر کر اپنا دیدار کرنے دو (کیونکہ) اب کے برس موت سے میری روح بڑی ڈرنے لگی ہے۔

ژات سی نیماز مومن گے ینین زنکدَ نا

تی شیطان شکیاَ دے بیان کونین کلیما (گل زار)

رجمہ: فجر کی نماز کی برکت سے عالمِ نزع میں مومن کو راحت ملتی ہے۔(اس کی برکت سے) شیطان بھاگ جاتا ہے اور مرنے والے کے لبوں سے کلمہ طیبہ جاری ہوتا ہے۔

ژیمیٹ سی دروازہ می کئی نہ ہُو پیر باوا

ہر چار بانگا بوجنین دے سمندر سی چیگا (سمندر خان)

ترجمہ: کاش پیر باباؒ رامیٹ گاؤں کے دروازے پر موجود ہوتے تو وہ ہر صبح سمندر خان کی فریاد سُن لیتے۔

دھیرین سی ٹین می گوھز یت گیات مُلازہ

ٹھوشینگ پھَرَ گات ڈیڈ کے نگھاَت ماشوقہ (خان گل خان)

ترجمہ: زمین کے نیچے والے بیل نے میرے اوپر بڑا احسان کیا۔اُس نے سینگ ہلایا جس کے نتیجے میں زلزلہ آیا اور محبوب باہر منظر پر آیا۔

5.2- جدید شعراء

توروالی کے جدید شعراء میں بخت بلند اجنبی (بحرین) اقبال خان (گورنئ) محمد حلیم، منشی عبدالمجید، دل آرام رامیٹی (رامیٹ) محمد زیب، حفیظ اللہ حفیظ (بالاکوٹ) شیر محمد خان (وادی چیل) زرین جان (گھڑی) اور محمد سلیم کیدامی (کیدام) قابل ذِکر ہیں۔ان میں سے بعض شعراء نے "ژو" کہے ہیں لیکن زیادہ تر نے پشتو اور اردو شاعری سے متاثر ہو کر نیا اسلوب اختیار کرنے کی کوشش کی ہے یعنی روایتی "ژو" کے برعکس مصرعوں میں نئی طرز پر قافیہ اور ردیف کا استعمال کیا گیا ہے۔مثلاً اقبال خان کی توروالی شاعری سے دو اشعار دیے جاتے ہیں۔

گھین خدایا تو مھ زیت ٹھو نظر کو

تو باچہ تھُومھی نصیب ٹول برابر کو

باَچییَ ھم چھی قائم دُوئییَ فانی چھی

آخرتش ہادے بشنین ہے آرمانی چھی

ترجمہ: ربِّ عظیم! تو مجھ پر اپنی نظر کرم کر۔تو ہی بادشاہ ہے میرے سارے نصیب سنوار دے، تیری سلطنت قائم ودائم ہے

اور یہ دنیا فانی ہے۔ آخر (ہم سب کو) خالی ہاتھ اس حسرت بھری دنیا سے جانا ہے۔

اُن کی ایک اور نظم ''اپنے بچّے کو'' میں سے دو شعر ملاحظہ ہوں:

پورا پورا ٹھو محنت کو تو
پیدا امن می ہر صفت کو تو
ہر اے بیأت سی چھی امتحان ہونین
ماسوماَ تأ تزادا زوآن ہونین

ترجمہ: تم پوری پوری محنت کرو اور اپنے آپ میں ہر خوبی پیدا کرو۔ کل کو جب تم جوان ہو گے تو تمہاری ہر بات کا امتحان لیا جائے گا۔ توروالی شاعری میں جدید رجحانات کا اندازہ محمد سلیم کیدامی کے کلام سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے پہلی بار توروالی شاعری میں مزاحیہ کلام متعارف کرایا ہے۔ گوان کی وجہ شہرت مزاحیہ توروالی شاعری ہے لیکن اُنھوں نے غزل کی ہیئت میں خوبصورت شعر بھی کہے ہیں مثلاً

حیَ می چھی یاد تھا مو تازہ تھی تأ وفا نی کی
مھی آش ڈلی خو قبول آتأ ہی تحفہ نی کی
زار سی پیالائے ہات مُٹھا کی ارادہ ہی بدَل
اما پیگو ہونین بدنام تنو آشنا نی کی
سلیم سی ٹول اُمو جانان سی قدمامی لھینگی
کھال مُسلمان آشو راضی ٹھو مولیٰ نی کی

ترجمہ: تیری یادیں دل میں تازہ ہیں لیکن تو نے وفا نہ کی۔ آنکھوں سے آنسو بہے لیکن تم نے یہ تحفہ بھی قبول نہ کیا۔ زہر کا پیالہ لینے کو ہاتھ بڑھایا لیکن ارادہ بدل دیا کیونکہ مجھے اپنے محبوب کو طعنوں اور بدنامی سے بچانا تھا۔ سلیم کی ساری زندگی محبوب کے قدموں میں گزری۔ کیسا مسلمان ہے وہ کہ اپنے رب کو راضی نہ کر سکا۔

6- توروالی نثر

توروالی نثر میں تحریری ادب کے نمونے نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم لوک ادب سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔

چنانچہ اس ضمن میں اس زبان کی ایک لوک کہانی ،ضرب الامثال، روزمروں اور پہیلیوں کے چند نمونے اردو ترجمے کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں-

6.1- تورو الی کہانی

اے باچاسی سات جَدَگ اُشی-تھاُ می ایک لِن اُشو ۔لِن دیاُل بھیٔ آ سی پِڑاُن سی پوآشُو کھاُ نُمو تیسیت غورہ سلوک نہ کوودوَد۔اے دی باچا خلق آئے بنُوھی باچییٔ می ہر کی تھُو آ۔اے ماتِٔ تو َس کی بغداد ی گھولییٔ ھُم تھی؟ باچا بنُو سے دانی تھی آ۔ باچاچُرچاہو۔تسی جدک تسی کاَن گے آئی بنُومھوے بغدادی گھولئی تھییٔے آن نین آ۔بُٹ جَدَک گئی۔دیاُل بھیٔ دُھونہ گئی سے بھیوُوداُسے لِن چر دُھوگا۔تیس کے معلوم ہُو زراب خاپری سی محل می بغداُدی گھولئی تھی۔سے محل سی اندر کے گا۔خاپری ہُوبیل اُشی-لِن تسی کو جولھاُ دے گھولییٔ گھیندے ائییٔ۔پن دے دیاُل بھیٔ ے تیس گیتِس تے گوڈواُں تیں کیجا گھولییٔ گِھر اُدے باچائے دید۔باچا تھاُ کیجاچُر خوشال ہُو۔دھاُ ک سات آبعد زراب خاپری تھُو دیو آسمانے باچاسی محل گے اُپ۔باچاآں تسی جَدَک چُر بھیُوئی۔تھییٔے بنُومھاُ گھولییٔ لِن ائییٔ شی۔تھیے لِن گیتِس تے خاپری ءِ دید۔لِن خاپری ءِ بنُومھاُ گھولییٔ ائییٔ داتو ہوبیل اُشی ماُ چھی کو جولھاُ دے مھاُ گھولییٔ ائییٔ شی۔خاپری چُر شوماگاُ۔تھُو دیو آئے بنُوتھو واپس بجا۔سے لِن سی نرتوب ماچُر خوشال ہی۔تی تیسیت بیوا کی۔

ترجمہ: ایک بادشاہ کے سات بیٹے تھے۔اُن میں سے ایک گنجا تھا۔گنجا باقی بھائیوں کا سوتیلا بھائی تھا۔اس لیے وہ اس سے اچھا سلوک نہیں کرتے تھے۔ایک دن بادشاہ نے لوگوں سے کہا کہ اُس کی سلطنت میں سب کچھ موجود ہے۔ایک آدمی نے پوچھا کیا بغدادی کبوتر بھی ہیں؟ بادشاہ نے کہا یہ تو نہیں ہیں۔وہ اس بات پر بہت افسردہ ہوگیا۔اُس کے بیٹے اُس کے پاس آئے اور کہا کہ وہ بادشاہ کو بغدادی کبوتر لا کر دیں گے۔سب لڑکے چلے گئے۔باقی لڑکے زیادہ دور نہیں گئے کیونکہ وہ ڈرتے تھے لیکن گنجا بہت دور تک گیا۔اُسے معلوم ہوگیا کہ زراب پری کے محل میں بغدادی کبوتر ہیں۔وہ محل کے اندر گیا۔پری سورہی تھی۔گنجے نے اُس کے کپڑے پہنے اور کبوتر اُٹھا لایا۔ باقی بھائیوں نے گنجے کو راستے میں پکڑا اُسے مارا اور کبوتر چھین کر باشاہ کو دیئے۔بادشاہ بہت خوش ہوا۔کچھ دیر بعد زراب پری اپنے دیوؤں کے ساتھ بادشاہ کے محل میں آئی۔بادشاہ اور اُس کے بیٹے ڈر گئے۔انہوں نے کہا کہ یہ کبوتر گنجا لے کر آیا تھا۔اُنھوں نے گنجے کو پری کے حوالے کیا۔گنجے نے پری کو بتایا کہ وہ سو رہی تھی اور وہ اس کے کپڑے پہن کر کبوتروں کو ساتھ لایا ہے۔اس پر پری بہت شرمندہ ہوئی۔اپنے دیوؤں سے کہا کہ وہ واپس

جائیں۔ وہ گنجے کی بہادری سے بہت متاثر ہوئی۔ اُس نے گنجے سے شادی کی۔

6.2- توروالی روزمرہ ومحاورہ

روزمرہ ومحاورہ	لفظی ترجمہ	مفہوم
گُٹ می لون پھروَ	کونے میں بیٹھ کر نمک توڑنا	کسی کے خلاف سازش کرنا
ہاداسی گاؑن دنائے بجُو	ہاتھوں کی گانٹھیں دانتوں سے کھولنا	آسان کام کا مشکل بن جانا
حَی سی بیٹریل گھیئو	دل کے پتھر چننا	کسی کی مشکل آسان بنانا
لھکیر اُشّی یے ترینگو	لال آنکھوں کے ساتھ رونا	کسی کا سخت مشکل میں ہونا
مرچکیَٔ سی ٹھیٹ زیت بجُو	مرچوں کے ڈھیر پر بیٹھنا	ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینا
اُشّی ے مائل دِھمی نوخُو	آنکھوں سے نیلا دھواں نکلنا	سخت افسوس ہونا

6.3- توروالی ضرب الامثال

دُوئی سی ہات تے جان ھُم نہ ما	دوسروں کے ہاتھوں سانپ بھی نہ مرواؤ
گھودو شینگائے گوشوکن ی کوروڑی	گدھا سینگ لینے گیا تھا اور کان کٹوا آیا
مناک بندۇمائ دھید ے گان والو	مینڈک نے کہا میں دریا کی مدد سے لکڑی لایا ہوں
شینا گئی اودھیر نایاۓ دے نہ بجدی	چارپائی سے گریں تو زمین سے نہیں گریں گے
گھودو ذِت سی کھوؤ آ کاجندۇ	گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ
دوئی سی شیرے بیش جن میلاش کی بات نی چھی	پرائے گھر میں بیس مہمان کوئی خاص بات نہیں
چارسی جیبا چارسی ییئ ججی	گونگے کے اشاروں کو گونگے کی ماں ہی بہتر سمجھے گی
اُو کمزور پوت واڈلدۇ	پانی کمزور جگہ ہی سے گرتا ہے
اُرسی بچیٔ یے لاموننہ چھِرّا	بطخ کے بچے کو تیرنا مت سکھاؤ
چھیاَل نہ چیات تھی اسے شونئے بید تھی	چرواہا تو نہیں رہا ہوں لیکن سیٹیاں سُنی ہیں
چی آھون خو بھوئی ہون	بھلے چیڑ کے درخت سے ہوں مگر ہوں سیب

موش کے کاغم چھی ژَن می شَیر چھی	چوہے کو کیا غم اُس کا گھر پن چکی کے اندر ہے
ہر ماش کے تئو وطن کشمیر تھو	ہر آدمی کو اُس کا وطن کشمیر جیسا پیارا ہے
اُگھا ماڈ یودا میک زیت چیخ ہُو	بارش سے بھاگا تو اولوں نے آلیا

7۔ خود آزمائی

-1 توروالی زبان کے لسانی گروہ کے حوالے سے ماہرین السنہ کی آراء پر روشنی ڈالیں؟

-2 توروالی حروف تہجی اور رسم الخط کی تاریخ بیان کریں؟

-3 ''توروالی اور اردو کے بین اللسانی روابط'' کے عنوان سے ایک مضمون اپنے الفاظ میں قلم بند کیجئے؟

-4 توروالی شاعری کی اصناف پھل، لنڈی ژو اور ژو کی ہیت ترکیبی لکھئے اور مثالیں بھی پیش کیجئے؟

-5 توروالی اور پشتو کے لسانی روابط کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

حوالہ جات

R-1. Turner, L-R "Comparative Dictionary of Indo-Aryan Languages London, Oxford University Press viii, 1966.

R-2. Strand, Richard 'Notes on the Nuristani and Dardic Languages, American Oriental Society Journal 1973 Vol. 93:3 Pages 297-305

R-3. پرویش شاہین، کالام کوہستانی، مینگورہ شعیب سنز ۱۹۸۹ء صفحہ ۲۵

R-4. Turner L-R " Comparative Dictionary" Pages 75-99

R-5. Grierson, Sir George "Linguistic Survey of India" Vol. III Part II,I Indo-Aryan family North West Group, 1919, (reprinted 1969) Lahore, Accurate Printer, pages 7-8.

R-6. Jetmar, Karl "Bolor and Dardistan" Islamabad, National Institute of Folk Heritage, 1958.

R-7. Fussman, Gerard "Atlas Linguistique des Dardes et Kafirs" Vol. II

Commentaire, Paris 1972 Page 12.

R-8. Schmidt, Ruth Laila "Kohistani To Kashmiri: an Annotated bibliography of Dard Lanugages, Patiala Indian Institute of Languages studies, 1983:17

R-9. Strand, Richard "Notes on the Nuristani" 93:297-305

R-10. Grierson, "Linguistic Survey" Vol. II page 514

R-11. Massica Collin P. "The Indo-Aryan Languages" Cambridge, Cambridge University press, 1991, page 212

R-12. Shaheedullah, Dr. "The Languages of the North Western Frontier of Pakistan" Pakistani Linguistics, 1963:37

R-13. MacMahon "A report on the Tribes of Swat Dir and Bajawar, 1901 (reprinted in 1981, Tribal Affairs Research Cell 1981.

R-14. Biddulph, Jhon, "Tribes of Hindukush" Indus Publications, 1880 (reprinted in 1977) page 70.

R-15. MacMahoh "A report on the Tribes of Swat"

R-16. Grierson "Linguistic Survey" viii. 2:7-8

R-17. Rensch "Languages of Kohistan" Islamabad. NIPS-SIL, 1992:11.

R-18. Grierson "Torwali: An account of a Dard language of the Swat Kohistan", Royal Asiatic Society London, 1929, pages 111-129.

R-19. Keiser, Lincoln "Notes on the ethnography of Bishigram" paper presented at the University of Wisconsin.

R-20. Decker, Sandra "Languages of Kohistan" NIPS-SIL, 1992, page 70.

R-21. کریمی، عبدالحمید "کوہستانی اردو بول چال" ادب کوہستان اکیڈیمی، بحرین ۱۹۸۱ء

یونٹ نمبر 9
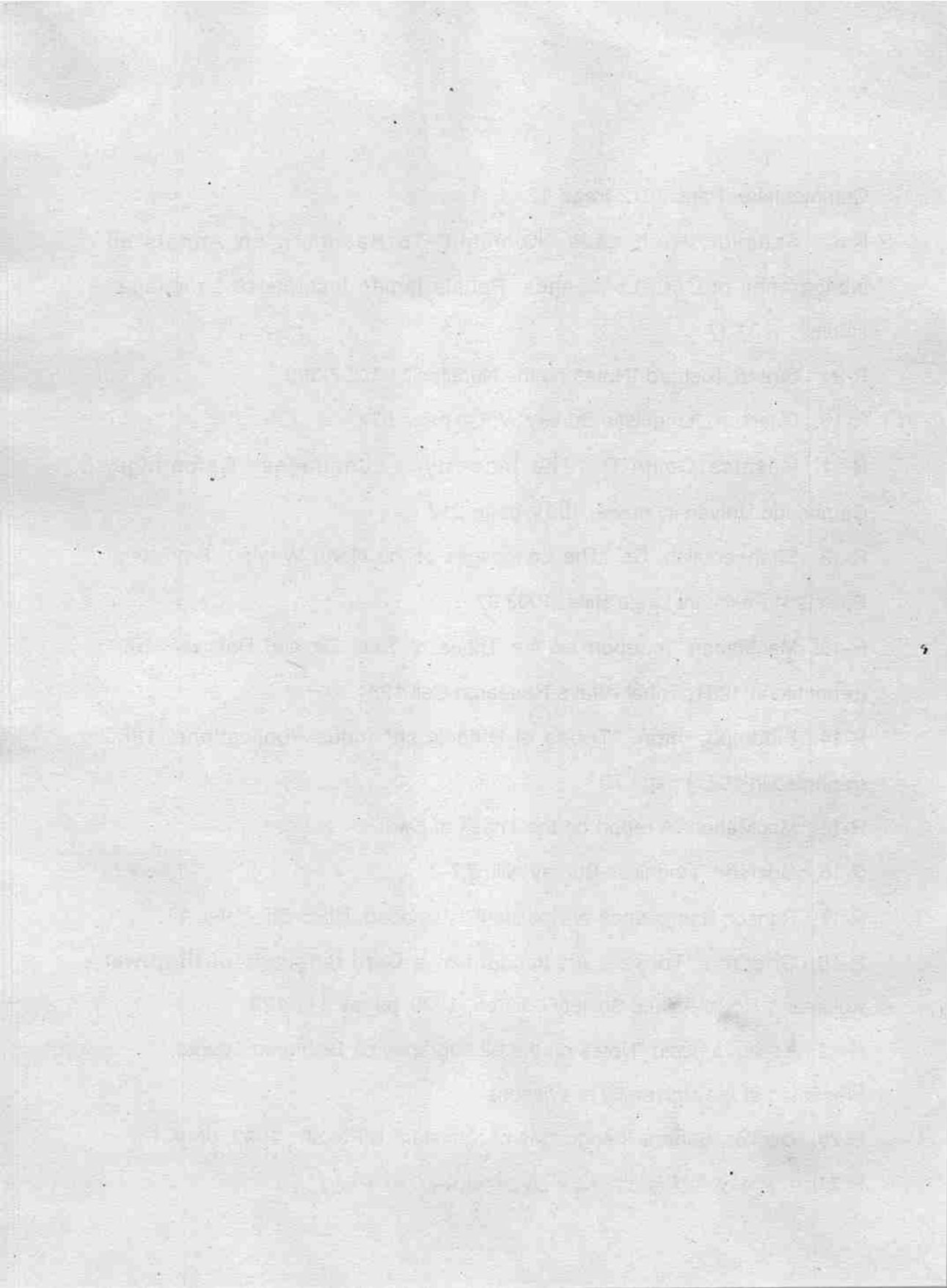
گاؤری زبان وادب

تحریر : ڈاکٹر جان بارٹ

اُردو ترجمہ : محمد زمان ساگر

نظر ثانی : ڈاکٹر انعام الحق جاوید

فہرست

صفحہ نمبر

یونٹ کا تعارف

مطالعاتی رہنما کے اس یونٹ کا تعلق گاوُری زبان سے ہے۔ یہ زبان کالام تحصیل میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ وراثتی درجہ بندی کے مطابق یہ زبان دردستانی زبانوں کی کوہستانی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ لسانیات اور نسلی جغرافیائی ادب میں اس کو "بشکارک" بھی کہا گیا ہے۔ اس یونٹ میں آپ گاوُری کی وجہ تسمیہ، لسانی گروہ، لہجوں، اس زبان کے تاریخی پس منظر، دوسری زبانوں سے لسانی روابط، رسم الخط، حروف تہجی، بنیادی قواعد اور زبان کی ساخت کا مفصل مطالعہ کریں گے اور ساتھ ہی اس زبان کے ادب کے بارے میں بھی پڑھیں گے۔ پاکستانی زبانوں کا طالب علم ہونے کے ناطے آپ اس یونٹ کا بغور مطالعہ کیجئے۔

مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1۔ گاوُری زبان کے لسانی جغرافیہ، وجہ تسمیہ اور تاریخی پس منظر کے بارے میں جان سکیں اور اس پر بحث کر سکیں۔

2۔ گاوُری کے رسم الخط اور حروف تہجی کے متعلق جان سکیں۔

3۔ گاوُری کے ساتھ دوسری زبانوں کے تعلق سے آگاہ ہو سکیں۔

4۔ روزمرہ استعمال کے چند ابتدائی گاوُری جملے بول سکیں۔
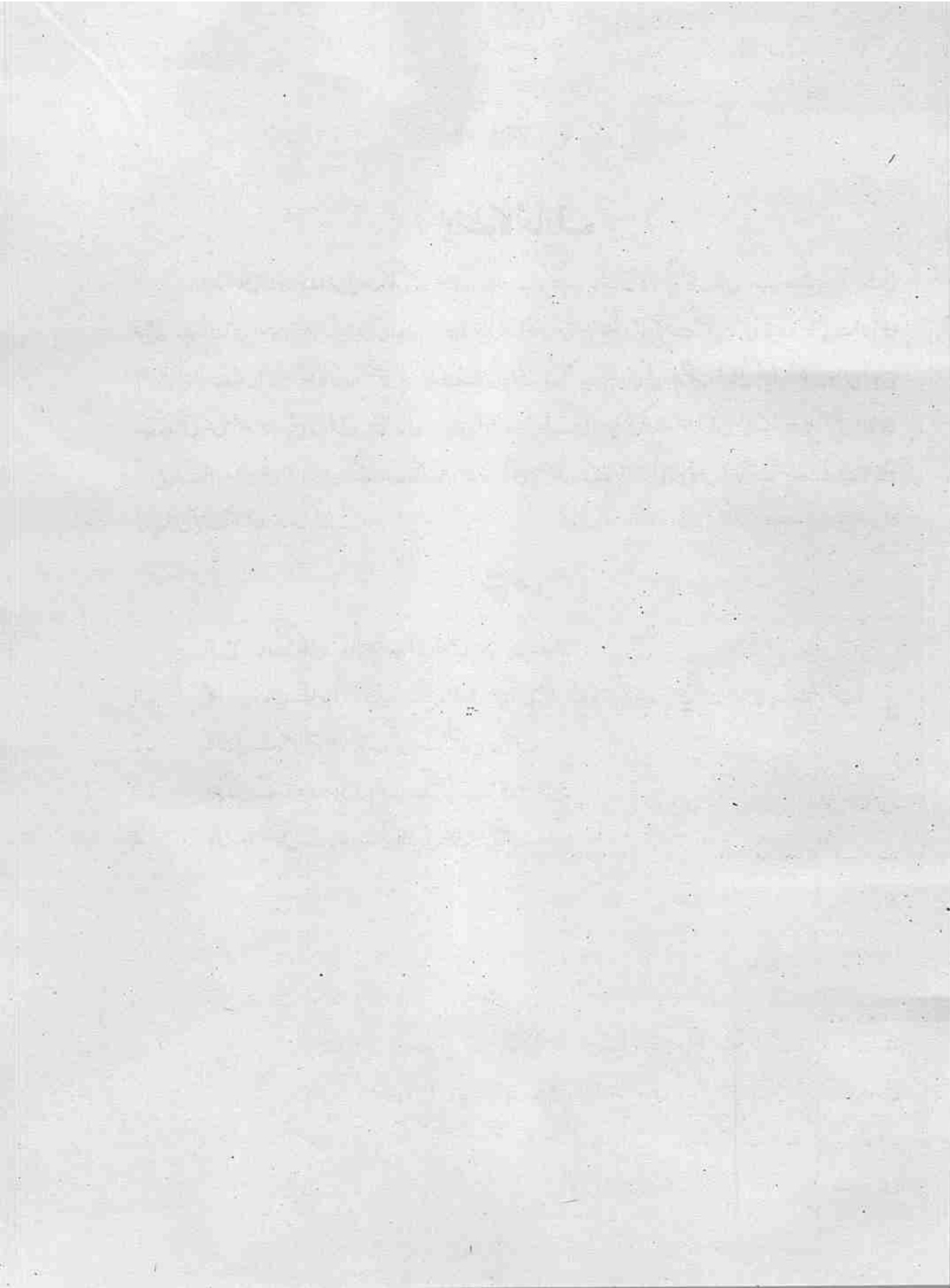
1۔ گاؤری زبان

1.1۔ لسانی جغرافیہ

شمالی پاکستان کے پشتو بولنے والے علاقے مینگورہ (جوکہ ضلع سوات کا سب سے بڑا قصبہ ہے) سے اوپر کی جانب سفر کریں تو مدین سے گزرنے کے بعد جس دوسری زبان کا علاقہ شروع ہوتا ہے اُسے توروالی کہتے ہیں۔ بحرین، توروالی زبان بولنے والوں کا مرکز ہے۔ جیسے جیسے سفر اوپر کی طرف بڑھتا جاتا ہے، توروالی زبان بولنے والا علاقہ ختم ہوتا جاتا ہے اور کچھ دیہاتوں (اسریت، لائکوٹ اور پشمال) سے گزرنے کے بعد دریائے سوات کا معاون دریا ''قارن ڈوکی'' آجاتا ہے۔ یہاں سے ہم بحرین تحصیل سے نکل کر کالام تحصیل میں داخل ہوجاتے ہیں اور ساتھ ہی گاؤری بولنے والے علاقے میں بھی داخل ہوجاتے ہیں، تاہم گاؤری یہاں بولی جانے والی واحد زبان نہیں ہے۔

گاؤری کالام تحصیل میں سب سے زیادہ اہمیت کی حامل زبان ہے۔ کئی صدیاں قبل مختلف طبقاتی گروہوں نے کالام کا رُخ کیا اور یہاں آکر بس گئے۔ ان میں پشتو، گوجری اور کھوار بولنے والے گروہ بھی شامل تھے جو کہ زیادہ تعداد میں تھے۔ ان میں بہت سے لوگوں نے گاؤری زبان دوسری زبان کے طور پر سیکھی۔ اس کے علاوہ اس تحصیل میں پشتو بھی دوسری زبان کے طور پر تقریباً تمام لوگ جانتے اور بولتے ہیں۔

ضلع سوات میں گاؤری بولنے والے علاقے کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ نچلا گروہ کالام خاص، کالام سے اوپر مغرب میں اتروڑ گروہ اور شمال مشرق میں اوشو گروہ۔ اتروڑ اور اوشو کی بولیاں ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے علاوہ کالام گروہ کی بولی سے بھی مختلف ہیں۔ اتروڑ کے مغربی پہاڑوں کو عبور کرکے وادئ پنجکوڑہ کا بالائی علاقہ شروع ہوجاتا ہے جو کہ ضلع دیر سے ملحق ہے۔ اس علاقے کو دیر کوہستان کہتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ علاقوں (تھل، لاموتی، بریکوٹ، بیاڑ، کلکوٹ اور پاتراک) میں گاؤری بولی جاتی ہے۔

کالام کوہستان کا علاقہ صوبہ سرحد کے شمال میں واقع ضلع سوات کے علاقے پر مشتمل ہے جس میں کالام اور اس سے آگے کے کچھ علاقے بھی شامل ہیں۔ شمال میں اس کی سرحدیں چترال اور گلگت ایجنسی سے ملتی ہیں۔ مشرق میں، چند پہاڑی راستے وادئ کندیا کی طرف جاتے ہیں جو کہ اباسین کوہستان میں واقع ہے۔ اس طرح کے پہاڑی راستے مغرب میں دیر کوہستان کے تھل اور لاموتی دیہاتوں کی طرف بھی جاتے ہیں۔ کالام اس گاؤں کا نام ہے جو کہ اتروڑ اور اوشو کے دریاؤں

کے سنگم پر واقع ہے جو باہم مل کر دریائے سوات بناتے ہیں۔ کالام کوہستانی لوگوں نے ضلع سوات کے بالائی علاقوں میں سے زیادہ علاقوں پر قبضہ کیا ہوا ہے جبکہ بالائی پہاڑی علاقے گبرال میں کالامیوں کی بجائے گوجر لوگ آباد ہیں جو کہ اپنی گوجری بولتے ہیں۔

1.2۔ گاؤری آبادی

ایک علاقائی ترقیاتی منصوبے KIDP کے مطابق کالام تحصیل کی آبادی 1982ء میں چالیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں گاؤری نہ بولنے والے لوگ بھی شامل تھے۔ ایک محتاط تجزیے کے مطابق ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ 1982ء میں گاؤری زبان بولنے والوں کی تعداد 26,000 سے لے کر 30,000 کے لگ بھگ تھی۔ اب 2.6 فی صد کے حساب سے سالانہ آبادی کے بڑھنے کی شرح کے مطابق (جو کہ پاکستان کی آبادی کے بڑھنے کی شرح بھی ہے) کالام تحصیل میں گاؤری بولنے والوں کی تعداد 1995ء میں کم سے کم 38,000 اور زیادہ سے زیادہ 45,000 کے لگ بھگ ہوگی۔ ضلع سوات کی تحصیل بحرین کے گاؤں آریانی میں داچوا (Dachwa) بولی جاتی ہے جو کہ گاؤری کے اس قدر قریب ہے کہ لسانی مماثلت کے حوالے سے اس کی ایک بولی لگتی ہے۔

جولائی 1995ء میں کالام کے غیر سرکاری تجزیے کے مطابق گاؤری بولنے والے لوگوں کی تعداد تھل میں 8000، لاموتی میں 7000 اور کلکوٹ میں 2000 تھی۔ تاحال دیر کوہستان کے دوسرے گاؤری بولنے والے علاقوں (بریکوٹ، بیاڑ، پاتراک) کے اعداد و شمار موجود نہیں۔ دستیاب معلومات کے مطابق، گاؤری بطور مادری زبان بولنے والوں کی تعداد 1995ء میں بشمول سوات اور دیر کوہستان، تقریباً ساٹھ ستر ہزار کے لگ بھگ تھی۔

1.3۔ گاؤری کی وجہ تسمیہ

لسانیات اور نسلی جغرافیائی ادب میں اس زبان کو بشکارک بھی کہا گیا ہے۔ شروع میں مور گنسٹیئرن (1920) نے بھی اس کے لیے بشکارک ہی کا نام استعمال کیا۔ یہ نام بڈولف نے بھی استعمال کیا تھا۔ گریرسن نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں اس زبان کو گاروی (Garwy) کہا ہے تاہم آخر میں فریڈرک بارتھ اور مور گنسٹیئرن نے اسے گاؤری کا نام دیا جو کہ مستند نام لگتا ہے۔

گاؤری اور بشکاری ناموں کا ذکر ویدوں میں بھی موجود ہے اور پانینی کے علاوہ (جو کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں یا چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں گزرے ہیں) کچھ دوسرے ہندی ماخذ میں دریائے پنجکوڑہ کو، جو کہ دیر میں واقع

ہے، گاؤری کہا گیا ہے۔ 327 قبل مسیح میں سکندر اعظم نے مساکا کے مقام پر Gauraioi قبیلے (جسے Gretai بھی کہتے ہیں) کے ساتھ ایک جنگ لڑی تھی۔ پیٹولیمی (Ptolemy) کے بموجب دریائے سوات کے مغرب کی طرف واقع علاقے کو گوریائی (Goryaia) کہتے ہیں۔ جہاں تک قبائلی نام بشکارک کا تعلق ہے تو فرانسیسی ماہر لسانیات بلاک (Bloch) نے اسے ویدوں کی یادگار قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ''یہ وہی زبان ہے جو ان کے مدرسوں میں استعمال ہوتی تھی، جنھوں نے رِگ وید کو محفوظ کیا تھا''۔ گاؤری بولنے والے زیادہ تر اپنی زبان کو کوہستانی کہتے ہیں۔ ابتداء میں لفظ ''کوہستانی'' وادیٔ سوات کے میدانی علاقوں میں رہنے والے پٹھان، ان قبائل کے لئے استعمال کرتے تھے جو پہاڑی علاقوں میں رہتے تھے۔

1.4۔ تاریخی پس منظر

گاؤری بولنے والوں کے آباؤاجداد بھی گاؤرائیو (گاؤری) تھے جو کہ زرخیز میدانی علاقوں میں، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، تقریباً پانینی کے وقتوں سے اور سکندرِ اعظم کے زمانے سے آباد تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں، اس علاقے کو افغان فوجیوں نے محمود غزنوی کی سپہ سالاری میں فتح کیا اور اصل باشندوں کو وادیٔ پنجکوڑہ کے دور دراز علاقوں کی طرف بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کی تصدیق مقامی روایات بھی کرتی ہیں۔ گاؤری زبان بولنے والے گروہ وہاں سے پہاڑ عبور کر کے اتروڑ، اوشو اور کالام میں جا آباد ہوئے جو کہ اب ضلع سوات کہلاتا ہے۔

چودھویں صدی کے بعد، افغان حملہ آوروں کی ایک نئی لہر (یوسف زئی) پٹھانوں کی صورت میں آئی جنھوں نے آہستہ آہستہ سوات اور دیر کے میدانی علاقوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یوسف زئی قبیلے کے دباؤ سے، جو پٹھان ان علاقوں میں رہتے تھے وہ اس علاقے کو چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان میں سے کچھ وادیٔ پنجکوڑہ کے بالائی علاقوں اور سوات کے پہاڑی علاقوں کی طرف کوچ کر گئے۔ ان مسلمان مہاجرین کے اثر سے، تقریباً پندرہویں یا سولہویں صدی عیسوی میں کالام اور دیر کوہستان کے لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ کالام کے کوہستانیوں نے کئی صدیوں تک آزاد سیاسی حیثیت برقرار رکھی۔ 1947ء میں، جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑا، تو بھی کالام کوہستان پر والیٔ سوات کی حکومت قائم رہی۔ اس زمانے میں، سوات ایک خودمختار ریاست تھی۔ بعدازاں، 1969ء میں سوات پاکستان میں ضم ہو گیا۔

اس علاقے میں شرح خواندگی بہت کم ہے۔ سرکاری سکول علاقے کے بڑے دیہاتوں میں موجود تو ہیں لیکن اساتذہ اور سہولیات کے فقدان کی وجہ سے تعلیمی معیار نہ ہونے کے برابر ہے۔ 1994ء کے بعد دو تین پبلک سکولوں نے کاروباری سطح پر کام شروع کیا جو لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہے ہیں۔ پورے علاقے میں لڑکیوں کے لئے صرف دو

پرائمری سکول ہیں۔ 1990ء میں KIDP نے لڑکیوں کے ہوم ٹیوشن سنٹرز کے نام سے ایک تعلیمی منصوبہ شروع کیا۔ سکولوں اور ہوم ٹیوشن سنٹروں میں، تعلیمی زبان پشتو ہے۔ چھوٹے بچوں کو سمجھانے کے لئے کبھی کبھار اساتذہ گاوُری زبان بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ ہائی اور مڈل سکولوں میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔

2۔ گاوُری کا دوسری زبانوں سے تعلق

وراثتی درجہ بندی کے مطابق یہ زبان دردستانی زبانوں کی کوہستانی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور زبانیں جو اس کے گردونواح میں موجود ہیں جیسے کلکوٹی (جو دیر کوہستان کے گاؤں کلکوٹ میں بولی جاتی ہے)، توروالی (جو سوات کوہستان میں کالام کے جنوب میں بولی جاتی ہے)، اباسین کوہستانی، بٹیری، چھلیسو اور گاوُرو (یہ آخر الذکر چاروں زبانیں ضلع کوہستان میں بولی جاتی ہیں) کا تعلق بھی کوہستانی شاخ سے ہے۔ دردستانی زبانوں میں سرحد پار افغانستان میں بولی جانے والی زبان پشائی، چترال میں بولی جانے والی کھوار اور کلاشا اور شمالی علاقوں میں بولی جانے والی شنا بھی شامل ہے۔ دردستانی زبانیں ہند آریائی زبانوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ یہ زبانیں وراثتی طور پر پشتو اور بلوچی کے برعکس (آخر الذکر دونوں زبانوں کا تعلق ایرانی گروپ سے ہے)، اردو، پنجابی اور سندھی سے زیادہ قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ اس علاقے میں اُردو خواندگی کی اہم زبان ہے جبکہ گوجری جو کہ کالام اور دیر کوہستان میں بھی بولی جاتی ہے اس کی ملحقہ زبان ہے۔

زبانوں کی ملتی جلتی باہمی مماثلت صرف ان کے نسلی رشتوں کے باعث ہی جنم نہیں لیتی بلکہ بعض دیگر عوامل کے اثرات بھی اس میں کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً دوسری زبانوں سے قریبی رابطہ و تعلق وغیرہ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عمومی طور پر گاوُری اور جنوبی ایشیائی لسانی علاقے کی دیگر کئی زبانوں اور لسانی گروہوں جیسے ہند آریائی، دراوڑی، ایرانی یا الگ تھلگ زبان بروشسکی وغیرہ میں بعض اہم مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً فقروں میں فاعل، مفعول اور فعل کا استعمال اسی ذیل میں آتا ہے جس کی ترتیب ان سب زبانوں میں ایک ہی ہے۔ اسی طرح گاوُری زبان نے بہت سے الفاظ اس علاقے کی دوسری مذہبی، سیاسی یا معاشی اہمیت کی حامل زبانوں جیسے عربی، فارسی، پشتو، انگریزی اور اُردو وغیرہ سے بھی مستعار لئے ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔ ان میں سے کچھ الفاظ ایسے ہیں جو بعینہٖ لیے گئے ہیں اور کچھ الفاظ بہ ادنیٰ تغیر مستعمل ہیں:

-1

گاوری	اردو/عربی/فارسی	گاوری	اردو/عربی/فارسی
یار	یار	دشمن	دشمن
مزدور	مزدور	آج	آج
مہ	مہینہ/ماہ	رات	رات
سینہ	سینہ	میز	میز
کرسی	کرسی	سبزی	سبزی
آلو	آلو	مٹر	مٹر
پیاز	پیاز	ٹماٹر	ٹماٹر
پالک	پالک	دال	دال
بادام	بادام	آم	آم
کیلا	کیلا	آسمان	آسمان
گرمی	گرمی	تو	تو۔آپ
آسان	آسان	پاک	پاک۔صاف

-2

گاوری	اردو/عربی/فارسی	گاوری	اردو/عربی/فارسی
شُشُر	سسر	دار	دیور
استاز	استاد	کَن	کان
جِب	زبان	چَم	چمڑا
اُوٹ	اونٹ	در	دروازہ۔در
بِشترہ	بسترہ	المارئ	الماری
بینڈئی	بھنڈی	بندگوپی	بندگوبھی
چئی	چائے	خوشحال	خوش

3۔ گاؤری کی لسانی خصوصیات

3.1۔ گاؤری حروفِ علّت اوراعراب

گاؤری میں حروف علّت کے لئے چھ بنیادی حروف استعمال ہوتے ہیں جن کا فرق ادائیگی کے وقت ان کی طوالت اوراختصار سے ہوتا ہے۔(ذیل میں عِلّت کی طوالت ظاہر کرنے کے لیے انگریزی حرف پرایک چھوٹی سی افقی لکیر لگادی گئی ہے)۔

Gawri Oral Vowels

	Front	Back
Close	i, ī	u, ū
Mid	e, ē	o, ō
Open	ä, ā̈	a, ā

اردو میں اس کی صورت یوں ہوگی:

1= اُو اُوٹ (بمعنی اونٹ) اُ ءُ اُٹ (بمعنی کھڑا)

2= او کوٹ (بمعنی کوٹ) اؤ ۂ اؤم (بمعنی یہ)

3= ٓ آل (بمعنی اولاد) ءَ اَل (بمعنی گیلا)

4= ای رکیر (بمعنی مَیل) ءِ رکر (بمعنی کیا)

5= اے+ءتھیئر (ہاتھ) (ےاورحمزہ کی مخلوط آواز) اِ+ء اِئر (بطخ) (زیراورہمزہ کے ساتھ)

6= آٗ آٗن (بہانہ) (لمبی ترچھی زبر) اُٗ اُٗن (بمعنی انڈے)

پہلی آوازوں کو کھینچ کر پڑھیں گے جبکہ دوسری آوازوں کو تیزی سے اور مختصر پڑھیں گے اوراس طرح آواز کو ذراسا لمبایا مختصر کرنے سے مفہوم مختلف ہوجائے گا۔ یہ اصول تمام حروف علت پر لاگو ہوتا ہے اوراس طرح بارہ خالص حروف علت بن جاتے ہیں۔ یہ نظام اُردو سے مختلف ہے چنانچہ گاؤری میں یہ طریقہ وضع کیا گیا ہے کہ چھ بنیادی حروف علت پر مختلف نشان لگا کران سے 12 آوازوں کا کام لیا جائے۔ مثلاً صرف زبر کے ساتھ ''بَٹ'' واحد ہے اوراس کے معنی ''ایک پتھر'' کے ہیں

جبکہ اِبی زبر کے اوپر اور نیچے ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے (ٍّ) تو ''بُٹ'' جمع ہو جاتا ہے اور اس کے معنی ''پتھروں'' کے ہو جاتے ہیں۔

جزم کا استعمال کسی حرف کی آواز کو مختصر بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً ''ٹوْپ''(top) بمعنی ''ٹوپی'' جو اسے ''ٹوپ'' بمعنی ''چھلانگ'' سے مختلف کر دیتا ہے۔ پیش اُردو کے پیش اور انگریزی کے "U" کی طرح استعمال ہوتی ہے جیسے ''گُل''۔ زیر اُردو کے زیر اور انگریزی کے (i) کی طرح استعمال ہوتی ہے جیسے ''سِل''۔ انگریزی کے (e) یا (ai) کی آواز کے لیے زیر لگائے بغیر لفظ میں ''ی'' کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے ''ٹیپ'' (بروزنِ ٹیپ ریکارڈر) اور اسی لفظ کو ترچھی آواز میں ادا کرنے کے لیے ''ی'' کے اوپر جزم لگا دی جاتی ہے جیسے ''ٹیْپ'' ''(بروزنِ cap)۔

3.2۔ حروف صحیح

گاوری میں بے سُر دو جانبی رگڑ پیدا کرنے والی آوازیں موجود ہیں۔ اس کا فرق (ل) یعنی (لام) ''village'' کے مقابلے میں (لؕ) ''دیار کی لکڑی'' سے واضح کیا جاسکتا ہے۔

ف اور ق زیادہ تر مستعار الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور کبھی کبھار ان کی جگہ پ اور خ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ی، ز اور خ بھی مستعار الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ''انٹرنیشنل فونیٹک الفابیٹس'' کے مطابق گاوری حروف صحیح کی فہرست یوں بنتی ہے:

Gawri consonants according to I.P.A

	labial	dental	retroflex	palatal	velar	post-velar
plosives	ph پھ	th تھ	ṭh ٹھ		kh کھ	
	p پ	t ت	ṭ ٹ		k ک	q ق
	b ب	d د	ḍ ڈ		g گ	
affricates		tsh څھ	ç̣h چھ	čh چھ		
		ts څ	ç̣ ڇ	č چ		
				ǰ ج		
fricatives	f ف	s س	ṣ ݜ	š ش	x خ	h ہ
		z ز-ذ			ɣ غ	
glides	w و			y ی		
nasals	m م	n ن	ṇ ڑ +ن		ن + گ ŋ	
laterals		l ل				
		l لؕ				
flaps		r ر	ṛ ڑ			

3.3۔ تلفظ

گاؤری میں کم از کم پانچ تفریقی ٹون (سُر رتان) ہیں جن کی مثال نیچے دیے گئے (a) اور (e) کے الفاظ سے واضح کی جاتی ہے۔ گاؤری کو اگر Tone Language (تانیاتی یا صوتیاتی زبان) کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کیونکہ Tone Language میں آواز کے وقفے اور زیر و بم کی تبدیلی ایک جیسے الفاظ کو مختلف المعانی بنا دیتی ہے مثلاً

1.	bōr	(high level pitch)	'lion' (singular)
2.	bōr	(high-to-low falling pitch)	'lion' (plural)
3.	bōr	(delayed high-to-low falling pitch)	'deaf'
4.	bōr	(low level pitch)	'pathan'
5.	gōr	(low-to-high rising pitch)	'horse'

اردو میں ان کے لیے یہ نشان وضع کیے گئے ہیں:

TONES

High Tone	(قریبی تلفظ = بور)	شیر (واحد)	بوڑ̂
Falling Tone	(قریبی تلفظ = بورھ)	شیر (جمع)	بوڑ
Delayed Falling Tone	(قریبی تلفظ = بوٗر)	بہرا (واحد)	بوڑ
Low Tone	(قریبی تلفظ = بھور)	پٹھان	بوڑ<
Rising Tone	(قریبی تلفظ = گھور)	گھوڑا	گھوڑ̌

3.4۔ رسم الخط

شمالی پاکستان کی کچھ دوسری زبانوں (جیسے بلتی، بروشسکی، شِنا، کھوار وغیرہ) کے برعکس گاؤری میں لکھنے کی روایت نہیں ملتی یعنی ماضی میں یہ تحریری زبان کبھی نہیں رہی اور اس لیے اس میں کچھ شائع بھی نہیں ہوا (حالانکہ اُردو رسم الخط اور حروفِ تہجی کے ذریعے ایک حد تک گاؤری کی مخصوص آوازوں کی ادائیگی ہوسکتی تھی) تاہم اتنا پتہ چلتا ہے کہ کچھ افراد ایسے ضرور

تھے جو گاؤری لکھ اور پڑھ سکتے تھے لیکن اسے ان کی نجی اور انفرادی کاوش ہی کہا جا سکتا ہے۔

1995ء کے وسط میں چند مقامی لوگوں نے ایک ہجا کمیٹی (Spelling Committee) بنائی اور اس زبان کے لکھنے کے لئے ایک تحریری نظام پر بحث کر کے سوال اُٹھایا کہ گاؤری آوازوں اور ان کی نوشت کے لئے کونسی علامات استعمال کی جائیں۔ انہوں نے ایسے الفاظ کے ہجوں کا بھی تعین کیا جو ایک سے زیادہ طریقوں سے لکھے جا سکتے ہیں۔

اس کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس زبان کے لیے رومن رسم الخط کی بجائے فارسی، عربی رسم الخط استعمال کیا جائے گا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ گاؤری رسم الخط کی اردو کے ساتھ زیادہ یکسانیت ہونی چاہئے کیونکہ اُردو پاکستان کی قومی زبان ہے اور کالام کے علاقے میں ایک بڑی ادبی زبان کے طور پر مستعمل ہے۔ دوسری طرف کمیٹی نے گاؤری کی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لیے اس کا رسم الخط، جو اس زبان کی مختلف آوازوں کے فرق کو صحیح طور پر پیش کر سکے، بنا کر محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ یہاں 1995ء میں کئے گئے ''گاؤری ہجا کمیٹی'' کے فیصلوں کا خلاصہ مختصر تبصرے کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جس نظام کا خاکہ پیش کیا جا رہا ہے یہ حتمی تصور نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ جونہی گاؤری لکھنے اور پڑھنے کا رجحان فروغ پائے گا اس نظام میں ترامیم و اضافے ہوں گے۔ سب سے پہلے حروف علت اور حروف صحیح کی علامات پیش ہیں۔

3.5۔ گاؤری حروف تہجی اور مخصوص حروف صحیح

ذیل میں گاؤری حروف تہجی کی تختی پیش کی جاتی ہے۔ اس میں ان حروف تہجی کو دائرہ لگا دیا گیا ہے جو اُردو میں موجود نہیں ہیں۔

ا آ (أ) ب پ ت ٹ ث

ج چ (ڃ) (څ) ح خ د ڈ

ذ ر ڑ ز ژ س ش (ݜ)

ص ض ط ظ ع غ ف ق

ک گ ل (ݪ) م ن ں و

ہ ء ی ھ

(۱) څ تین نقطوں والی یہ ح پشتو میں بھی موجود ہے۔ گاؤری میں اس کا تلفظ ث کے قریب ہے۔

(۲) ڃ پیٹ میں دو نقطوں والی اس ح کی آواز ژ یہہ سے ملتی جلتی ہے

(۳) ݜ دو عمودی نقطوں والے اس س کی آواز اُردو کے ش سے ملتی جلتی ہے مگر ذرا بھاری انداز میں ادا ہوتی ہے۔

(۴) ڵ کٹے ہوئے اس ل کی آواز اُردو کے "شیہہ" سے ملتی جلتی ہے (یہ حرف براہوئی میں بھی موجود ہے)

3.6۔ گاوَری میں فارسی، عربی الفاظ کی نوشت

گاوَری میں فارسی اور عربی کے بہت سے الفاظ مستعمل ہیں۔ گاوَری میں لکھتے ہوئے ان الفاظ کے تلفظ کو سامنے رکھ کر گاوَری الفبا اور اس سے متعلق نشانات استعمال کیے جائیں یا یہ الفاظ اُسی طرح لکھے جائیں جیسے عربی فارسی میں لکھے جاتے ہیں، تحریری زبان کی طرف آتے ہوئے گاوَری کے نزدیک یہ ایک اہم سوال تھا چنانچہ طے کیا گیا کہ عربی فارسی کے ایسے الفاظ جن میں ث، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع اور ح استعمال ہوتے ہیں انہیں عربی فارسی کے انداز میں ہی لکھا جائے کیونکہ:

1۔ دیگر زبانوں کے علاوہ انگریزی میں بھی اس طرح کے ابہام موجود ہیں جو کثرتِ استعمال کے باعث مشکلات پیدا نہیں کرتے مثلاً انگریزی میں تھ کے لیے th استعمال ہوتا ہے مگر lighthouse میں تھ کی بجائے t اور h یعنی الگ الگ ٹ اور ہ کی آوازیں بولی جاتی ہیں۔ یہاں یہ بتانا بے جا نہ ہوگا کہ دیگر پاکستانی زبانوں میں بھی نون غنہ اور ڑ کی مخلوط آواز موجود ہے جسے لکھنے کے لیے ہر زبان کا اپنا طریقہ ہے۔

2۔ اردو اور عربی سیکھتے وقت اس روایتی ہجے کو ویسے بھی لوگوں کو سیکھنا پڑتا ہے۔

3۔ جو لوگ پہلے سے ہی اردو اور عربی جانتے ہیں یہ روایتی ہجے ان کے لیے آسان ہیں۔

4۔ روایتی ہجّے کے نظام کو برقرار رکھنے سے گاوَری اور دوسری پاکستانی زبانوں بشمول اُردو میں مماثلت پیدا ہوگی۔

3.7۔ کوزی مصمتی غنونیت

گاوَری میں کوزی مصمتی غنونی (ڑاں یعنی نون غنہ اور ڑ کی مخلوط آواز) لکھنے کے لئے (ن) اور کوزی مصمتہ (ڑ) اکھٹے لکھے جاتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس وجہ سے حروفِ تہجی میں فاضل حرف شامل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ نقصان یہ ہے کہ یہ ایک ابہام پیدا کرسکتا ہے یعنی یہ ڈایاگراف پورا Syllable پڑھنے کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے، جیسے

(نڑ) بہر حال کالام کلچرل سوسائٹی نے جو تین کتابیں شائع کی ہیں ان میں انہوں نے ''نڑ'' ہی استعمال کیا ہے۔

4۔ چند بنیادی قواعد

گاوری زبان میں مصدر کے لئے فعل امر کے آخر میں ''اوگ'' لگاتے ہیں۔ مثلاً ''بچ'' بمعنی ''جاؤ'' سے ''بچوگ'' بمعنی جانا۔ ''ہس'' بمعنی ''ہنسو'' سے ''ہسوگ'' بمعنی ہنسا وغیرہ

واحد سے جمع بنانے کے کئی طریقے ہیں تاہم بالعموم واحد کے لئے زبر استعمال کیا جاتا ہے جیسے ''اَن'' بمعنی انڈہ اگر اسے جمع بنانا ہو تو الف کے اوپر دو نقطے والا زبر لگایا جائے گا اور اس کی آواز بھی بدل جائے گی۔ مثلاً اً ن بمعنی انڈے۔ کبھی کبھار جمع بنانے کے لئے پشتو کا طریقِ کار بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ جیسے '' بُوٹ'' بمعنی جوتا سے '' بُوٹان'' بمعنی ''جوتے''۔ گاوری میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو جمع اور واحد دونوں کے لئے یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً '' کُچر'' بمعنی '' کتا اور کتے''، ''کوچوز'' بمعنی کپڑا اور کپڑے وغیرہ

مذکر سے مونث بناتے وقت لفظ میں ''ی'' کا اضافہ کیا جاتا ہے جیسے ''بچنت'' یعنی ''جا رہا ہوں'' سے ''بچینت'' یعنی ''جا رہی ہوں''، ''کھانت'' بمعنی ''کھا رہا ہوں'' سے ''کھینت'' بمعنی ''کھا رہی ہوں''، ''چنڑنت'' بمعنی ''لکھ رہا ہوں'' سے ''چنڑ ینت'' بمعنی ''لکھ رہی ہوں'' وغیرہ

گاوری میں اردو کی طرح ہی فاعل، مفعول اور فعل کی ترتیب استعمال ہوتی ہے۔ جیسے ''میں جا رہا ہوں'' کے لیے ''یہ بچنت''، ''میں کھانا کھا رہا ہوں کے لیے ''گیل کھانت''، ''میں سکول جا رہا ہوں'' کے لیے ''یہ اسکول پھر بچنت'' وغیرہ۔

سوالیہ فقروں کے لیے جملے کے آخر میں الف لگایا جاتا ہے جیسے ''تو بچانتا؟'' یعنی ''کیا تم جا رہے ہوں؟''، ''تو گیل کھانتا؟'' بمعنی ''کیا تم کھانا کھا رہے ہو؟''، ''تو یا واں آ؟'' بمعنی ''کیا تم آ سکتے ہوں؟'' وغیرہ

''ہے'' اور ''ہیں'' کے لیے گاوری میں ''تھو'' استعمال ہوتا ہے

مونث ''ہے'' کے لیے گاوری میں ''تھی'' استعمال ہوتا ہے

''تھا'' کے لیے ''آش'' استعمال ہوتا ہے۔ جبکہ ''ہیں'' اور ''ہوں'' کے لیے فعل کے آخر میں ''اں'' کا اضافہ کیا جاتا ہے مثلاً ''کراں'' بمعنی ''کرتا ہوں/ کرتے ہیں'' وغیرہ

5۔ گاوری ادب اور تصنیفات

راقم (جان بارٹ) سے قبل گاوری زبان کے بارے میں جن لوگوں کا تحقیقی کام شائع ہو چکا ہے ان میں لیچ 1838ء، بڈولف 1880ء، ایل ایس آئی 1991ء، مور گنسٹیئرن 1940ء اور بارتھ 1958ء شامل ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم کام پرویش شاہین کا ہے جنہوں نے 1989ء میں اپنی اُردو کتاب ''کالام کوہستان لوگ اور زبان'' میں کالام تحصیل میں بولی جانے والی زبانوں اوران کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

گاوری گرامر کے بارے میں جان بارٹ کی کتاب ''اے سکیچ آف کالام کوہستانی گرامر'' کے نام سے 1999ء میں شائع ہوئی جبکہ دوسری ''ٹون رُولزان کالام کوہستانی'' بھی 1999ء میں ہی چھپی۔

کچھ برس قبل ڈاکٹر این۔ اے۔ بلوچ نے ''کوہستان' کی چند غیر معروف بولیاں'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا تھا جس میں انہوں نے پاکستانی سکالروں سے کہا ہے کہ وہ ان زبانوں کی طرف خصوصی توجہ دیں جو ان کے اپنے پاکستانی لوگ بولتے ہیں، خصوصاً ان زبانوں کی طرف جو یا تو مطالعہ نہیں ہوئی ہیں یا جن کا کم مطالعہ ہوا ہے۔ اپنے اس مقالے میں وہ لکھتے ہیں:

''اگر کوئی مقامی اسکالر ان زبانوں میں موجود لوک شاعری کو جمع کرے تو یہ ایک اہم کام ہوگا۔ قشقار کے امان ملوک کا خوش بیگم کے ساتھ عشق اور عشقیہ اشعار جو امان ملوک نے تخلیق کئے ایک اہم ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اشعار نے کوہستان کے علاقے میں ادبی شعور بیدار کیا جس کے بعد کئی حقیقی عشقیہ کہانیوں نے جنم لیا جو نہ صرف سنائی جانے والی داستانوں کا موضوع بنیں بلکہ جنہوں نے شاعروں کو بھی شاعری کے لیے اُکسایا۔ بلاشبہ ہم سوات، کوہستان کو ''عاشقوں کی سرزمین'' کہہ سکتے ہیں اور ہر عاشق تقریباً شاعر بھی ہوتا ہے''۔ (حوالے کے لیے دیکھیے آخر میں سیریل نمبر 4)

موجودہ دور میں گاوری شاعری کے حوالے سے مولانا عبدالحق مانکرالی ایک اہم نام ہے۔ مولانا عبدالحق ایک جید مذہبی عالم ہونے کے ساتھ ایک ممتاز تاریخ داں شاعر ہیں۔ انہوں نے پشتو میں کالام کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے بھی بہت کچھ لکھا ہے جو مخطوطوں کی صورت میں ان کے پاس موجود ہے۔ اس حوالے سے ان کی ایک کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر جرمنی سے شائع ہو چکی ہے۔ بطور گاوری کے شاعران کے گیت مقامی لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ ان کی شاعری گاوری کی مخصوص صنف ''رو'' سے ہٹ کر ہے جس کے باعث ہم انہیں مخترع بھی کہہ سکتے ہیں۔

''عاشقوں کی سرزمین'' کے اس شخص کے پاس عشقیہ شاعری کے لئے زیادہ الفاظ نہیں ہیں۔ اس کے مطابق کوہستان کے عاشق فضول لوگ ہیں، وہ بھول گئے ہیں کہ ''موت ہمارے سر پر کھڑی ہے اور قبر ہماری آخری آرام گاہ ہے۔ ایک دن ہم سب سے ایمان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ان کی شاعری میں زیادہ تر لوگوں کے غلط اطوار کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے لیکن انداز اس قدر دلکش ہے کہ جو لوگ عشق میں ملوث ہیں یا ان کے مطابق فضول ہیں وہ بھی بہت پیار محبت اور انہماک سے ان کے اشعار سنتے ہیں۔

مولانا عبدالحق مانکرالی کی شاعری کی کچھ لائنیں مع اُردو ترجمہ ملاحظہ ہوں:

5.1۔ پچ اُوئس (مہمان آئے)

پچ اُوئے مَن تھی مھاں ہیکُو گور

آم کہ حلال کُرم یہ تانی گو گور

(مہمان آئے ہیں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کے لئے اپنی مرغی ذبح کروں)

مُتیزی نانت خُدائے چھاں نَم رہ شُکر

آم کے حلال کرم یہ تانی گو گور

(اللہ کے فضل سے میرے پاس سب کچھ وافر ہے۔ میں ان کے لیے اپنی مرغی ذبح کروں)

منافقان سہ مھاں کہ کارنات

سَمئ کُرو کہ یہ تیار نات

(منافقوں سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے اور میں قسمیں کھانے کو تیار نہیں ہوں)

بینہ مُحبّت خلقہ رأت رکیت

جب دہ جُھو آپتائے غیبات رکیت

(پیار محبت لوگوں میں ختم ہوگیا ہے۔ زبان سے دھوکہ دے کر غیر موجودگی میں برائی کرتے ہیں)

گاوُری زبان کی تصنیفات میں مولانا عبدالحق مانکرالی کی کتاب '' کالامی رموزِ اشعار'' خصوصی اہمیت کی حامل ہے جس میں گاوُری زبان میں نعتیں، حمد وثنا اور نظمیں شامل ہیں۔ یہ کتاب کالام کلچرل سوسائٹی نے 1997ء میں شائع کی تھی اور اس کی تدوین محمد زمان ساگر نے کی تھی۔ کالام کلچرل سوسائٹی کی طرف سے جو دیگر کتابیں شائع ہوئیں وہ یہ ہیں:

''کالام کوہستانی متل''مطبوعہ 1998ء یہ کتاب گاوری زبان کی ضرب الامثال پر مشتمل ہے اوراس میں سوضرب الامثال مع اردو ترجمہ پیش کی گئی ہیں۔

''سوئیلیں لانگ'' نامی کتاب میں گاوری زبان کے شاعر لعل بادشاہ کے گیت اور نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ 2000ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کی تدوین بھی محمد زمان ساگر نے کی ہے

''چُونچا'' سن 2000 میں چھپنے والی اس کتاب میں محمد زمان ساگر نے گاوری زبان کی تحریری ورکشاپ کے شرکاء کی تخلیقات کو پیش کیا ہے جن میں سفرنامے، مختلف واقعات اور سبق آموز کہانیاں شامل ہیں۔

2000ء میں محمد زمان ساگر کی تین کتابیں شائع ہوئیں۔ ''آؤ گاوری پڑھیں''، گاوری الف ب'' اور'' گاوری اردو انگریزی بول چال۔'' اول الذکر کتابچے میں اردو زبان میں لوگوں کو گاوری لکھنے اور پڑھنے کے بارے میں بتایا گیا ہے دوسرا کتابچہ گاوری حروفِ تہجی کے بارے میں ہے جبکہ آخری کتاب میں گاوری الفاظ کا اردو اور انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔

5.2 گاوری کا ایک گیت

ذیل میں اتروڑ کے رہنے والے گاوری کے ایک شاعر لعل بادشاہ کا ایک گیت مع اردو ترجمہ بطور نمونہ پیش ہے:

میں رب انگار کُرلینگ تیر یچ کہ آج مُوشیداں زراں پالنگ

ٹولیناں شاَن رہ سیچ کہ بسروت لعیناں تریناَں کنڑ

(میرے رب خوبصورت (حسینہ) کے لیے میرے رقیب کا پلنگ آگ کا بچھونا بنا۔ اس نے پھٹی چارپائی پر سچ مچ شیطان کے کانٹے بچھا رکھے ہیں۔)

مکہ بنوسیں خاپریاں باَرآمسوس نہ من وزیرئی

ہیکو کوراَں پردہ سٹ انگار پتی عمر گران بینت

(میری پیاری ماں مجھے بنوس کی پری کی افسوس بھری داستان مت سنا۔ میرے دل کے پردوں میں آگ لگی ہے، اب آنے والی زندگی بتانا مشکل ہے۔)

مصراں باچیں بی بی اَآج انوج قصہ کاَدیت

منہ دیئس مُوشید چھد نتھر نیم یُو ہارزریں رومیل رہ

(مصر کے بادشاہ کی بیگم نے آج عجیب قسم کی کہانی سنائی۔ اس نے کہا کہ میرا رقیب سونے کے رومال پر نقش ونگار بنا

رہاہے)

5.3 ۔ گاوری ضرب الامثال

(۱) اُک بُوتہ مورش دی ڈِب شی ٹیس باتانش۔

ایک بھوکا مراتھااور دوسرااس کی بغل میں روٹی ڈھونڈھ رہاتھا۔

(۲) اُگُاماڈیوی اوچھاُرہ ٹت

بارش سے بھاگ کرآبشار تلے آنا۔

(آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا)

(۳) دیال شاُن اڑ ریتاں۔

پرائے کی چارپائی آدھی رات کے لئے ہوتی ہے۔

(ادھار محبت کی قینچی ہے)

(۴) ناٹ نہ جینی منہ رکٹ لیٹل تھی ار۔

(ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا)۔

(۵) کھن تھومیہ پن تھی۔

پہاڑ کے بیچ میں راستہ ضرور ہوتا ہے۔(جہاں پانی وہاں راستہ)

5.4۔ گاوری لوک کہانی

رواج

زوڑ زُمانُ مئی اروگون کم اِسپوجایاجاُتک گھناُرہُوش نے تام گھچوٹھوکہ تلُنش ،ارو ائی گھناُرہُوت۔مُھوتُوائی کہ پکاُرہ نہ ینت۔

اینچلہ باُروخت لنگو۔ادیرامیش گھناُرہو،ایں میشہ پاتانی بوب گھچوٹھوکہ تلوش۔گون اِیں مِیش گھناُرہُوتے اساُں پو آُس گھی ٹھوک رہ گاؤں آُس ٹھوکہ تلم ۔گون سہ آُس ٹھوکہ تلوشات تے بوب ارو"کومئی تانی بوب ٹھوکہ نہ تلوش تے آج تُو پا مھئی ٹھوکہ نہ تلنش"،تھی پواُسوچ کیر اُوں کومئی تانی بوب ٹھوکہ تلوتے مھاُں لوگوتور پامھئی ٹھوکہ تلاُں۔تن تاُس ٹھوکہ نہ تلوتے

تن تھی بعد ایں رواج خُتم ہُو۔

ترجمہ: پرانے زمانے میں کہیں اگر کوئی مرد یا عورت بوڑھے ہو جاتے تو انہیں لے جا کر پہاڑ سے نیچے پھینک دیا جاتا۔ کہتے کہ یہ بوڑھا ہو گیا ہے اب کسی کام کا نہیں رہا۔

اس طرح بہت عرصہ بیت گیا۔ ایک دفعہ ایک آدمی بوڑھا ہو گیا تو اسے اس کا بیٹا لے کر پہاڑ پر گیا تا کہ اسے پہاڑ سے نیچے پھینک دے۔ جب وہ اپنے والد کو پہاڑ سے گرا رہا تھا تو اس کے والد نے کہا کہ ''اگر میں اپنے والد کو پہاڑ سے نہ گراتا تو آج تو بھی مجھے پہاڑ سے نیچے نہیں گراتا'' اس لڑکے نے سوچا کہ اگر میں اپنے والد کو پہاڑ سے نیچے پھینک دوں تو کل کو میرے بچے بھی مجھے پھینک دینگے۔ لہذا وہ اپنے والد کو گھر واپس لے آیا۔ اس کے بعد یہ رواج ختم ہو گیا۔

6۔ ابتدائی بول چال کے فقرے اور گنتی

اردو	گاوُری
☆ آپ کا نام کیا ہے؟	چھاں کہ نام تُھو؟
میرا نام اسحاق شاہد ہے	ماں نام اسحاق شاہد تھو
☆ آپ کیا کرتے ہیں؟	تو کناں کُراں؟
میں پڑھتا ہوں	یہ سواخ منت
☆ آپ کیسے ہیں؟	تو کھیکی ہُوانت؟
میں اللہ کے فضل وکرم سے بالکل ٹھیک ہوں	یہ اللہ آں فضل دہ بالکل جوڑ تُھو
☆ اور سنائیں آپ کا کیا حال ہے؟	دی مناں چھیں کہ حال تھی؟
میں بالکل خیریت سے ہوں۔	یہ بالکل جوڑ تُھو
☆ آپ کے والد کیا کرتے ہیں؟	تُھوں بوب کناں کُراں؟
وہ ملازمت کرتے ہیں	سہ نوکری کرنت
☆ آپ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟	تُھوں شِیٹ ہماگ تھی کتیک دور تھی؟
زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ سڑک سیدھی میرے گھر کی طرف جاتی ہے۔	بار دور نات۔ ایں ثخواک سِیدہ مُوں لاریں پیش کہ بچنت۔

☆ میری طبیعت ٹھیک نہیں، کیا آپ مجھے کسی ڈاکٹر کا پتہ بتا سکتے ہیں ؟

میں طبیبات ٹیک نات، تُو مکہ کشکاں ڈاکٹراں پتہ داواں آ؟

آپ سرکاری ہسپتال چلے جائیں جو کہ وہ سامنے نظر آ رہا ہے۔

تُو سرکیری ہسپتال پھر چوأٔس مُو کا موک پشنت

☆ گرمی بہت زیادہ ہے پیدل جانا ممکن نہیں۔

گرمی بُاُرتھی پیدل بچوگ ممکن نات

آ یئے میں آپ کو اپنی گاڑی میں چھوڑ آتا ہوں۔

یہ تھی گاڑے دہ پھتسام

☆ بہت شکریہ! اچھا پھر ملیں گے۔

بار مار بنی! دیگرا کدی پشاں

آپ کا بھی شکریہ۔ خدا حافظ

چھیں پا ماربنی، خدایاں حوالہ

گنتی .... گنوگ

نمبر	اردو	کھوار
۱-	ایک	اک
۲-	دو	دُو
۳-	تین	ٹرا
۴-	چار	چور
۵-	پانچ	پنج
۶-	چھ	شو
۷-	سات	ست
۸-	آٹھ	اچ
۹-	نو	نوم
۱۰-	دس	دِش
۱۱-	گیارہ	اِکاٗ
۱۲-	بارہ	بأٗ
۱۶-	سولہ	شور
۱۷-	سترہ	ستاںٔ
۱۸-	اٹھارہ	اجا
۱۹-	اُنیس	اُنبیش
۲۰-	بیس	بیش
۳۰-	تیس	داش تے بیش
۴۰-	چالیس	دُو بیش
۵۰-	پچاس	داش تے دوبیش
۶۰-	ساٹھ	ٹہ بیش
۷۰-	ستر	داش تے ٹہ بیش
۸۰-	اسی	چور بیش
۹۰-	نوے	داش تے چور بیش

۱۳-	تیرہ	ٹو	۱۰۰-	سو	پچِ بیش
۱۴-	چودہ	چُون	۱۰۰۰-	ہزار	زِر
۱۵-	پندرہ	پنجاً			

7۔ خود آزمائی

1۔ گاؤری زبانوں کے کس گروہ سے تعلق رکھتی ہے؟ بحث کریں۔

2۔ گاؤری کی وجہ تسمیہ اور لسانی جغرافیہ اپنے لفظوں میں بیان کیجئے۔

3۔ گاؤری رسم الخط اور حروف تہجی کے بارے میں آپ کے مطالعے کا نچوڑ کیا ہے؟

4۔ دوسری زبانوں سے گاؤری کے ربط و تعلق پر روشنی ڈالیں۔

5۔ گاؤری ادب اور تصنیفات کے عنوان سے ایک مضمون اپنے لفظوں میں تحریر کیجئے۔

6۔ درج ذیل جملوں کا گاؤری ترجمہ کیجئے۔

ا۔ آپ کا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟

۲۔ اور سنائیں آپ کا کیا حال ہے؟

۳۔ بہت شکریہ! اچھا پھر ملیں گے۔

(اس یونٹ کے لیے درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا)

1. Baart, Joan L.G. 1997. *The Sounds and Tones of* Kalam *Kohistani: With Word list and Texts.* Islamabad: National Institute of Pakistan Studies and Summer Institute of Linguistics. (Studies in Languages of Northern Pakistan Vol. 1).

2. Baart, Joan L.G. 1999a. Tone Rules in Kalam Kohistani (Garwi, Bashkarik). *London. Bulletin of the School of Oriental and African Studies* Vol. 62, No. 1:87 –104.

3. Baart, Joan L.G. 1999b. *A Sketch of Kalam Kohistani Grammar.* Islamabad: National Institute of Pakistan Studies and Summer Institute of Linguistics. (Studies in Languages of Northern Pakistan Vol. 5).

4. Baloch, N.A. 1966. Some Lesser Known Dialects of Kohistan. Dacca: Asiatic Society of Pakistan. Haqq, Muhammad Enamul (ed.): *Shahidullah Felicitation Volume,* pp. 45 – 55.

5. Barth, Fredrik 1956. *Indus and Swat Kohistan; an Ethnographic Survey.* Oslo.

6. Barth, Fredrik & Georg Morgenstierne. 1958. Vocabularies and specimens of some S.E. Dardic dialects. *Norsk Tidskrift for Sprogvidenskap* 18:118-136.

7. Biddulph, John. 1880. *Tribes of the Hindoo Koosh.* Akademische Druck- und Verlagsanstalt, Graz. Reprint 1971.

8. Bloch, Jules. 1965. *Indo-Aryan: from the Vedas to Modern Times*. English edition, largely revised by the author and translated by Alfred Master. Paris.

9. Greenberg, Joseph H. 1963. Some universals of grammar with particular reference to the order of meaningful elements. In Joseph H. Greenberg (ed.) *Universals of Language*. MIT Press, Cambridge, MA.

10. Karimi, Abdul Hamid Khan. 1995 (c1982) *Urdu-Kohistani Bol Chaal*: (Urdu-Kohistani Conversation). Bahrain, Swat: Kohistan Adab Academy.

11. Keiser, Lincoln. 1986. Death enmity in Thull: organized vengeance and social change in a Kohistani community, *American Ethnologist* 13:489-505.

12. Keiser, Lincoln. 1991. *Friend by Day, Enemy by Night; Organized Vengeance in a Kohistani Community.* Holt, Rinehart and Winston, Fort Worth, Texas.

13. LSI: Grierson, George A. 1919. *Linguistic Survey of India* 8/2:507ff. Calcutta.

14. Leech, R. 1838. Epitome of the grammars of the Brahuiky, the Balochy and the Panjabi languages, with vocabularies of Baraky, the Pashi, the Laghmani, the Cashgari, the Terhai, and the Deer dialects. *Journal of the Asian Society of Bombay* 8.

15. Mankiralay, Abd al-Haq Jashni. 1987. A political history of Kalam Swat, Part 1. (Translated from Pashto by A. Raziq Palwal). *Zentralasiatische Studien des Seminars Fur Sprach-und Kulturwissenschaft Zentralasiens der Unversitat Bonn* 20:282-357

16. Masica, Colin P. 1991. *The Indo-Aryan Languages.* Cambridge University Press, Cambridge.

17. Morgenstierne, Georg. 1940. Notes on Bashkarik. *Acta Orientalia* 18:206-257.

18. Rensch, Calvin R. 1992. Patterns of Language Use among the Kohistanis of the Swat Valley. Islamabad: National Institute of Pakistan Studies and Summer Institute of Linguistics. Rensch, Calvin R., Sandra J. Decker and Daniel G. Hallberg: *Languages of Kohistan* (Sociolinguistic Survey of Northern Pakistan Vol. 1), pp. 3- 62.

19. Shaheen, Muhammad Parwesh. 1989. *Kalam Kohistan; Log aur Zabaan.* Shoaib Sons Publishers/Booksellers, GT Road, Mingora (branch Udayana Bazaar).

20. Stahl, James Louis. 1988. *Multilingualism in Kalam Kohistan.* Univeristy of Texas at Arlington. (M.A. Thesis).

21. Strand, Richard F. 1973. Notes on the Nuristani and Dardic languages. *Journal of the American Oriental Society* 93/3:297-305.
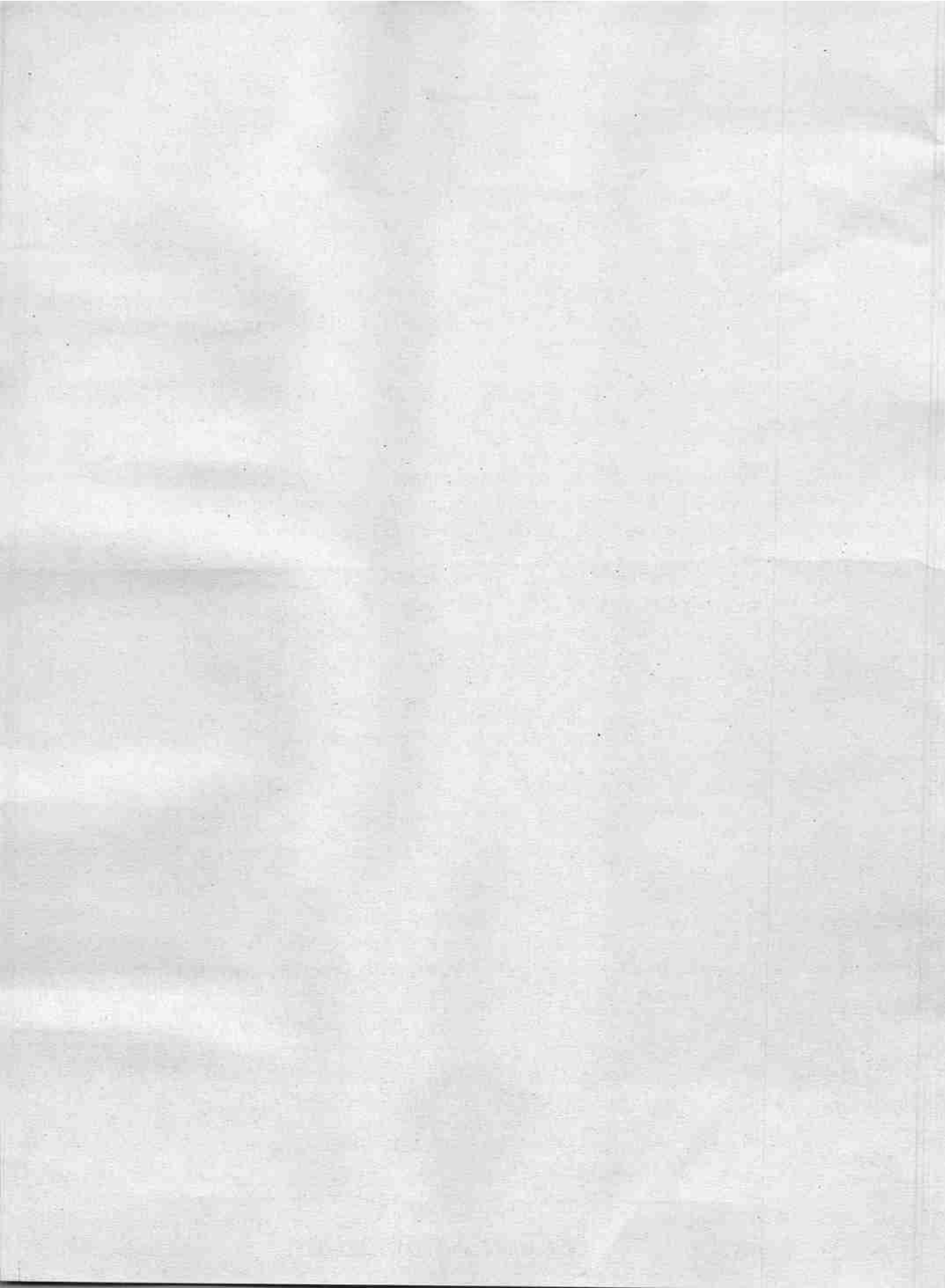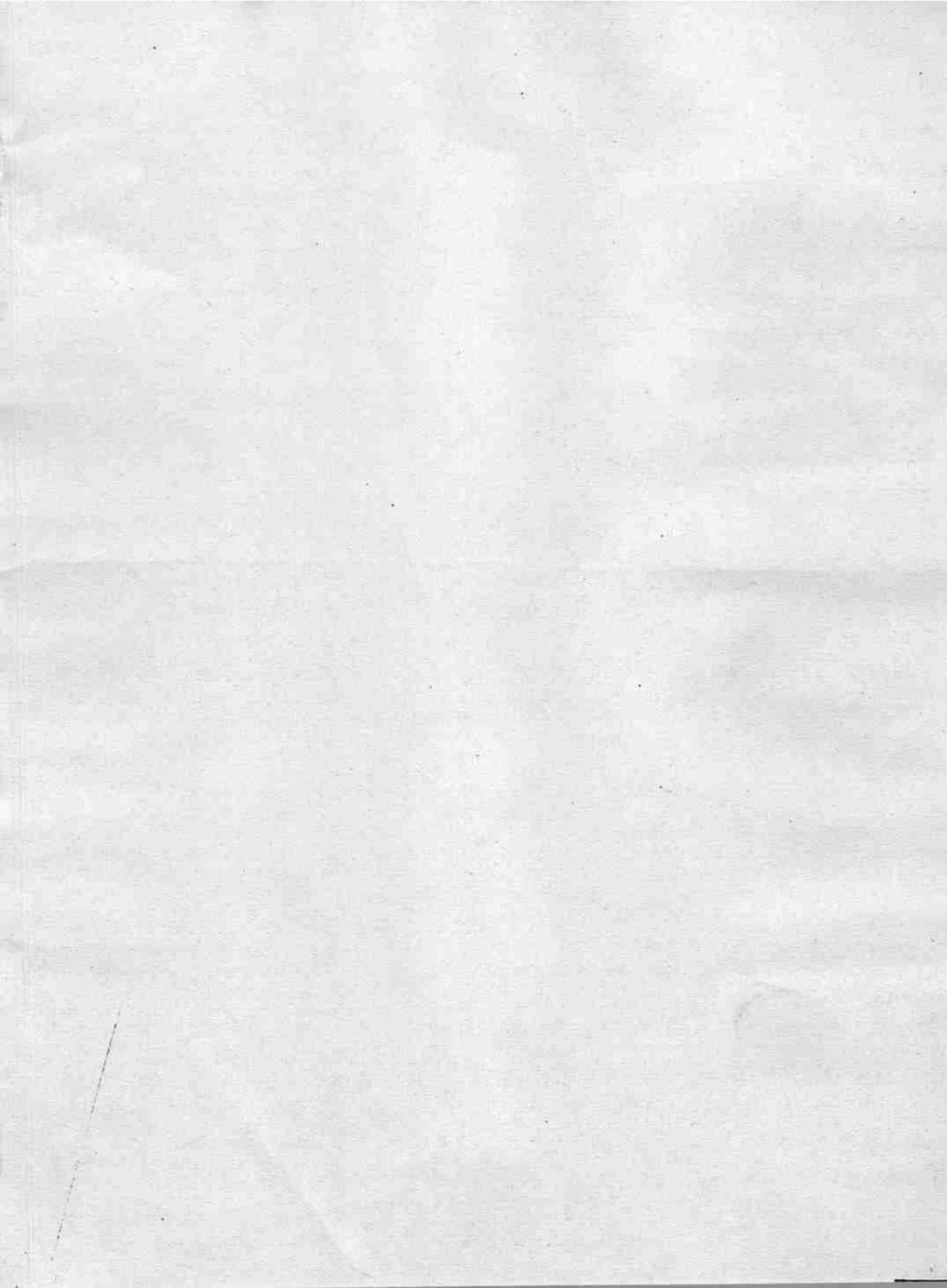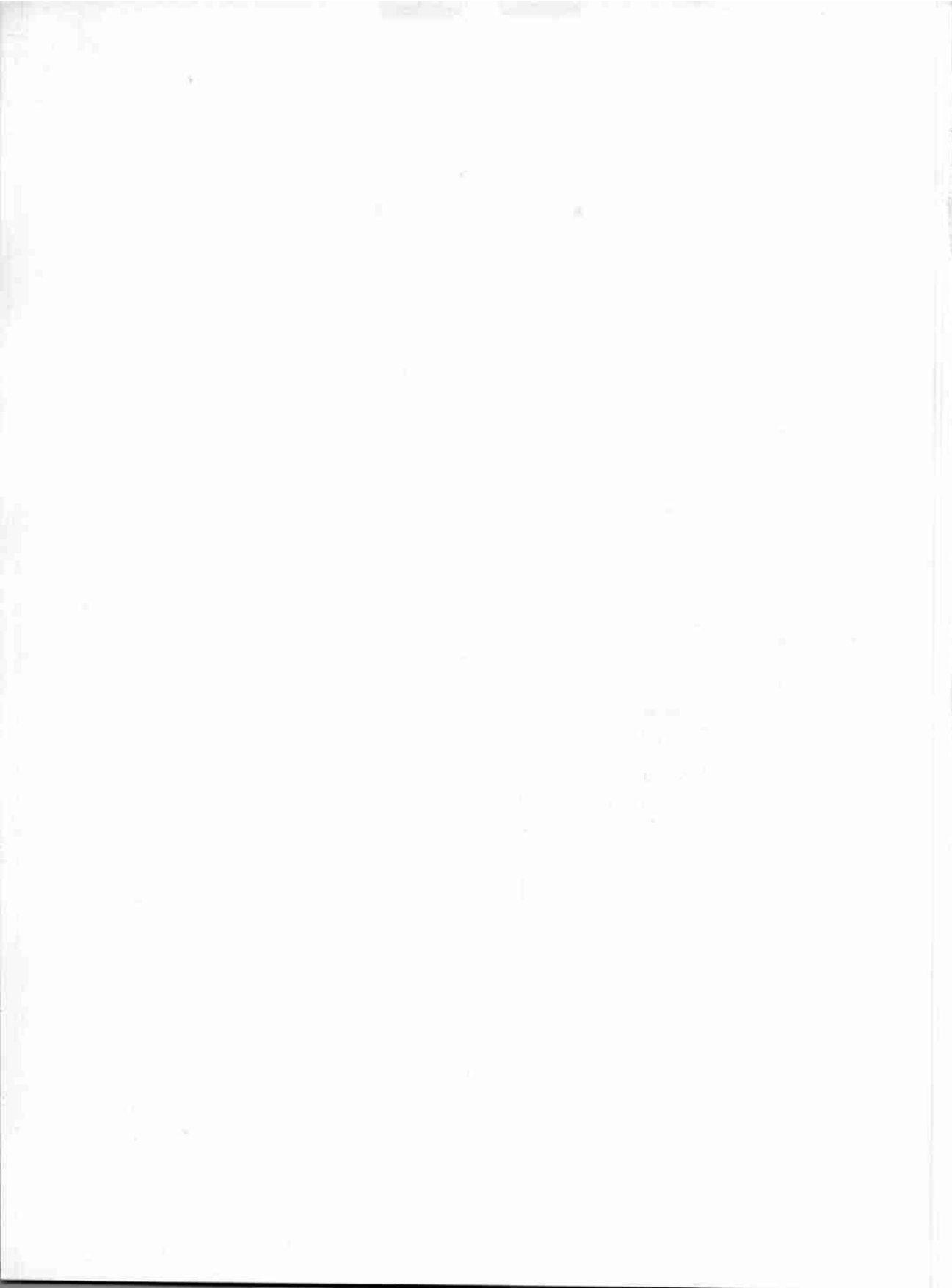
M.Phil
Pakistani Languages and Literature

Pashto ,Hindko, Torwali, Gawri

DEPARTMENT OF PAKISTANI LANGUAGES

Allama Iqbal Open University Islamabad